DUE DATE

تذکرہ شعرائے الہ آباد

یعنی

سخنوران قصبہ کڑا

از

محمد واصل عثمانی

گولڈ میڈلسٹ

م۔ (الہ آباد) ایم اے (معاشیات)۔ایم اے اردو

ڈی ایل ایس

پروفیسر گورنمنٹ اسلامیہ کالج

کراچی

۱۹۷۸

ذی النورین ۱۷۸۱۔ جوہر آباد۔ کراچی ۳۸

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

اشاعت اوّل

۱۹۷۸ء

قیمت

۲۵ روپے 37/50

★

(ایجوکیشنل پریس کراچی)

انتساب

جناب مولوی فضل احمد صاحب فاروقی غریقؔ (مرحوم)

کے نام

جن کا اصرار تھا کہ ان کا نام تذکرہ شعرا میں نہ لایا جائے

اور

جناب مولوی بدرالحسن صاحب عثمانی۔ سابق

اسسٹنٹ رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی

کے نام

جن کی بزرگانہ شفقت نے اتنا ضخیم تذکرہ مرتب

کرایا۔

⁂

فہرست عنوانات

طلوع

"سخنوران قصبۂ کرڑا" کی تصنیف کا خیال مجھے اس وقت ہوا
جب میں حضرت وحید الہ آبادی پر اپنی تحقیق کی تکمیل کے سلسلہ میں
مشغول تھا۔ مجھے حضرت وحید کے ساتھ ساتھ شعرائے کرڑا کے
متعلق کچھ لکھنے کا خیال بھی ہوا کیونکہ کرڑا کی ادبی و علمی فضا کا کچھ نقشہ پیش
کرنے کے لئے لازمی ہے کہ وہاں کے سخنوران کا بھی سرسری تذکرہ کیا جائے
مگر میرے چند بہی خواہوں۔ دوستوں۔ بزرگوں اور احباب نے مجھے منع
فرمایا اور کہا کہ اس طرح سے وحید الہ آبادی کی اہمیت میں قدرے کمی
ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ سخنوران قصبہ کرڑا کا تذکرہ
بالکل الگ شائع کیا جاتا۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا اور میں اصل کام
چھوڑ سخنوران کرڑا کی تلاش میں "ستو باندھ" کر ڈگر ڈگر کی خاک چھاننے
پر تُل گیا۔ اس سلسلے میں قدم قدم پر نشیب و فراز۔ خاردار جھاڑیاں
اور ڈراؤنے چہرے میری راہ کھوٹی کرنے آتے رہے۔ مگر میری ہمت
نے جواب نہ دیا۔ دراصل اس کا سہرہ میرے ماموں جناب بدرالحسن
صاحب عثمانی سابق اسسٹنٹ رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی کے سر ہے

یہ انھیں کی توجہ دنا کبھدکا نتیجہ ہے کہ آج "شجرہ عثمانی" کی طرح "سخنوران قصبہ کڑا" بھی منظر عام پر آ رہا ہے۔ جناب ماموں صاحب نے قدم قدم پر میری ہمت افزائی کی۔ تصنیف و تالیف کا شوق دلایا۔ کبھی کبھی اس تگ و دو میں میرا قدم پھسلا تو انھوں نے مجھے سہارا دیا اور استقامت و عزم کا سبق دیا۔ اس کتاب کا تاریخی نام "سخنوران قصبہ کڑا" بھی انھیں کا تجویز کردہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے
۶۳۸۵
کہ ابتدائے تصنیف و اختتام میں کتنے ماہ و سال مجھے صرف کرنے پڑے اس اثنا میں بہت سی تبدیلیاں بھی ہوگئیں۔ انقلابات بھی آئے اور میری زندگی میں بھی بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ راقم الحروف کو ۱۹۶۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت اور پھر ۱۹۷۱ء میں معہ اہل و عیال عمرہ کا شرف حاصل ہوا۔ دیار حبیب میں جا کر نعتیں بھی لکھیں اور کیفیات و محسوسات میں بے شمار اضافہ ہوا۔ دوسری کتاب سفرنامۂ حج زیر قلم ہے اور اسی طرح ذہن میں زمین و آسمان کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ "شجرۂ عثمانی" پر لوگوں کے تعریفی خطوط کے ساتھ ساتھ دھمکیاں اور لعنت ملامت بھی میرے حصے میں آئی مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں۔

کتنے اصحاب نے اس تذکرہ کے چھپتے چھپتے راہ ملک عدم اختیار کیا جس کا مجھے افسوس ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو غریق رحمت کرے

علی اطہر مرغوب

فضل احمد۔ فاروقی۔ اسحٰق رونق۔ سید ریاض احمد ریاض کا ذکر نہایت اہم ہے۔ فضل احمد عزیز کو اس تذکرہ سے خاص دلچسپی تھی اور عجز وانکسار کے طور پر ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ "دیکھو میرا نام شعرا کی فہرست میں نہ لکھنا۔ مگر بغیر ان کے یہ تذکرہ نامکمل رہتا اس لئے ان کا نام اس میں سے حذف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

کچھ شعرا ایسے ہیں جن کے حالات زندگی یا نمونہ کلام ہزار تلاش وجستجو کے باوجود راقم الحروف کو نہ مل سکے جس کا قلق بہت زیادہ ہے۔ مگر کیا کیا جائے بجز صبر و رضا کے بہر کیف ان حضرات کا ذکر جو اس محفل میں شریک نہ ہو سکے ضروری ہے۔ ان میں نور اللہ نور سید محمد نقی۔ مہدی۔ مرغوب علی منصب اور لالہ گنپت رائے تیغ قابل ذکر ہیں۔

تحقیق وتدقیق کے دروازے وا ہیں۔ شاید مستقبل میں ارض وطن کا کوئی ایسا فرزند جلیل پیدا ہو جو کڑا پر تحقیق وجستجو کی خلش لے کر آگے بڑھے اور اس میں مزید اضافے کرے۔

اس تذکرہ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی تھی مگر تذکرہ کے چھپتے چھپتے چند اور اہم شاعروں کا اضافہ "اختتامیہ" کے عنوان کے تحت شاید اسے کچھ ... وقیع ... ثابت ہو سکے۔ "اختتامیہ" میں دراصل ان شعرا کی شمولیت ہے جن کی دریافت بعد میں ہوئی یا کسی وجہ سے وہ لوگ نظر انداز

ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف معذرت خواہ ہے۔

تذکرہ کی ترتیب و تصنیف کے سلسلے میں سید محمد رفیع نقوی نے جو حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کا احاطۂ تحریر میں لانا نقوی صاحب کی شان میں گستاخی ہوگی۔ کہ ڈلتے اتنی دور بیٹھ کر میں بھلا کیا لکھتا مگر صاحب موصوف نے میری جس جس طرح سے قلمی امداد کی ہے اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ اس محفل میں اکثر شعرا انھیں کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے جلوہ افروز ہیں۔

افسر صدیقی امروہوی جو میرے محترم بزرگ دوست ہیں اس سلسلہ میں شکریہ کے مستحق ہیں کیونکہ قدیم تذکروں پر ان کی بڑی عمیق نظر ہے اور انھوں نے پرانے رسالوں، تذکروں اور کتابوں کے اتنے حوالہ جات فراہم کئے کہ آخر کار میں تنگ آگیا اور مجبوراً تذکرہ کو شائع کرنے پر تل گیا ورنہ وہ روزانہ کچھ نہ کچھ حوالہ دیدیا کرتے اور میں اسی میں الجھ کر رہ جاتا ہوں۔ میرے ایسے کم علم عدیم الفرصت اور کوتاہ قلم کی بساط سے باہر تھا کہ میں اتنا ضخیم تذکرہ مرتب کر پاتا۔ اصل میں وہ مجھے راہ بتاتے گئے بلکہ ہاتھ پکڑ کر چلاتے گئے اور میں چلتا گیا۔

اپنے برادران بزرگ محمد فاضل صاحب عثمانی اور عادل صاحب عثمانی کا بھی میں بہت ممنون ہوں جنہوں نے مجھے باربار تاکید کر کے اس تذکرہ کو آخر کار چھپوا ہی دیا۔ حالانکہ وہ لوگ میرے طریقہ

بیان سے قدرے اختلاف کرتے ہیں مگر یہ ان لوگوں کی تاکید ہی تھا
جس کی وجہ سے طویل التوا کے باوجود تذکرہ بہرکیف منظر عام
پر آرہا ہے۔

جناب ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب جو میرے بڑے مشفق ومعزز
استاد ہیں میری رہنمائی کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں ان کا
شکریہ ادا نہ کرنا احسان ناشناسی ہوگی۔ اس کتاب کا ابتدائیہ
ان کی نظر سے گذرا ہوا ہے جو انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات
کے باوجود دیکھ کر مجھے گرانبار احسان کیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک طویل فہرست ان اصحاب کی ہے جن
کا تفصیلی تذکرہ خود اپنی جگہ ایک تصنیف اختیار کرے گا۔
اس لئے میں مجموعی طور پر جناب عبیداللہ کاظمی اختر۔ وحیدالحسن
عثمانی۔ بیگم وحیدالحسن عثمانی۔ محمد باسل عثمانی۔ علیم احمد
غنی الاکرم سبزواری۔ ابوالخیر کشفی۔ محمد واحد ناظم کتب خانہ
اردو بورڈ۔ بیگم سراج الرحمٰن۔ ناصرالدین فاروقی۔ ہادی نقوی کرم
اسحٰق رونق مرحوم۔ سید سہیل احمد نقوی۔ مہرالنساء بیگم کمیل احمد
احتزام الدین احمد شاغل سابق سکریٹری انجمن ترقی اردو جے پور
بیگم محمد باقر عثمانی۔ بیگم بدرالحسن عثمانی۔ جوادالحسن عثمانی
زبیر فاروقی شوکت (جنہوں نے اس کتاب کے اکثر پروف کی تصحیح
کی) میرے عزیز شاگرد عباس علی (جنہوں نے اس کتاب کی کتابت

میں میری مدد کی) کا صد درجہ شکر گذار ہوں۔ ان حضرات نے مختلف طریقوں سے اس تذکرہ کے مرتب کرنے میں میری خاطر خواہ مدد کی۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ ان میں چند لوگوں کی سرد مہری اور بے اعتنائیوں کا بھی ذکر آنا لازمی ہے۔ کچھ حضرات اپنے اب وجد کا نمونہ کلام اس طرح سے چھپائے ہوئے ہیں کہ انھیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کا کلام منصۂ شہود پر آسکے۔ چند اصحاب نے ایسے ایسے نشتر عمر سے کئے ہیں کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ ہر چند انھیں اس کا حق پہنچتا ہے کیونکہ وہ ایک بڑے ادیب کے وارث ہیں۔ مگر خاص طور سے میں حیدر آباد کے ان اصحاب کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے اپنی امارتی شان کے تحت جواب دینا کسر شان سمجھا اور آخر کار جب میں نے درشت لہجہ اختیار کیا تو انھوں نے کچھ نمونۂ کلام روانہ کیا اور پھر ماموں بدر الحسن صاحب عثمانی سے میرے لہجے کی شکایت بھی کی۔ البتہ میں خصوصی طور پر ناصر الدین وحیدی کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے میری درخواست سُن لی اور حیدر آباد دکن سے ان حضرات کا نمونۂ کلام روانہ کیا جن کی مجھے توقع بھی نہ رہی تھی۔

مکتبۂ عزم وعمل اور صفیہ اکادمی نے اس کے شائع کرانے کا اہتمام کیا تھا مگر افسوس کہ اس ادارہ نے فی الحال اپنا کام ملتوی کر رکھا ہے۔ بہر کیف ہم پھر بھی ان کے شکر گذار ہیں۔

ابتدایہ

سیل زمانہ رکتا نہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا نہیں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ مستغنی اور بے نیاز۔ بے پروا اور مست۔ کیسی کیسی آبادیاں۔ کیسے کیسے معمورے اس سیل بے اماں کی نذر ہو گئے۔ میمفس، تھیبس بابل۔ نینوا۔ موہن جو دارو۔ ہڑپا۔ پاٹلی پتر۔ مدائن۔ کیسے کیسے پُر رعب نام ہیں۔ کیا رونق اور چہل پہل تھی۔ کیا شان وشوکت تھی کیا کاروبار اور گہما گہمی تھی۔ مگر سیل زمانہ نے سب کو غرق کر دیا ایسا غرق کر دیا کہ صرف نام باقی رہ گئے۔ اللہ باقی من کل فانی۔ جب ایسے غدّار شہر اور معمورے سیل زمانہ کی بھینٹ چڑھ گئے بیچارہ کڑا کس شمار وقطار میں آتا ہے۔ انھیں کی صف میں خاموش اور ملول۔ افسردہ اور مضمحل کھڑا اپنی بے رونقی اور اپنے فرزندوں کی بے توجہی کا نوحہ خواں ہے۔

کڑا کہنے کو ایک قصبہ تھا اور ہے مگر اس کی تاریخی اہمیت وحیثیت برصغیر کے علم ودانش میں اس کا حصّہ اور پرانی ثقافت کے فروغ میں اس کا تعاون آج بھی مستند حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل الگ ہے کہ مورخوں اور دانشوروں نے کڑے کی علمی ونقافتی

خدمات کا تذکرہ اس انداز اور تفصیل سے نہیں کیا جس کی ضرورت تھی۔ ایک طرح کی تاریخی بے اعتنائی یا عدم توجہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چیز یہ ہے کہ ہمارے بزرگ اپنے مشرقی آداب و روایات کے مصداق اپنے کارناموں کو الم نشرح کرنے کے بجائے ازراہ انکسار ان کا تذکرہ کم سے کم کرنے کے عادی تھے۔ اس روایت اور ان آداب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے کتنے صاحبان علم و دانش گوشۂ گمنامی میں جا سوئے اور ان کے کارنامے منظرِ عام پر آنے کے بجائے علم سینہ کا سرمایہ بن کر رہ گئے۔ وہ تو خدا بھلا کرے سید سلیمان ندوی کا جنھوں نے "حیاتِ شبلی" میں دیارِ پورب کے علمی مراکز کے تذکرے میں کرڑے کو فراموش نہ کیا بلکہ اس کی خدمات کا مناسب و موزوں اعتراف کیا۔ ثقافتی سرمایے سے لاعلمی اور محرومی کے اس دور میں یہ بھی بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے ورنہ اب تو حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہماری نئی نسلیں علم و دانش کے قدیم مراکز کا نام سن کر حیرت سے یہ دریافت کرینگی کہ یہ کسی شاعر کا تخلص ہے یا الف لیلیٰ کے کسی کردار کا نام۔ جہالت عصبیت، تنگ نظری اور انتشار ذہنی نے آہستہ آہستہ ایک ایسی فضا تیار کر دی ہے جس میں "جنت گم گشتہ" کے کسی گوشے کا تذکرہ ایک جرم سے کم نہیں معلوم ہوگا۔ بہرحال حالات اور فضا کوئی رنگ کیوں نہ اختیار کرلیں، تاریخی حقیقتوں کو فراموش

نہیں کیا جا سکتا۔ اسی خیال کے تحت یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے تاکہ کڑے کو اس کے تاریخی پس منظر اور علمی و ادبی فضا میں دیکھا جا سکے اور اس کی اہمیت کو صفحہ قرطاس پر محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے۔

قصبہ کڑا ضلع الہ آباد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قصبہ تحصیل سراتھو سے جانب جنوب تقریباً ۴ میل کے فاصلے پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ گنگا کے دوسری جانب قصبہ مانکپور واقع ہے جس کی قربت کی وجہ سے یہ دونوں قصبے ایک ساتھ پکارے جانے لگے اور کڑا مانکپور کے نام سے مشہور ہوئے۔ تحصیل سراتھو کا یہ سب سے بڑا قصبہ رہا، شرفا اور علماء و شعرا کا ہر زمانے میں مسکن رہ چکا ہے۔

کڑے کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس کا تذکرہ جن اہل قلم کی تصانیف میں ملتا ہے ان میں ابن بطوطہ۔ شہنشاہ بابر۔ ابوالفضل۔ عبدالقادر بدایونی۔ اورنگ زیب عالمگیر۔ عبدالحق محدث دہلوی۔ عبدالحئی لکھنوی۔ نظامی بدایونی پروفیسر ضامن علی وغیرہم شامل ہیں۔ سب نے کڑے کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے کیا۔ مگر کسی کو یہاں "بنتولیوں" کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آیا کسی کی صرف "حاسدان کڑا" پر ہی نظر ختم کر رہ گئی اور کوئی خواجہ

کی کرامات و بزرگی کا سرسری تذکرہ ہی اپنا تحقیقی فریضہ خیال کرتا رہا۔ یہاں کے کھنڈرات اور آثار مٹائے جا سکتے ہیں مگر علم و فضل کا وہ سکہ جو یہاں کے اہل کمال بٹھا گئے ہیں ہمیشہ ٹکسالی رہے گا۔

تذکرہ علمائے ہند۔ مولفہ رحمان علی میں بھی کڑے کے اکثر صوفیا مثلاً ابوالخیر محمد معین الدین مشہدی کڑوی (۱۳۰۴ء) فرید الدین احمد بن سید محمد رلجے۔ مولانا معزالدین ولد سید خیرات علی مشہدی (۱۸۳۹ء / ۱۲۵۵ھ) کا تذکرہ ملتا ہے۔ نزہتہ الخواطر میں مولانا خواجگی (۸۹۸ھ / ۱۸ محرم) شیخ کمال الدین محمد ابن ظہیرالدین عباسی (۸۷۰ھ / ۲۰ شعبان) شیخ ضیاء الدین قاضی تاج الدین کڑوی۔ قاضی رکن الدین۔ قاضی مظہرالدین مولانا موید الدین کڑوی (۸۰۶ھ / ۱۳۰۶ء) اور مولانا نصیرالدین کڑوی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ مگر علماء و فقہا کا سرسری تذکرہ کڑے کے خدوخال کو صحیح طرح سے نہیں ابھار سکتا۔ کڑے کی تہذیب و تمدن میں یہاں کے علماء و فقہا۔ زہاد و فقرا۔ کاریگر و پیشہ ور۔ شعرا و ادبا۔ صنعتکار و فنکار۔ بچے بوڑھے۔ عورت مرد سب کا حصہ ہے قبل اس کے کہ ہم اپنے اصل موضوع پر قلم اٹھائیں

ضروری ہے کہ یہاں کی تہذیب و تمدن، مشہور اشیا، ثقافت اور ماحول کا بھی مختصراً تذکرہ کر دیا جائے جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ اس ماحول کا کیا اثر یہاں کی زبان و بیان پر پڑا۔

صنعت وحرفت

اس دور میں کڑے کی شہرت یہاں کی تعزیہ سازی کی وجہ سے ہے۔ قرب وجوار کے علاوہ دور، دراز اضلاع سے لوگ یہاں تعزیہ لینے آتے ہیں۔ یہاں کے تعزیوں کی شہرت اور کاریگری لوگوں کو اپنی سمت کھینچ لاتی ہے۔ اس کا بیوپار عام طور سے آخر عید الضحیٰ اور محرم الحرام کے پہلے ہفتہ میں ہوتا ہے۔ یہ صنعت یہاں سال بہ فروغ پاتی رہتی ہے اور سیکڑوں ہزاروں روپے کی لاگت کے تعزیئے یہاں ہر سال تیار اور فروخت کئے جاتے ہیں۔ یہاں کاغذیوں کا کاروبار بڑے عروج پر تھا۔ مگر اب ان کاغذیوں کا پیشہ کاغذ بنانے یا کاغذ فروخت کرنے کی بجائے صرف تعزیہ سازی رہ گیا ہے۔

یہاں کی دوسری اور اہم صنعت "چندیا" ہے جو بابا لوک داس ملوکا کی ایجاد بتائی جاتی ہے۔ چندیا ایک قسم کی مٹھائی ہوتی ہے جو گول ٹکیوں کی شکل میں چھوٹی روٹی کی طرح شکر سے بنائی جاتی ہے اور اس پر تل جما دئے جاتے ہیں۔ یہ کڑے اور اس کے قرب وجوار میں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہے۔ خاص طور سے خوشی

کے موقعوں پر بھی مٹھائی لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے۔ دوسری مٹھائی "پیور ناسے" بھی کڑا کی ایجاد بتائی جاتی ہے۔ یہ بانسری کی شکل کی ایک سفید رنگ کی مٹھائی تقریباً ایک بالشت یا اس سے کچھ کم لمبی ہوتی ہے۔ اور عام دنوں کے علاوہ خاص طور سے دیوالی کے تہواروں میں کافی بکتی ہے۔

جڑاؤ کام۔ خاص طور سے یہاں کا جگنو بہت مشہور تھا اب بھی دو ایک کاریگر ایسے ہیں جن کے کام کی شہرت دیار و امصار میں پھیلی ہوئی ہے اور لوگ اپنے زیورات بنوانے کے لئے یہاں دور دور سے آتے ہیں۔ انھیں پیشہ وروں کی مناسبت سے ایک علاحدہ محلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ کام کرنے والے "جڑیا" کہلاتے ہیں

جب کاغذ بنانے کے مل لکھنؤ میں قائم نہیں ہوئے تھے اس سے قبل دیسی کاغذ بنانے کی صنعت بھی یہاں کافی ترقی کر گئی تھی۔ جدید دور میں ملوں کے کاغذ نے کڑا کے ہاتھوں سے یہ صنعت چھین لی ہے اور اب یہ ایک قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہے۔

کمبل بننے کا بھی کاروبار یہاں پایا جاتا تھا کڑے کا کمبل ایک پاٹ کا بہت مشہور تھا۔ آس پاس کے دیہات کے لوگ اپنے استعمال کے لئے کمبل یہیں سے خرید کر لے جایا کرتے تھے۔ یہ بہت گرم اور دبیز ہوا کرتا تھا۔ مگر اب اس کا بھی کوئی وجود اس قصبہ میں نہیں پایا جاتا۔

خشت سازی دور قدیم میں کڑے کا خاص اور محبوب پیشہ

تھا مگر اب قدیم مکانات اتنے کھنڈر ہو چکے ہیں اور لکھا دری اینٹیں اتنی کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں کہ خشت سازی کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ البتہ انگریزی قسم کی "گما" اینٹوں کے لئے کبھی کبھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

کسی زمانے میں گوٹے بنانے کی صنعت کا کڑے میں بہت عروج تھا۔ مگر اب یہ صنعت بھی یہاں سے مفقود ہو چکی ہے اور اب اس کے کاریگر یہاں نہیں ملتے۔

میلے:۔

سید سالار مسعود غازی کا میلہ "گڑ کھبت" کے نام سے کبیری گھاٹ، پر دریائے گنگا کے کنارے اس سڑک کے متصل منعقد ہوتا ہے جو سرا تھو سے دریائے گنگا کو ملاتی ہے۔ یہ میلہ جیٹھ کے مہینے میں آخری جمعرات کو منایا جاتا ہے۔ جس میں پہلے کباب اور فیرنی بڑے خاصے کی چیز تھیں۔ مگر اب آلو اور مٹر کے چٹ پٹوں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ گڑ کی جلیبی۔ چندیا اور دوسری مٹھائیاں بکتی ہیں۔ لکڑیاں بھی اپنی قدیم روایات کے ساتھ عوام الناس میں اسی طرح مقبول ہیں جیسی "سید صاحب" کو مرغوب تھیں۔ ڈفالی اپنی ڈفلی بجاتا اور اُچک اُچک کر ایک جھنڈے (جسے غازی میاں کہتے ہیں) کے نیچے کرتب دکھاتا ہے۔ جلتی دیا سلائی منھ میں رکھ لیتا

منھ سے دھواں کھینچ کر آنکھ اور ناک سے نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دور دراز کے دیہات۔ گاؤں اور قصبوں سے ہندو مسلمان عورتیں منتیں مانتی ہیں گود پھیلا پھیلا کر بچے مانگتی اور چڑھاوے چڑھاتی ہیں گنڈے تعویذ کا بیوپار عروج پا تا ہے اور ڈفالی کی جیب بھرتا رہتا ہے۔ پتنگ اڑانے والوں کا اب شوق کم ہو گیا ہے کیونکہ پتنگ اڑانے والوں میں زیادہ تر مسلمان تھے اور وہ کٹنے سے کٹ کر پاکستان پہنچ چکے ہیں جو رہ گئے ہیں وہ پیچ کھا چکے ہیں اور کسی بھی وقت کٹنے والے ہیں۔ اس واسطے پتنگ سازی اور پتنگ بازی دونوں ختم ہو چکی ہیں۔

اشٹمی کا میلہ اساڑھ کے مہینے [illegible] "[illegible]" ([illegible] آبادی ہے) میں بڑی دھوم دھام اور زور شور سے منایا جاتا ہے یہ میلہ سیتلا دیوی کی یادگار ہے جسے اہل ہنود کوڑا کی بانی تصور کرتے ہیں۔ اس میلے میں ہندوستان کے ہر گوشے اور چپے چپے سے پجاری آتے اور گنگا میں اشنان کرتے اور سیتلا دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ اس میلے میں روز بروز اضافہ اور ترقی ہو رہی ہے۔ پہلے یہاں حجامت کے فرائض مسلمان حجاموں کے ذمہ تھے اور اس موسم میں انھیں ہزاروں کی آمدنی ہو جاتی تھی مگر اب انہیں یہاں سے دیس نکالا مل گیا ہے اس لئے مفلوک الحال ہیں۔

قطب الدین محمد مدنی فاتح کڑا کے مزار پر پہلے یہاں بیسیوں میلہ لگتا ہے اور ہندو اور مسلمان عورتیں بچے کی تمنا میں آکر یہاں بہیڑہ درخت کے نیچے اپنی گود پسار کر رو رو کر بچہ مانگتی ہیں اور جس کی گود میں اتفاق سے پھل گرتا ہے وہ اپنی دعا کو شرف بہ قبولیت سمجھ کر خوش خوش گھر واپس جاتی ہیں۔

مزار خواجہ کڑک ابدال پر عرس اب میلہ کی شکل اختیار کر گیا ہے یہ عرس قمری تاریخ کے لحاظ سے دو رجب المرجب کو منایا جاتا ہے مگر زائرین اور مشتاقان دید اور حسرت وصال کے مارے ہوئے دو دو چار چار روز رہ کر یہاں سے خوشی خوشی واپس جاتے ہیں۔ بیل گاڑیوں، گھوڑوں، خچروں اور پیدل چلنے والوں کی تعداد اب لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مٹھائیوں کی دکانیں۔ کھلونوں، چٹپٹوں کے خونچے۔ ہوٹل تماشے نوٹنکیوں کے ناچ ٹکٹ پر دیکھنے کے لئے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ رات کو نقل ہوتا ہے۔ گاگر دریا سے بھر کر لائی جاتی ہے۔ اب شرفا اور رؤسا مفقود ہیں اس لئے دھینگے بینے۔ چلا ہے سجادہ نشین اور ممبر مجلس ہوتے ہیں اور وہی خواجہ کڑک کی فاتحہ شربت اور ماش کی دال کے بنے ہوئے کچوڑوں پر دلاتے ہیں۔ اکثر قوال نو مشق غزلیں گاتے ہیں جن کے مطلب سے زیادہ لے اور سُر کی داد دی جاتی ہے۔ تو اب سا مزار

پھولوں اور کپڑوں کی چادروں سے تقریباً ۸ گنا اونچا ہو جاتا ہے اور دوسری قبروں کی بے حرمتی کافی حد تک ہوتی ہے۔

اخبار و رسائل:۔

کڑے پر تفصیلی و تحقیقی کام نہ ہونے کے باوجود اس امر کی نشاندھی ہوتی ہے کہ دور قدیم میں لوگوں کو لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف کا کافی شوق تھا "حامیٔ ہند" کے نام سے مولوی سید فریدالدین احمد خاں نے یکم جنوری ۱۸۸۳ء سے ایک اخبار جاری کرایا تھا جو تقریباً دو سال شائع ہو کر ۱۸۸۵ء میں ہفتہ وار ہو گیا۔ یہ اخبار ۸ ورق کا تھا جس کا تفصیلی تذکرہ "اختر شہنشاہی" میں ملتا ہے۔ دوسرا اخبار "مسلم دلبستان کڑا" شاہ ہنی اشرف کی ادارت میں ۵ اکتوبر ۱۸۸۴ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہفتہ وار اخبار چھوٹے بچوں کی تعلیم سے متعلق تھا۔ اور ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ تیسرا ہفتہ وار اخبار "کڑا پنچ" تھا جس کے ۴ ورق ہر ہفتہ حافظ سید محمد اسمٰعیل کی ادارت میں ۱۴ فروری ۱۸۸۵ء سے شائع ہوتے تھے۔ چند سال نکلنے کے بعد یہ اخبار بھی سابقہ اخباروں کی طرح بند ہو گیا۔ آخر دور میں مولوی نہال احمد علوی نے الاحسان ایک ماہنامہ یہاں سے شائع کیا جو ان کی حیات تک نکلتا رہا اور ان کے انتقال کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا۔ فی الحال

لے اختر شہنشاہی۔ عان۔ رضا سدار۔ [illegible]

کڑے سے اب کوئی اخبار یا رسالہ نہیں نکلتا۔

تصنیف و تالیف:-

کڑے میں ہر دور میں کچھ نہ کچھ صاحب علم پائے جاتے تھے مگر بد قسمتی یہ ہے کہ ان کے رشحات قلم یا تو منصۂ شہود پر آہی نہ سکے یا انہیں خود اتنی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اپنی کاوشوں کو کاغذی پیرہن بخش سکتے۔

قطب الدین محمد مدنی کے ملفوظات ۔ ملفوظات خواجہ کڑک ابدال ۔ تاریخ ظہور قطبی ۔ مراد مرید مصنفہ مولانا خواجگی[۲] ارشاد الطالبین معیار التصوف اساس الطریقہ مصنفہ محمد ابن ظہیر الدین سہیل یمن مولفہ مولوی رفیع الدین مجموعۃ الانتخاب ۱۲۱۹ء مصنفہ شاہ کمال الدین حسین کمال ۔ دیوان پرورش علی ... دیوان گدا سی شاہ مرات الحقیقت مصنفہ مولوی نہال احمد استغفار مولفہ حسن اعلیٰ ۔ دیوان وحید (قلمی) ۔ دیوان ابو سعید انتخاب وحید مرتبہ علی حسن زیبا ۔ خروش جرس مصنفہ اسحٰق رونق کلام بے نظیر مصنفہ بے نظیر شاہ ۔ مثنوی بے نظیر ۔ تاریخ صد سالہ منظوم کڑا مصنفہ حافظ سید محمد اسحٰق ۔ مجموعۂ قلمی ریاض الحسن عثمانی

۱ تاریخ آئینہ اودھ صفحہ ۵۲ نزہۃ الخواطر جلد دوم۔

سوانح بدرالحسن عثمانی (قلمی)۔ تاریخ کڑا (قلمی) مصنفہ نوراللہ۔ تذکرہ مولانا مکیؒ مصنفہ نہال احمد۔ پاکستان میں کتابیاتی سرگرمیاں — مصنفہ محمد عادل عثمانی۔ شبلی نقادوں کی نظر میں مصنفہ واصل عثمانی شجرۂ عثمانی۔ مصنفہ واصل عثمانی۔ فسانۂ عجائب واصل عثمانی۔ شیشۂ و سنگ مصنفہ سید مدنی حسن آشفتہ۔ اہل کڑا کی تصانیف ہیں۔

پیشہ وران:۔

کڑا ایک ایسا قصبہ تھا جس میں پیشہ وروں کی کافی تعداد تھی ہر پیشے کے لوگ یہاں ملتے تھے اور اپنے فن میں مہارت رکھتے تھے جن کی شہرت دوسرے مقاموں تک پہنچ چکی تھی اور لوگ یہاں کے پیشہ وروں کی خدمات حاصل کرنے دور دراز شہروں تک سے آتے تھے۔ خاص طور سے جراحی کا فن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا "عبدالکریم" و "فقیرے" ایسے جراح تھے جن کی طلب دوسرے شہروں سے بھی ہوا کرتی تھی۔ دھوبیوں میں "مدار بخش" "بچو" "شمبراتن" مراثی میں "یاراتی" اور مراثن "شبرن" "کالکا" حلوائی "مہابیر" اور "رتن" "لچھمن" کے علاوہ درزیوں میں "محمد بخش" "میرا بخش" "مرلی" کنجڑوں میں "عیدو" اور کنجڑنوں میں "گھورا" "کوئلی" جولاہوں میں "میرا بخش" "عبدالشکور" جنڑیوں میں "بینی" "بچوہ" باورچیوں

میں "بابو" "حجاموں میں "میکو" قصابوں میں "جھیدی" "شبراتی"
رنگریزوں میں "اتی) چماروں میں "بھولا" خواجہ کے عہد کی "بہردیا
چمارن" ایسی ہستیاں ہیں جو اپنے اپنے عہد میں اپنی مہارت اور
خوبی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

علوم وفنون:۔

کڑے سے اب علم وفن مفقود ہو چکا ہے۔ صرف اس کے
قصّے اب کچھ صحبت شب کے جلے ہوئے چراغ نما بزرگوں مولوی
بدرالحسن عثمانی۔ سید عبد الاحد
کاظمی۔ رسول احمد کاظمی۔ کے دم تک ہیں جن کے دلوں پر غربت وطن
کا داغ فراق بڑا گہرا ہے ایک زمانے میں کڑے کے مختلف محلّوں
میں کتب و رسائل کے ذخائر موجود رہا کرتے تھے۔ مثنوی مولانا روم
تفسیر کبیر۔ قرآن و حدیث کے معارف۔ فقہ اور علوم متداولہ پر گرما
گرم بحثیں ہوتی تھیں مشاعروں کی محفلیں گرم ہوتیں جلسے منعقد ہوتے
اور علمی وادبی گفتگو میں دن گذرتے راتیں پلک جھپکتے بیت
جاتیں۔ عہد قدیم میں "قطبی محلہ" اور محلہ مولویانہ علم وفضل کے خاص
مراکز تھے محلہ "قصنیانہ" اور "محلہ چوک" اسی تار کی ٹوٹی ہوئی لڑیاں
ہیں۔ ان مشاعروں میں طرحیں دی جاتیں۔ مشاعرے منعقد ہوتے اور
فی البدیہہ شعر گوئی کے مقابلے ہوتے۔ نئے نئے خیالات، بندشیں

اور تراکیب اردو ادب کے ذخیرہ میں اضافہ کی صورت اختیار کرنے۔ پرورش علی سخی اور شبیر علی بشیر سربرآوردہ شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ ادب کا ذوق بڑھتے بڑھتے "بازار کی حویلی" "چودھرانہ" "ڈپٹیانہ" "دریا کنارے" اور پاٹی گلی کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ وحید کے عہد میں قصبہ کڑا کے گلی کوچوں میں شعروشاعری کا غلغلہ بلند ہو چکا تھا۔ مشاعرے۔ مسالمے۔ محلّے محلّے ہونے شروع ہوئے آخر کار اس زمانے کے بچے بچے کو شعروسخن کا ذوق پیدا ہو گیا اس کے بعد مولوی کبیر الدین ظہیر۔ مولوی متین۔ عبدالسمیع کاظمی۔ مولوی نہال احمد علوی اور حبیب اللہ۔ نبی اللہ کا دور آیا۔ کاروان ادب عالم پیری میں پہنچ چکا تھا اور اپنے تاریک مستقبل کے غم میں جھک کر کمان کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ مولوی فضل احمد غریق۔ شیخ عزیز حسن عزیز مولوی فصیح اللہ۔ سید صدیق حسن آشفتہ۔ حمید اللہ۔ مجید احمد مولوی بشیر احمد۔ وحید الدین۔ مولوی محمد رفیع نقوی۔ نوراللہ نے اسے بہت سہارا دینے کی کوشش کی اور اپنی مدد کے لئے نوعمر و نوجوان خون کو پکارا۔ زبیر فاروقی شوکت۔ عمادالدین عماد۔ خصال احمد فیض احمد فارشی۔ اسداللہ۔ جوادالحسن شیون۔ سید اعلیٰ وغیرہ بڑھے اور کوشش کی کہ یہ نالیک عہد کڑا اپر اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکے۔ مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب کا جھونکا اتنا سخت تھا کہ

ن جوان ہاتھوں کی طاقت اور حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ اور اردو ادب کا یہ تنا ور درخت جس کی آبیاری سب نے اپنے خون سے کی تھی یک لخت بیٹھ گیا۔ کچھ آنکھیں اس کے اس ڈیل ڈول اور جسامت پر اب بھی اشک ریز ہیں اور کچھ شخصیتیں اس سے رخصت ہو کر حسرت بھری نظر ڈالتی ہوئی اور نمدیدہ دغمدیدہ زیرلب یہ پڑھتی ہوئی پاکستان چلی آئیں ؂

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

وحید الہ آبادی

یوں کہنا چاہئے کہ آزادی کے بعد نقل آبادی نے کرڑا کے تابوت میں آخری کیل بھی جڑ دی اور اب وہاں ترنگے جھنڈوں اور ہندی بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کے علاوہ کچھ اور نہیں رہ گیا۔ راجہ جے چند کا قلعہ اپنے بڑے بڑے ڈراؤنے دانت نکالے پوری خباثت سے مسجد جامع کی طرف بڑھ رہا ہے سیتلا دیوی کے مندر کی ٹناٹن بڑھتے بڑھتے اب مولویانہ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے "پاٹی گلی" اب پٹ چکی ہے۔ پرورش علی سحی۔ وحید الدین وحید۔ امیر حسین عثمانی کے گھروں میں تمباکو کی کاشت ہو رہی ہے "بازار حویلی" کے اس عظیم پھاٹک پر گھوڑا بندھا ہوا ہے۔ جہاں پہلے فضلا اپنی علمی وادبی محفلیں

گرم کرتے تھے۔ اب وہاں فضلہ پڑا دکھائی دیتا ہے۔ چودھرانے میں ہل چلتے ہیں یکمئی زیادہ تر بوئی جاتی ہے۔ کرڑا میں فی الوقت تمبا کو، لکھا دری اینٹیں اور لونی کافی تعداد میں پائی جاتی ہے کیٹے کے وہ گھر جو محلوں کی مانند تھے اور پھر بھی چار پائی بچھانے کیلئے لوگوں کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اب ان کی جگہ میدان ہی میدان ہے ایک ایک محراب اور ایک ایک دالان جہاں خاندانی چپقلش کا سبب بنتا تھا آج اپنے مکینوں کے لئے رو رہا ہے۔ کتب خانے جو کبھی مولویانے۔ بازار کی حویلی اور قصبیانے میں پائے جاتے تھے۔ اب ان کا ذکر الف لیلےٰ کی داستان ہے۔ یہ کتب خانے دریا برد ہو چکے ہیں یا قرب وجوار کے دیہاتی کرڑا آکر بنیوں سے اٹھیں میں چھالیہ، کتھے کی پڑیا بندھوا کر لے گئے ہیں کرڑے کی گلیاں جہاں قطب الدین محمد مدنی۔ قطب الدین ایبک علاؤ الدین خلجی۔ راجہ جے چند۔ حاجی جمال۔ قاضی احمد محتسب جیسے بادشاہان اور فاتحین کرڑا۔ خواجہ کرک ابدال (م ۱۰۷۰ھ) مولانا خواجگی (م ۹۷۶ھ) گدا علی شاہ۔ یوسف شہید۔ شاہ اسمٰعیل فاروقی مولانا زین العابدین۔ مولوی نہال احمد علوی ایسے بزرگان قاضی شمسی۔ مولوی قاسم یار۔ شاہ فضل اللہ۔ اصغر علی جیسے صاحب علم وفضل۔ مولوی رفیع الدین۔ مولوی امر اللہ۔ مولوی محمد متین۔ محمد باقر عثمانی ایسے نامور وکلاء۔ فرید الدین۔ نبی اللہ۔ اظہر حسن۔ سید صدیق حسن ایسے اعلیٰ حکام۔ فیاض الحسن۔ عثمانی۔ کلن میاں۔ جمال احمد علوی۔ لالہ متولال۔ مجید احمد۔ بشیر احمد عثمانی۔ وحید کرڑوی ایسے مشاہیر۔ وحید الدین وحید۔ بشیر علی بشیر

پرورش۔ علی سخی۔ شاہ کمال الدین۔ حسین کمال۔ بابا ملوک داس۔ بے نظیر شاہ عارف حسین عارف جیسے باکمال شعراء گذرے ہوں اپنی قسمت پر فخر کرتی ہے آج بھی ان گلیوں میں وہی گرد اڑ رہی ہے جس کو ہمارے آباؤ اجداد کے قدموں سے شرف حاصل ہوا تھا۔

آج بھی ان کوچوں میں وحید کے نغمے۔ حاجی جمال کی تکبیر اور علاؤ الدین کی للکار گونج رہی ہے۔ اسی کڑا کی سرزمین سے علماء و فضلاء۔ شعراء و ادباء کا ایک زبردست گروہ اٹھا اور اپنی جودت طبع اور فکر سلیم کا مظاہرہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔ اس میں کتنے ایسے گوہر آبدار بھی پنہاں ہو گئے جن کی چمک دمک سے دنیائے شعر و شاعری روشن تھی۔ کتنے ایسے نغمے گونجے جو آج بھی فضا میں نغمگی پیدا کر رہے ہیں۔ مگر افسوس کسے معلوم ہے یہ نغمے یہ گیت۔ یہ اشعار کڑے کے ان سپوتوں کے ہیں جن کے اخلاف اپنے اسلاف کو بھلا بیٹھے ہیں آہ وہ اسلاف جنھوں نے کڑے کی عظمت و بزرگی میں چار چاند لگائے آج ہم ان کی علمیت و برتری میں بٹہ لگا رہے ہیں۔ آیئے ماضی کے شعری ادب کے ان اوراق کو الٹیں جن میں ہمارے آبا و اجداد کی تحریریں اور تصویریں، روپوش ہیں۔ ان اوراق میں کچھ دھندلی دھندلی صورتیں اب بھی نظر آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم ان کو پہچان سکیں اور ان کی ذات سے نہ سہی ان کے رشحات قلم اور ان کی حکایات زندگی سے ہی کچھ استفادہ کر سکیں۔

واصل عثمانی ۱۴؍ اگست ۱۹۷۷ء

ابرارؔ

آپ کا تعلق خاندانی اُسی خاندان سے ہے جس میں عارفؔ و سخیؔ جیسے خوش گو و پُر گو شاعر پیدا ہوئے۔ آپ کا نام نامی سید ابرار علی تھا۔ آپ سید فوت علی تحصیلدار کے فرزند ارجمند تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب تاریخ کڑا مانک پور کے صفحہ ۱۳۶ پر درج ہے۔ آپ ذکیؔ اور رضیؔ کے چچیرے دادا تھے۔ سخیؔ سے آپ کو شرف تلمذ حاصل تھا ولادت اور وفات کی تواریخ کا علم نہیں ہو سکا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

یہ ہست و بود کا دفتر ہے یا کہ بزم عالم ہے
کوئی آتا ہے محفل میں کوئی جاتا ہے محفل سے

اختر

عبید اللہ کاظمی نام اختر تخلص کرتے ہیں۔ موصوف کو ہم نے اپنے حالات زندگی لکھنے کے لئے تحریر کیا تھا آپ نے جواب میں جو خط تحریر کیا اُس سے آپ کے حالات زندگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کی بذلہ سنجی اور مزاحیہ طرز تحریر بھی ظاہر ہوتی ہے۔ خط کا اقتباس یہ ہے۔

"خود میں ایک گمنام ہوں پھر گمنام کے حالاتِ زندگی کیا تو اسے جا ہیں قلم رکھتا ہوں، وہ پھر اٹھاتا ہوں۔ میرا نام محمد عبید اللہ کاظمی اختر بی، اے، ایل، ایل، بی ولد مولوی محمد عبد السمیع صاحب کاظمی بی، اے مرحوم ہے۔ تاریخ اور یوم پیدائش یاد نہیں، ہاں تاریخی نام "اختر محسن" یا محسن اختر ہے جس کی رُو سے فی الوقت میری عمر ۶۵ سال ہے۔ مقام پیدائش حیدرآباد دکن مرحوم ہے جو اب حیدرآباد اندھرا پردیش ہے۔ آبائی وطن قصبہ کڑا ضلع الہ آباد (یو، پی) ہے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد ہی میں ملازمت اختیار کی اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے وظیفہ حاصل کیا۔ آباء و اجداد کی حیدرآباد آمد عہد رفت علاء الدین خلجی کے زمانہ سے ہے۔ اپنے زمانے میں

فٹ بال، کرکٹ اور ہاکی کا مشہور کھلاڑی رہا۔ اب گمنامی اور گوشہ نشینی میں بسر ہو رہی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں، بحمد اللہ حج بیت اللہ (زیارت حرمین شریفین) سے بھی فیضیاب ہوا اللہ قبول فرمائے۔

آپ نے مجھے شاعر سمجھ کر یاد فرمایا، میں شاعر نہیں ہوں اور نہ کسی شاعر کی شاگردی میں رہا۔ حالاتِ زمانہ سے متاثر ہو کر کبھی کچھ کہہ لیا تو وہ تک بندی ہوئی، اپنا دل بہلایا۔ لہٰذا فی الوقت بھی آپ کو اختیار ہے جہاں جو غلطی محسوس ہو آپ اصلاح فرمائیں اور غلطی نظر انداز فرمائیں۔ شاعری میں مبالغہ سے علی العموم سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے اب شاعری بھی (خصوصاً آپ کے لفظوں میں شاعری) ترک کر چکا۔ ذیل کی تک بندی میں کس قدر مبالغہ اور زیادتی ہے خود بخود ظاہر ہو گی۔ آپ کے نام کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی ڈگریاں چھپاں ہیں، جن کی مجھے لاج رکھنی ہے[1]

اختر بڑے زود گو، بذلہ سنج اور فہیم شخص ہیں، چہرے مہرے سے ہی حاجی معلوم ہوتے ہیں، آپ کا متین انداز بیان، سنجیدہ طرز گفتگو اور مخلصانہ رویہ کبھی یہ سوچنے کی طرف توجہ مبذول نہیں کراتا کہ آپ ایک ماہیہ شاعر اور بات میں بات پیدا کرنے والے اعلیٰ شخص ہیں، لمبی داڑھی، گھٹنا

---

[1] شاعر نہ ہونے پر بھی یوں لکھتے ہیں:۔

اک عمر شاعری میں اختر گذر دی
پھر بھی نہ جمع ہو سکا دیوان نہ پوچھئے

پائجامہ، کاندھے پر پیلا رومال کبھی یہ سوچنے پر مجبور نہیں کرتا کہ کسی زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ایسے شعر بھی لکھتے ہیں۔

زنگت میں ہے رخسارۂ معشوق سے زائد
اور بوسۂ رُخ سے یہ حلاوت میں سوا ہے

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اختر کی جولانی طبع یہ بھی کہہ اُٹھتی ہے

مانگو بھی تو وہ ترش مزاج اب نہیں دیتا
کیا میرا دل ہی نذر کھٹائی میں پڑا ہے

"ترش مزاج" اور "کھٹائی" کی مناسبت پھر "کھٹائی میں پڑنا" "اب نہیں نہیں دیتا" کے ٹکڑے بڑی معنویت کے حامل ہیں۔

مگر اختر جھکڑ اور فحاش نہیں بلکہ مزاح نگار ہیں اور ان کی مزاح کے نمونہ بھی ان کی شاعری میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔

ہر اک کہتا ہے میں لے جاؤں گا لیلیٰ کی محمل کو
بڑا پُر لطف جوتا چل رہا ہے ساربانوں میں

اختر حالات و واقعات سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور ایک شاعر کا دل و دماغ رکھنے والا اگر حالات سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ شاعر نہیں بلکہ متشاعر ہے اختر جب حیدرآباد کی بربادی اور تباہ حالی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی ہے اور ان کے اشعار سے ان کی اندرونی کیفیات و جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

خنداں ہے کون کون ہے گریاں نہ پوچھئے
کس حال میں ہے آج مسلماں نہ پوچھئے
مرجھا گئی ہے باغ دکن کی کلی کلی
نرگس کھڑی ہے کس لئے حیراں نہ پوچھئے

اس کا انجام بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہے اور کہتے ہیں ؎

مر کر نجات پائی ہے زندانِ دہر سے
کیا گذری ہم پہ عالمِ زنداں نہ پوچھئے

جس نے کبھی میر عثمان علی خاں کی حویلی کی جوبلی کے موقع پر اپنی گوہر فشانی سے نغمات لئے شعر و شاعری میں ایک نیا رنگ بھرا ہوا اور عثمان علی خاں کی درازئ عمر اور تاج و تخت کی برقراری کے لئے الاپ الاپ کر دعائیں مانگی ہوں وہی ماحول اور واقعات سے متاثر ہو کر یہاں تک کہہ اٹھا ہے

عثمان علی نواب کی دو طرزِ حکمتیں
کیونکر ہوا تباہی کا ساماں نہ پوچھئے
خواب گراں سے عثماں نے ہم کو جگا دیا
اب ہم سے اس کے کارِ نمایاں نہ پوچھئے

"کار نمایاں" جس ایجاز و اختصار کے ساتھ مکمل طور سے نظام کا کردار پیش کرتا ہے اس سے صاحب ذوق حضرات محظوظ ہوں گے۔

اختر عبدالسمیع کاظمی کے فرزند ارجمند ہیں اور عبدالسمیع کاظمی کا نام گیا اور اہل گیا میں گیا دوستی کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں صد سالہ تاریخ گیا کے صفحہ ۹۰ اور ۹۱ پر عبدالسمیع کاظمی کا حال درج ہے اور

یادِ وطن کے عنوان سے جو جلسہ کڑا میں ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا عبدالسمیع کاظمی بھی اُس کے ایک سرگرم رکن تھے اور یہی جذبہ آپ کے فرزندوں میں بھی کارفرما ہے۔ یہ حضرات اپنے وطن عزیز کڑا کو یاد رکھتے ہیں مگر ایک طرح سے یہ لوگ بالکل ترکِ وطن کرکے حیدرآباد کو ہی اپنا وطن بنانے کے لئے تیار ہیں۔ خدا کرے انہیں وطن اور اہل وطن کبھی نہ بھولیں۔

آپ کا نمونہ کلام یہ ہے۔

سنا گیا ہے کہ اختر فرار رہتا ہے
نہیں نہیں وہ تو گنگا کے پار رہتا ہے

بتقریب جوبلی حضور نظام میر عثمان علی جو ۱۹۳۶ء / ۱۳۳۶ف میں منائی گئی۔

شکر ہے نخلِ آرزو آج ہرا بھرا ہوا
شاہ کا جشنِ جوبلی [illegible] مدعا ہوا

شاہ کا جشنِ جوبلی مستمر مدعا ہوا
بندِ غم و الم سے دل آج مرا ہرا ہوا

حق نے وہ دن عطا کیا تھی مجھے جس کی آرزو
نعمت تاج و تخت کا آج مزا سوا ہوا

ہو گیا جشنِ جوبلی نصرت و فتح کا دلیل
پھولوں سے اور پھل سے ہے نخلِ اہل لدا ہوا

محفل دولتِ حضور یوں ہی رہے بھری ہوئی
رنگِ انجمن حضور یوں ہی رہے جما ہوا

اے مہ برج تمکنت مہر سپہر سلطنت
خوش ہو کہ گلشنِ مراد آج ترا ہرا ہوا

اختر خوش نصیب کا اختر بخت ہے بلند
فرق پہ سایہ شاہ کا رد کش صد ہما ہوا

"دو ملکوں کی تقسیم"

تقسیم دو عالم سے اب دل کا یہ عالم ہے
دو ناقۂ وحشی پر محمل نظر آتا ہے
ٹوٹی ہوئی قبروں میں اُلٹے ہوئے شہروں میں
ہنگامۂ دُنیا کا حاصل نظر آتا ہے
جب امن اُٹھا دل سے کیونکر ہو سکا دل حاصل
کب ڈوبنے والے کو ساحل نظر آتا ہے

"ہمارے کارنامے"

ہمارے بھائیوں نے اپنا گھر غیروں کو دے ڈالا
مگر زیادہ نہ ہاتھ آیا انہیں کچھ مختانوں میں
ہمارے کارناموں کو زمانہ یاد رکھے گا !!
ہماری داستاں باقی رہے گی داستانوں میں
انہیں تم دیکھتے ہی سر بسجدہ ہو گئے فوراً
عجب جادو بھرا ہے ان کے قدموں کے نشانوں میں
ہزاروں ہو گئے مقتولِ اجل کس کس کو ہم روئیں
ہمیں اک نوحہ گر رکھنا پڑے گا نوحہ خوانوں میں
خدا کے فضل سے یہ طے ہوا ہے آسمانوں میں
کہ اب چین گلچیں بھی نہ پائے آشیانوں میں

نہ جانے مشورے کیا کیا ہوئے ہیں باغبانوں میں
کہ پھولوں کی جگہ خاک اُڑ رہی ہے گلستانوں میں
نہ ایسا میزباں دیکھا جہاں کے میزبانوں میں
لٹایا اپنا سب گھر بار اپنے میہمانوں میں
پڑی ہے کھلبلی یہ رات دن اب باغبانوں میں
کہ گلچیں کا تسلط ہو گیا ہے گلستانوں میں
فسانہ غم کا سن کر کہتے ہیں یونہی کہے جاؤ
بڑا پُر لطف قصہ ہے تمہارا حکمرانوں میں
غریبوں کی نداؤں کا بھلا ان پہ اثر کیا ہو
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقارخانوں میں
نہیں پھولی شفق خونِ شہیداں رنگ لایا ہے
ملائک نے صفِ ماتم بچھائی آسمانوں میں
امیروں کا خزانہ جب غریبوں کے نہ کام آئے
سمجھو سانپ بچھو پال رکھے ہیں خزانوں میں
ہر اک کہتا ہے میں لے جاؤں گا لیلیٰ کے محمل کو
بڑا پُر لطف جوتا چل رہا ہے ساربانوں میں
اگر انصاف کا عالم یہی ہو گا تو سُن رکھئے
کہ طوطی کی جگہ بولے گا اُلّو آستانوں میں
نہیں ہیں میر و مرزا آج زندہ ورنہ اسے اختر

وہ لکھ دیتے تمہارا نام بھی گوہر فشانوں میں

"خربوزہ کی تعریف"

خربوزہ کی تعریف میں منہ میرا کھلا ہے
چاقو کے عوض ہاتھ میں خامہ کو لیا ہے
اب اپنا غزل گوئی سے دل ہو گیا پھیکا
کیا ہوگا کسی شعر میں جو اس میں مزا ہے
رنگت میں ہے رخسارۂ معشوق سے زائد
اور بوسۂ رخ سے یہ حلاوت میں سوا ہے
چھلکا ہے اب یار تو قاش اس کی ہے ابرو
تم بیجوں سے اس کے دُردنداں میں ضیا ہے
مانگو بھی تو وہ ترش مزاج اب نہیں دیتا
کیا میرا دل زار کھٹائی میں پڑا ہے
ٹوپی کی ضرورت ہے زمانہ کی ضرورت
اک قاش ہو خربوزہ کی بس کام ہوا ہے
اترا تھا زمانہ میں کبھی منّ و سلوے
اب جا کے بدل خیر سے خربوزہ ملا ہے
موسکو سے بہت بیج منگائے تھے رضا نے
سیلاب کی طغیانی نے برباد کیا ہے

لے موسکو MOSCOW

"پولیس ایکشن پر ایک نظم"

خنداں ہے گورنر، کون ہے گریاں نہ پوچھیے
کس حال میں ہے آج مسلماں نہ پوچھیے
عثمان علی نواب کی دو طرف حکمتیں
کیونکر ہوا تباہی کا ساماں نہ پوچھیے
جامِ فنا جنہوں نے پیا ان پہ روئیے
کیوں بے نشاں ہیں گورِ غریباں نہ پوچھیے
نیرنگیٔ زمانہ سے ہر اک ہے دم بخود
کیوں ہر بشر ہے سر بہ گریباں نہ پوچھیے
خوابِ گراں سے عثماں نے ہم کو جگا دیا
اب ہم سے ان کے کارِ نمایاں نہ پوچھیے
مرجھا گئی ہے باغِ دکن کی کلی کلی
نرگس کھڑی ہے کس لئے حیراں نہ پوچھیے
دستِ کرم غریبوں کی جانب بڑھائیے
افسوس ہے جو حالِ غریباں نہ پوچھیے
اک آرزو بھی اپنی نہ نکلی تمام عمر
کچھ ہم سے حالِ قلبِ پریشاں نہ پوچھیے
دولت جب اپنی کام نہ آئی غریبوں کے

لاگو ہے مارِ آستینِ عثماں نہ پوچھئے
اب تک جہاں میں اس نے کسی سے وفا نہ کی
بے مہریٔ حیاتِ گریزاں نہ پوچھئے
پاتا ہوں فیض درگہ حق سے بقدرِ ظرف
کچھ ہم سے رنجِ تنگیٔ داماں نہ پوچھئے
کیا کیا نہ انقلاب زمانہ میں ہو گئے
کچھ ہم سے حالِ گردشِ دوراں نہ پوچھئے
اب قیدِ سیکڑوں کی نہ کچھ جونیئر کی ہے
اک کارکردگی ہے نمایاں نہ پوچھئے
بھر بھر کے جام دیتی ہے وہ چشمِ مے فروش
کچھ ہم سے کیفِ نرگسِ مستاں نہ پوچھئے
لے جائے گا یہ ہم کو کہاں کچھ خبر نہیں
احوال ہم سے لعلِ بدخشاں نہ پوچھئے
ہر مبتلائے گیسوئے جاناں کو دیکھ کر
احوال رشکِ سنبلِ پیچاں نہ پوچھئے
مر کر نجات پائی ہے زندانِ دہر سے
کیا گذری ہم پہ حالتِ زنداں نہ پوچھئے
اک عمر شاعری میں اگرچہ گذار دی
پھر بھی نہ جمع ہو سکا دیواں نہ پوچھئے

اختر

شیخ یزداں بخش نام پسر شیخ جہانیاں مرحوم اختر تخلص کہتے تھے آپ کا آبائی وطن کٹرہ مانک پور ہے۔ آپ کا نام عام تذکروں میں نہیں پایا جاتا۔ صرف "تذکرہ شورش" میں نام آیا ہے اور ذیل کے اشعار نمونہ کلام میں پیش کئے گئے ہیں۔

دی آبرو جہان میں ابر بہار کو
رحمت ہماری اس مژۂ اشک بار کو
اختر مجھے نہ پوچھے تو پھر کون پوچھے آہ
جیتا رکھے خدا ترے اس دوستدار کو

اظہر

ابھی تذکرہ زیر ترتیب ہی تھا کہ ممبئی کا "البلاغ" کراچی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں نظر پڑا۔ اس رسالہ میں ایک مضمون قاضی اطہر مبارکپوری مشائخ گردیزی کے متعلق نظر پڑا۔ میں نے ایڈیٹر کا نام تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی قاضی اطہر مبارکپوری ہی ہیں پھر کیا تھا کٹرا کی شخصیات کے بارے میں مزید تلاش کے لئے میرا خط پڑ لگا کر اڑا اور پھر ان کا محبت آمیز خط ملا تو کیا کہئے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بچھڑا ہوا اپنوں میں آگیا ہو۔ قاضی صاحب کی

ہمت افزائی نے حوصلے بلند کئے اور میں نے اپنے رہوار قلم کی رفتار تیز کی، اثنائے مراسلت میں یہ بھی پتہ چلا کہ

ہم وہیں کے ہیں جہاں کے تم ہو

بذریعہ خط میں نے حالات زندگی معلوم کرنے کی کوشش کی، حالات مختصراً آگئے اور میرے مرتب کردہ تذکرہ کو زینت بخشی۔

میں کڑا کی بربادی، تباہی اور خستہ حالی پر آنسو بہا رہا تھا، اور قحط الرجال کا رونا رو رہا تھا کہ قاضی اطہر کی نئی دریافت نے میری تحقیق و تدقیق کا کایا ہی پلٹ دی۔ ان کا آبائی وطن یہی کڑا مانک پور ہے جو اودھ سے پہلے مشرق میں مسلم حکومت کا مرکزی مقام تھا۔ شیخ طریقت حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلیفہ اجل حضرت سید حامد شاہ کے پرپوتے حضرت راجہ سید مبارک شاہ آپ کے جد امجد تھے۔ حضرت راجہ سید مبارک شاہ شہنشاہ ہمایوں ۹۳۷ھ تا ۹۶۲ھ کے زمانہ میں کڑا سے منتقل ہو کر اعظم گڈھ کے ضلع میں آ کر مقیم ہوئے اور اپنے نام کی مناسبت سے ایک قصبہ مبارکپور آباد کیا جس کی آغوش میں بیسیوں علماء و فضلا آج بھی پائے جاتے ہیں۔ راجہ سید مبارک کے خاندان میں عہدۂ قضا اور نیابت بھی رہا جس کے اسناد قاضی اطہر کے پاس اب تک موجود ہیں اور اسی نسبت سے ان کا خاندان قاضیوں کا خاندان کہلایا۔ قاضی صاحب کے پاس جو اسناد ہیں ان سے آپ کا شجرۂ خاندانی کا یوں سراغ ملتا ہے۔

قاضی اطہر بن حاجی حسن بن حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ

محمد صفا بن شیخ امام بخش۔

آپ کی بے شمار تصانیف اور تالیفات کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ عمر نوح رکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کے خط سے ہی پتہ چلا کہ آپ کی عمر ابھی صرف پچاس سال ہی ہے۔ آپ کو ابتدا میں شعر و سخن سے دلچسپی ہوئی اور بڑے اچھے اشعار کہے، غزلیں کہیں، مشاعرے لوٹے، سنگلاخ زمینیں پامال کیں، مشاعروں میں داد و تحسین سمیٹی مگر پھر بھی اپنے دامن کی تنگی کا احساس ہوا۔ آپ کی شاعری کا غلغلہ دور دور تک پہنچا، اخباروں اور رسالوں میں آپ کی غزلیں شائع ہوتیں۔ لوگوں نے تعریف کے خطوط لکھے اور آپ کے ذوق علمی و شعری کی داد دی۔ مگر خدا جانے کیا وجہ ہوئی کہ شعر و سخن کا یہ ہونہار علمبردار تحقیق و تدقیق کی طرف مڑ گیا۔ نثر میں اپنی جگہ پیدا کی اور اسلامی تاریخ میں پاکستان و ہند کے علاوہ بیرون ممالک میں بھی بہت نام پیدا کیا۔ شہرت کے نقطۂ عروج پر بھی پہنچ کر عجز و انکسار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، نظمیں اور غزلیں سبھی کچھ لکھتے اور لوگوں سے ستائش وصول کرتے تھے۔ مذہبی، سیاسی، روحانی ہر قسم کی نظم لکھتے رہے ۱۹۴۵ء سے جولائی ۱۹۴۷ء تک مبارک منزل بھاٹی گیٹ لاہور میں قیام رہا۔ حضرت احسان دانش، مولانا نصر اللہ خان عزیز، تاجور نجیب آبادی، لطیف انور، حافظ امرتسری، شورش کاشمیری اور دوسرے ارباب شعر و سخن سے گہرے راہ و رسم تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا ابو القاسم دلاوری، مولانا عبد اللہ جالندھری صاحبزادہ مولانا خلیفہ شجاع الدین، حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے

ملاقاتیں کیں۔ اس دوران میں آپ کی نظمیں کونژاد مسلمان میں شائع ہوتی تھیں۔ آپ محمد عثمان فارقلیط کے ساتھ اخبار "امروز" کے ادارہ میں شریک تھے جہاں آپ نے صحافت کا کافی تجربہ حاصل کیا۔

آپ کی تصانیف جنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی، ان میں "رجال السند والہند (عربی)" کا خصوصیت سے تذکرہ کیا جا سکتا ہے اس کتاب کو بلاد عربیہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کم تصانیف کو ہوتی ہے۔ آج کل آپ اپنی نادر تصنیف "ہندوستان کی فتوحات عہد خلافت میں" مشغول ہیں "عرب و ہند عہد رسالت میں" بھی آپ کی بڑی رفیع تصنیف ہے جس میں بڑی دیدہ ریزی اور مزاجی سے کام لیا گیا ہے اور محققانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اسے سن ۱۹۶۵ء میں دار المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے۔ قاضی صاحب کی تصانیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کچھ از معلومات ہوتی ہیں اور علمی و دینی تاریخ پر بیش بہا مواد پیش کرتی ہیں۔ ایک کتاب "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" بھی دار المصنفین دہلی شائع کر رہا ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ آپ کے کئی کتابوں کے مسودات لوگوں نے دبا رکھے ہیں، کچھ ادھوری شکل میں ہیں۔ اور اس طرح سے آپ کے علمی مواد کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا یہاں چند تصانیف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قیام لاہور کے زمانہ میں آپ نے منتخب التفاسیر کے نام سے قرآن شریف کی اُردو میں ساڑھے نو سو سے زائد صفحات میں تفسیر لکھی جس کی کتابت بھی ۱۲ پارہ تک ہو گئی تھی۔ مگر بعد میں غالباً شائع نہ ہو سکی۔ اسی طرح چار سو صفحات میں "علمائے اسلام کی خونیں داستانیں" لکھی جسے احسان دانش صاحب مکتبۂ دانش سے شائع کرانے والے تھے اور دو سو سے زائد صفحات تک کی کتابت ہو چکی تھی مگر پھر شائع نہ ہو سکی۔ اب بھی کتابت شدہ مسودہ احسان دانش کے پاس موجود ہے۔ "الصالحات" کے نام سے حضرات صحابیات کے حالات لکھے جو ملک دین محمد اینڈ سنز کے مالک جناب محمد لطیف صاحب نے شائع کرنے کے لئے لی مگر آج تک شائع نہ کیا۔ "آئمہ اربعہ" کے نام سے چاروں آئمہ کے حالات میں ایک کتاب لکھی اور "مرکز تنظیم اہل سنت" لاہور کی طرف سے اس کی کتابت ہوئی مگر وہ بھی شائع نہ ہو سکی۔ قاضی صاحب نے حسن محنت و جانکنی سے رات رات بھر جاگ کر یہ مسودات تیار کئے تھے وہ سب لوگوں کی لاپرواہی کی نظر ہو گئے۔ اپنی ان تصانیف کی بربادی پر آنسو بہاتے ہوئے انہوں نے بڑے دردناک انداز میں مجھے لکھا ہے کہ "لاہور کی یاد کی طرح اپنی ان کوششوں کی بھی یاد آتی رہتی ہے"۔

تقسیم کے بعد بھروچ گئے اور سورت میں اخبار نویسی، مدرس عربی دینیات کی مدرسی کی۔ پھر بمبئی تشریف لے گئے اسی دوران قیام میں آپ نے دو مرتبہ اس دیار پاک کے جلووں سے اپنی نظروں کو منور کیا جس کی زیارت کے لئے ہر مسلمان کا دل پہلو میں دھڑکتا ہے یعنی "دیار پاک" جسے مدینہ منورہ شریف

کھتے ہیں۔ پہلا حج آپ نے ۱۳۷۴ھ اور دوسرا ۱۳۹۵ھ میں کیا۔ "اخبار الفلاب" و رسالہ "البلاغ" کی ادارت کا بار بھی آج تک آپ ہی پر ہے، جس خلوص، محنت، اچھی لگن اور دیانت داری سے فن کی خدمت آپ کر رہے ہیں اس کے تصور سے ہی لرزہ آتا ہے۔ وضو ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوئی انسان ہیں یا جن۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو یا تو ان کے پاس کوئی جادو کا الہ دین کا چراغ ہے یا پھر شیخ حسام الحق جیسے جید عالم اور صوفی کی دعاؤں کی برکت۔ اگر کام کرنے کا سبق مجھے کہیں سے حاصل ہوا تو وہ آپ ہی کی ذات بابرکات ہے۔ ممبئی کے قیام میں آپ نے جس علمی و ادبی فضا کو اپنے اوپر مسلط کر رکھا ہے اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ آپ یہی مسلمان "معارف القرآن"۔ "صفات الحاج"۔ "علی و حسین"۔ "رجال السند والہند (عربی)"۔ "افادات حسن بصری"۔ "حج کے بعد" "عرب و ہند عہد رسالت میں" "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" لکھیں۔ آپ عربی میں کامل دست گاہ رکھتے ہیں۔ تحریر و تقریر میں آپ کا بڑا اعظم ہے مدمقابل نظر نہیں آتا ہے۔ دولتِ کویت کے ادارۂ التراث العربی کے علمی مشیر ہیں۔ سعودی عرب۔ کویت۔ مصر میں آپ کی عربی دانی کا سکہ بیٹھا ہے۔ آپ کے مقالہ جات کی تعریف و توصیف اکثر اوقات ہوا کرتی ہے۔

آپ کا ننھیال مبارکپور سے قریب رسول پور میں ہے آپ کے نانا حضرت مولانا احمد حسین صاحب، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری، مولانا اشرف علی

تھانوی۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی اور شیخ محمد طیب عرب صاحب کے ارشد تلامذہ میں تھے جو خود عربی کے بہت اچھے شاعر و ادیب تھے۔ ان کا دیوان (عربی) قاضی صاحب نے ہی شائع کرایا ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں آپ کی تصانیف میں سے ہیں۔ قاضی صاحب کو علم دین سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ آپ کے فرزند خالد کمال مبارکپوری دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدینہ منورہ کے جامعہ اسلامیہ میں پانچ سال سے زیر تعلیم ہیں۔ یہ سب قاضی صاحب کے علمی مذاق اور تبحر علمی کا ہی فیضان ہے کہ وہاں کے مشائخ نے آپ کی درخواست پر آپ کے فرزند کو وہاں بلا لیا۔

قاضی صاحب کا کتب خانہ علمی و دینی کتابوں کا مخزن ہے۔ آپ کے پاس ترکی۔ ایران۔ سعودی عرب۔ پیرس۔ لندن۔ جرمنی اور روس کی مطبوعہ کتابوں کے بے شمار ذخائر ہیں۔

آخر میں آپ کا نمونۂ کلام دیا جاتا ہے۔ جس سے آپ کے بلند ذوق اور علم و فن کا اندازہ ہوتا ہے۔

نا گفتنی!

دم عیش و مسرت سوختہ جانوں پہ کیا گذری
جلی جب شمع محفل میں تو پروانوں پہ کیا گذری

وہ کتنے تھے نہیں معلوم فرزانوں پہ کیا گذرے
نہیں معلوم ان غمخوار دیوانوں پہ کیا گذری

در و دیوارِ زنداں میں مسلسل چیخ اٹھتی ہے
خدایا خیر ہو زنداں میں دیوانوں پہ کیا گذری

فضا سکتے میں ذرّے سوگوار اور دم بخود ہر شے
جو ویرانوں سے ہم گذرے تو ویرانوں پہ کیا گذری

درندے گنگ چیتے سر فگن اور شیر شرمندہ
تو انساں کیا بتا سکتا ہے انسانوں پہ کیا گذری

بھرا کرتی تھی جن کی ہر نظر بجلی دل و جاں میں
نہیں معلوم خود ان شعلہ سامانوں پہ کیا گذری

فرشتوں کے بھی پر جلتے تھے جن کی بارگاہوں میں
نہیں معلوم ان کے شوخ کاشانوں پہ کیا گذری

رہا کرتی تھیں کل تک جن پہ رقصاں عنبریں زلفیں
نہیں معلوم آج ان مرمریں شانوں پہ کیا گذری

نگاہیں طوفِ لاحاصل پہ جن کے جان دیتی تھیں
نہیں معلوم ان دلکش پرستاروں پہ کیا گذری

بڑی حسرت سے مرغانِ قفس یہ ذکر کرتے تھے
نہ جانے اب کے موسم میں گلستانوں پہ کیا گذری

جنوں پہ خاک اڑتی ہے، برہمن دل گرفتہ ہیں
جو بتخانوں سے ہم نکلے تو بتخانوں پہ کیا گذری

بہار چار تنکے آ گئے تھے زد میں بجلی کی
حقیقت میں نہیں معلوم گلخانوں پہ کیا گذری

نہ کوئی چھیڑنے والا، نہ کوئی سننے والا ہے
بہ حسن و عشق کے جاوید افسانوں پہ کیا گذری

گذرنی تھی جو گذری میکشوں پر دیکھنا یہ ہے
ہزاروں سال سے آباد میخانوں پہ کیا گذری

قسم ہے تم کو اپنی بے نیازی کی ذرا سوچو
تمہارے روٹھنے سے میرے ارمانوں پہ کیا گذری

تباہی کا مری، ماتم ہے ابھرا آج اپنوں میں
مگر دیکھے گی کل دنیا کہ بیگانوں پہ کیا گذری

"حدیثِ خویش"

رہی جلے نور سو۔ غم سے شمعِ زندگی برسوں
شبِ مہتاب نے لوٹی ہے، میری روشنی برسوں

سرِ شاخِ نشیمن دہ مرے پہ گیت نغمے کو
چمن سے مل کے روئی ہے سحر کی چاندنی برسوں

شبِ مہتاب کی رنگیں فضاؤں کے تقاضے پر
محبت نے حسیں لمحات کو آواز دی برسوں

کبھی تو ہوتی روشن یہ جبیں، نورِ تبسم سے
تمہارے در پہ ترسے ہیں سجودِ زندگی برسوں

یہ صحرا میری محمل ہے، ہر ذرّے میری دُنیا ہیں
جلایا ہے یہیں میں نے چراغِ عاشقی برسوں

نگاہِ نرگس و لالہ سے انجامِ خزاں پوچھو
نہ دیکھی جائے گی نظمِ چمن کی برہمی برسوں

اٹھا دے شوق سے ظالم! مگر اتنا سمجھ لینا
رلائے گی تری محفل کو بھی میری کمی برسوں

کچھ ایسی یاس چھائی تھی رباب روح پر دل پہ
نہ چھیڑی میں نے محفل میں نوائے زندگی برسوں

جسے میں نے بھلانے کی مسلسل سعی کی اطہر
اسی کی یاد میرے دل کو تڑپاتی رہی برسوں

افتخار

سید افتخار حسین نام۔ افتخار تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد ماجد سید جواد الحسن قائل تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی النقی سے ملتا ہے شجرۂ خاندانی تاریخ کٹرا مانک پور کے صفحہ ۱۳۶ پر درج ہے آپ کے چھوٹے بھائی کا نام اشفاق حسین ہے، دو بھائی اور ہیں جن کے نام معلوم نہ ہو سکے آپ اپنے چچا عارف کے شاگرد تھے جنہیں مولوی وحید سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کے دو لڑکے ہیں۔ ایک اقتدار حسین جو ملازم پولیس ہیں دوسرے اسرار حسین جو گھر پر ہی رہتے ہیں۔ رفیع نقوی اور اشفاق حسین میں گہرے دوستانہ مراسم ہیں اور یہ چند سطور انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔

آپ کی سکونت محلہ بخاری میں تھی۔ جہاں آپ کا انتقال بروز سہ شنبہ ۳ر دسمبر ۱۹۴۰ء مطابق ۳ر ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ کو ہوا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

تنہا چلا میں جانب منزل تو آج کیوں
ہر ہر قدم پہ آپ شریک سفر ملے

امیر

شیخ امیر حسین نام۔ آپ شیخ محمد حسین عثمانی کے فرزند تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب

"شجرہ عثمانی کنزا رشید مین" کے صفحہ ۱۳ پر درج ہے۔ آپ کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے فیاض الحسن کے بیٹے محمد باقر عثمانی کو گود لیا تھا۔

اُس زمانہ کے روساء میں جو خوبیاں پائی جاتی تھیں وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ بٹیر لڑانے، پتنگ اڑانے اور مرغ پالنے کا آپ کو چسکا تھا۔ بازار کی حویلی جہاں آپ کا مولد و مسکن تھا اس میں ایک بہت بڑا مشہور منقش دالان تھا جس کے محراب، چوکھٹ، کھمبے اور ڈیوڑھی سب کے سب کاٹھ یعنی لکڑی کے تھے۔ اس واسطے اس دالان کو "کاٹھ کا دالان" یا "کٹھو دلان" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسی دالان میں فرش بچھا تھا قالینیں بچھتی تھیں۔ بٹیریں لڑتی تھیں، مشاعروں کی محفلیں گرم ہوتی تھیں اور کبھی کبھی قوالوں کی ڈھولک ٹھنکتی تھی۔ امیر کے انتقال کے بعد یہ دالان ویران و سنسان ہو گیا۔ اب یہاں مشاعروں کے بجائے ابابیلوں نے گھونسلے بنا لئے بٹیروں کی جگہ کنکر اور پتھر رُلتے ہوئے نظر آنے لگے اور بازار کی حویلی کی ساری نغمگی نیست و نابود ہو کر رہ گئی۔

آپ کا انتقال بعارضہ دق ہوا۔ ۴ ار رمضان المبارک (سنہ معلوم نہیں ہو سکا) کو سحری کے وقت آپ کو نے ہوئی۔ جس میں سنا گیا ہے کہ آپ کے منہ سے ایک چھپکلی نکلی، ساتھ ہی ساتھ منہ سے کافی خون گرا۔ آپ دیکھتے ہی دیکھتے بہت نڈھال ہو گئے اور چند لمحوں میں علم و فن، شرافت و نجابت، حلم و مروت کا یہ روشن مینار ڈہ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ امیر کا شمار قرب و جوار کے خوبصورت ترین اشخاص

میں ہوتا تھا۔ بڑے وجیہہ شکیل اور قد آور انسان تھے۔ شرم وحیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پرانی تہذیب کے پروردہ ہونے کے باعث پرانی تہذیب وتمدن کے نہایت دلدادہ تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کی بیگم نجات النساء نے اپنے گود لئے ہوئے بیٹے محمد باقر عثمانی کو اپنی تمام املاک کا وارث قرار دیا۔ محمد باقر عثمانی امیرؔ اور نجات النساء کا فاتحہ بڑے اہتمام سے کرتے تھے مگر اب فاتحہ کرنے والا شخص ہی فاتحہ کا محتاج ہو گیا۔ یعنی محمد باقر عثمانی بھی مرحوم ومغفور ہو گئے معلوم نہیں اب فاتحہ اسی اہتمام سے ہوتا ہے کہ نہیں۔

راقم الحروف کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ امیرؔ کا قلمی دیوان بھی ان کے پاس ہے۔ مگر کافی تفتیش کے بعد بھی دیوان دستیاب نہ ہوسکا۔ اس واسطے تحویلِ حافظہ اور اعانت قلم سے قرطاس کے دامن پر ان اشعار کو لایا جا رہا ہے جو بزرگوں سے سینہ بسینہ منتقل ہوتے آئے ہیں۔

پی کے مے آئے ہو زاہد نقل بد چھپتا نہیں
سُرخ ڈورے ہیں پڑے مے کا خمار آنکھوں میں ہے

سر قلم ہو کر مرا لاشہ جو میداں میں رہا
دیر تک قاتل بھی منہ ڈالے گریباں میں رہا

فاتحہ پڑھنے نہ آیا قبر پہ کوئی امیسر
بعد مرنے کے نہ میں یادِ عزیزاں میں رہا

تاریخ وفات کمال احمد مرحوم کمالؔ

کمال احمد شیخ علوی نسب
زحکم قضا در زمیں سر نہفت
پئے رحلتش راز روئے حزیں
بجنت خرامید ہاتف بگفت

۱۳۱۸ھ

آسیؔ

سید شاہ محمد خلیل نام آسیؔ تخلص کرتے ہیں سید محمد ظہور کے صاحبزادے ہیں۔ سال ولادت ۱۹۰۰ء بتایا جاتا ہے۔ تعلیم فارسی، عربی، اردو، انگریزی۔ ابو محمد ثاقب کانپوری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں شروع میں آپ نے حیدرآباد دکن میں وکالت کی۔ لیکن طبیعت کا رجحان ادھر نہ پاکر کڑا واپس آ گئے۔ اور یہاں تیس سال تک بہ عہدۂ پوسٹ ماسٹر رہے۔ آپ کی سکونت محلہ قضیانہ میں تھی۔ آج کل آپ اپنے لڑکوں کے پاس کانپور میں مقیم ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

ہوش اتنا نہیں دامن کو سنبھالوں کیسے
تار در ہ رہ کے بکھیرے ہیں گریباں کے قریب

آثمی عشق کی راہوں میں دفائیں کیسی
الجھنیں بڑھنے لگیں شام عزیباں کے قریب

کتنی خموش حسن کی لہریں ہیں آثمی
دریائے طبع ناز میں طوفاں نہیں ملا

آشفتہ

سید صدیق حسن رضوی نام آشفتہ تخلص، سید علی احمد کے فرزند ارجمند تھے آپنے وہ سربلندی و سرفرازی حاصل کی کہ اس سے قبل تاریخ کڑا میں کوئی اور شخص ان صفات و درجات عالیہ پر نہیں پہنچ سکا کڑے کی آب و تاب میں آشفتہ کی ذات سے جتنا اضافہ ہوا اور کسی شخص کی ذات سے اس دور میں نہ ہو سکا۔ آشفتہ بیک وقت مبلغ دین تھے، مفسر قرآن بھی، شاعر بھی تھے، مصنف بھی، ادیب بھی تھے، اور ایک خدا ترس و رحمدل انسان بھی۔ راقم الحروف ایک بار آپ کا تذکرہ لکھ چکا تھا کہ یکبارگی اس خورشید درخشاں کے غروب ہو جانے کی خبر آئی جس سے ایک ضرب کاری دل و دماغ پر لگی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ تاریخ کڑا کے ہر ورق پر سیاہ

روشنائی اُلٹ گئی ہو اور وہ تحریریں جو ان اوراق پر پائی جاتی تھیں سب محو ہو کر رہ گئی ہوں آشفتہ کا انتقال بُرائی تباہی و بربادی کی مستقل داستان ہے جس سے اُن کی صورت بگڑ گئی، سنگھار اُجڑ گیا اور اس کی بیوگی اپنی حرماں نصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔

آشفتہ کی ولادت ۴ر فروری ۱۹۰۴ء کو ہوئی۔ آپ کا شجرہ نسب شجرۂ عثمانی مرتبہ رشید میٔی کے صفحہ ۲۴ پر درج ہے۔ ان کے والد ماجد سید علی احمد نے مدرسہ دیوبند کے ایک منتہی طالب علم کو پرائیویٹ طور پر رکھ کر آشفتہ کو عربی تعلیم دلوائی۔ ۵-۶ سال میں آشفتہ نے عربی کی ابتدائی کتابوں کو ختم کر لیا۔ اسی اثنا میں ان کے برادر بزرگ سید رشید احمد نے انہیں اپنے پاس پٹنہ بلوا لیا اور انگریزی کے ایک منتہی طالب علم سے انہیں انگریزی کی تعلیم دلوا کر پٹنہ یونیورسٹی سے ہائی اسکول کے امتحان میں شامل کیا جسے آشفتہ نے درجہ اول میں کامیاب کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کامیاب کیا اور ریاضی میں وظیفہ حاصل کیا اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں ی۔ سی۔ ا (لندن) کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ ان کا پہلا تقرر اسسٹنٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے پیلی بھیت میں ہوا، اس کے علاوہ آپ نے رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹی، لیبر کمشنر، سیکریٹری صنعت، پی ڈبلیو ڈی، ندعی اصلاح کمیشن۔ کمشنر لکھنؤ، فیض آباد۔ بنارس اور گورکھپور اور ممبر بورڈ آف ریونیو جیسے اہم عہدوں پر اپنی قابلیت و لیاقت کا ثبوت دیا ہے۔ قصبہ کے یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان کامیاب

گیا۔ کنڑا سے انہیں بے پناہ محبت تھی اور آخر دم تک کنڑا کی خستہ حالی اور ویرانی کو گل و گلزار میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ کنڑا کے ہر چھوٹے بڑے سے بڑی خندہ پیشانی، فراخ دلی اور محبت و خلوص سے ملتے تھے متعارف لوگوں سے بھی آپ کا رویہ برابر جیسا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عام انسان کی سطح سے بلند تصور نہ کرتے تھے، وہ عزیزوں کی دلجوئی۔ اعزا برادری، احباب کی خاطر کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ملازموں سے برابر کا سلوک ان کا رویہ تھا۔ جب کوئی شخص ان کے پاس لکھنؤ جاتا تو کنڑا کے لوگوں کو بڑی محبت سے دریافت کرتے تھے۔ اور ہر کسی سے اس طرح ملتے تھے کہ لوگوں کو کبھی یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ صوبہ کے افسروں میں گورنر کے بعد سب سے بڑے افسر یہی ہیں۔ کہیں کنڑا کے غازی میاں کے میلہ میں کسی معمار کے مٹورے سے تمباکو کھا رہے ہیں تو کسی کے حقہ کا ایک کش لے رہے ہیں ان کی جملہ صفات کا احاطہ کرنا قلم و قرطاس کی اس محدود دنیا میں محال و ناممکن ہے۔ ان کے احاطۂ دوستی میں نیاز فتحپوری عبدالماجد دریا آبادی ابوالحسن ندوی، محمد ادریس ندوی۔ تسکین قریشی جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ فضل احمد کریم فضلی۔ حبیب احمد صدیقی۔ جگر مرادآبادی۔ شوکت تھانوی۔ محمد صدیقی لکھنوی۔ ایسے صاحب علم و کمال ہی نہیں تھے بلکہ ان کے دائرہ دوستی میں وطن کے چھیدی، قصاب، میکو حجام اور چھنو کنجڑا بھی پائے جاتے تھے قصبہ میں کبھی اپنے ہم عمروں میں سید محمد رفیع نقوی، محمد باقر عثمانی اور دیگر شرفا سے گپ ہوتی تو

کبھی بزرگوں میں بشیر احمد عثمانی۔ مولوی متین۔ ابو المعالی وحید الدین کرڑوی دبیر سے گفتگو ہوتی۔

عمر کے آخری ایام میں آپ کو مذہب سے کافی شغف ہو گیا تھا۔ اور بات بات میں قرآن وحدیث کے حوالے سے گفتگو کرنا آپ کا شعار ہو گیا تھا۔ سنیچر کی شام کو گھر کے تمام بوڑھے بچے مرد عورت جمع ہوتیں اور انہیں تفسیر قرآن پاک سناتے، قرآن کے متعلق آپ نے ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے جو آپ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔ ایک مقالہ " ذہنی ارتداد" کے عنوان سے "ندائے ملت" لکھنؤ کے صدیق نمبر میں آپ کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ نثر نگاری اور نظم گوئی میں آپ یکساں مہارت رکھتے تھے۔ آپ کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ اسلام کی ابتدا کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

" اب واقعات کا رُخ اور وقت کا دھارا مڑتا ہے۔ اور ایک ایک لفظ جو اس ہادی برحق نے کہا تھا بجنسہٖ و بعینہٖ مادی دنیا میں ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے۔ ایک معاشرہ تنظیم پاتا ہے جس میں خیر ہی خیر ہے۔ ایک سماج ابھرتا ہے جس میں طمانیت وسکون ہر فرد بشر کو حاصل ہوتا ہے۔ کڑے سے کڑا وقت پڑتا ہے مگر زمانہ وہی "بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی" سنتا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اس سے ٹکراتی ہیں اور پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ مادی دنیا کے عظیم وسائل

اس کی راہ روکنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ سیلاب ہے کہ بڑھتا
چلا آرہا ہے۔"

حبیب احمد صدیقی آئی، سی، ایس سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ان کو خط لکھتے ہیں تو کسی قسم کی جھجک کو قریب پھٹکنے نہیں دیتے۔ ان کی طبیعت تصنع سے بری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب میں تصنع نام کو بھی نہیں۔ ان کے خطوط و مکاتیب سے ان کی بذلہ سنجی، مزاج۔ ظرافت اور انوکھے انداز تحریر کے حسین نمونے ملتے ہیں۔ کہیں کہیں بڑا کے ٹھیٹ دیہاتی و علاقائی لب و لہجہ میں خط کو یوں پُرتاثیر بناتے ہیں کہ تحریر کی بجائے گفتگو اور تقریر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ کبھی "ایسم کرپا" "ارے ظالم" "ارے یار" "پیرو مرشد" "استاد" "مصنف" لکھ کر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، تو کبھی "مخدوم عالی مقام" "یوسف بے کارواں" ایسے خطاب سے مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے ہیں۔

"یوسف بے کارواں، السلام علیکم۔ ۴ مئی کا گرامی نامہ تو لکھنؤ میں مل گیا تھا مگر ایسے وقت میں جب میں سفر کی آخری تیاریوں میں مصروف تھا۔ ادھر مورو ثی پیشہ سفارش کا ہم نے جو لے رکھا ہے اس کے موکلوں نے چڑھائی کر دی ہے جن سے بیعانہ لے چکے تھے ان کا کام کرنا ہی تھا۔ مگر لوگوں کو جو معلوم ہوا کہ اب یہ دوکان چار مہینے کے لئے بڑھنے والی ہے تو پیشگی بکنگ پر آمادہ ہو گئے۔"

دوسرے خط میں جام نگر کے متعلق کس لطیف انداز میں لکھتے ہیں۔

"حضنت۔ جام نگر سے بے جام و مینا لوٹ آیا اور تب سے
اپنے پرانے پیشے سفارش گری میں الجھا ہوا ہوں دعا کیجئے
"اللهم زد فزد" ۱۶ ر کو ایک مشاعرہ ہے جگر صاحب کا مصرعہ
"دل کو سکون روح کو آرام آ گیا" مصرعہ طرح ہے۔ حسب ذیل
غزل اس پر چسپاں کی گئی ہے بتایئے کہ پڑھنے کے قابل
ہے کہ نہیں۔"

اسی قسم کے بے شمار لطیف خطوط ملتے ہیں جس سے ان کی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کے انتقال کا بھی حادثہ کسی المیہ سے کم نہیں ہے موصوف ۶ ر ستمبر ۱۹۶۳ء کو اپنی سالی کے پاس اپنے ہم زلف کی تعزیت میں ملتان تشریف لے جا رہے تھے کہ امرتسر اسٹیشن پر ۱۰ بجے صبح بروز جمعہ پاسپورٹ دکھاتے ہوئے کسٹم پوسٹ پر صرف یہ کہہ پائے تھے کہ "ہم لوگ فرسٹ کلاس" اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ امرتسر سے لاش معہ بیگم بھتیجے اور دو اور اشخاص کے لکھنؤ ۷ ر ستمبر کو پہنچی جہاں آپ کے انتقال کی خبر آناً فاناً پھیل گئی، لوگوں کا ہجوم آپ کے مکان پر ہو گیا۔ وزیر اعلیٰ یوپی اور دوسرے وزراء۔ اعلیٰ حکام۔ عزیز و احباب کا مجمع لگ گیا۔ پولیس مجمع کو قابو میں نہ رکھ سکی ہر شخص موصوف کے آخری دیدار کے لئے بیقرار تھا۔ آپ کی لاش عیش باغ لکھنؤ کے قبرستان میں دفن کی گئی جہاں حکومت کی طرف سے آپ

راج عقیدت پیش کیا گیا تو پوں کی سلامی دی گئی، اور پورے
ری اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ یو پی سیکریٹریٹ میں تعطیل ہو
ازار بند ہو گیا اور لکھنؤ کے گلی کوچے میں صفِ ماتم بچھ گئی، کیا پر
ں کے بادل چھا گئے یاس و حسرت نے ڈیرا جما لیا۔ کرا کی تاریخی بستی
ک بار پھر غم و اندوہ رنج و ملال کی گھٹا سے اپنے بازو پھیلائے،
یرانی برسنے لگی۔

آپ کی المناک موت پر عبدالماجد دریا آبادی جیسے اہل علم و قلم نے
ف جدید جلد نمبر ۳ مطابق ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء میں جو مضمون آشفتہ پہ لکھا،
کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے اس مضمون سے موصوف کے حالات زندگی
زید روشنی پڑتی ہے۔

"جمعہ کا دن ہے، دس بجے کا وقت ہے اور تاریخ ستمبر
کی چھٹی اور ربیع الثانی کی سترھویں کہ ایک ہندوستانی مسافر
عازم پاکستان بہ ظاہر تندرست و توانا امرت سر چیک فارم پہ
اپنا پاسپورٹ افسران متعلقہ کے سامنے پیش کرتا ہے، اور
ابھی پہلا فقرہ بھی اس کے منہ سے تمام نہیں ہونے پاتا کہ
رشتہ حیات تمام ہو جاتا ہے عزیز دوست اور پیارے مخلص
رخصتی سلام قبول ہو۔ تمہارے حسن انجام کی شہادت دینے کو
جمعہ کے دن اور عالم مسافرت کی موت ہی کافی نہیں، بلکہ
تمہارے سوگواروں کا ہجوم عظیم اور خدا جانے کتنی بیواؤں

کی آہیں، یتیموں کے آنسو اور ناداروں کا نالہ و فریاد ہے، مبارک ہو تم کو کہ تمہیں غسل میت ندوہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے ہاتھوں سے دیا، نماز ندوہ کے شیخ التفسیر نے پڑھائی اور جنازہ برداروں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور کتنے ہی علماء و مشائخ اور صالحین شامل رہے۔ نیکی و شرافت کے تم ریکارڈ قائم کر گئے اور دنیا کو صدیقیت کا عملی درس دے گئے۔

نیاز فتحپوری نے "نگار" نومبر ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں بڑے رنج و الم کا اظہار کیا۔ ہفت روزہ "ندائے ملت" لکھنؤ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو "صدیق حسن نمبر" نکالا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

تیرگی حد سے گذرتی ہے جب اندھیاروں کی
تب کہیں مہرِ درخشاں کا پیام آتا ہے
دم بدم گردشِ دوراں کا سلام آتا ہے
کبھی اس طرح بھی جینے کا پیام آتا ہے
جب کہیں تذکرۂ جورِ تمام آتا ہے
کیا کہیں آپ سے کیوں آپ کا نام آتا ہے

محبت تنگ دامن بن گئی ہے
یہ دُنیا سنگ د آہن بن گئی ہے
کئے دیتی ہے بزمِ دل کو تاراج
نگاہِ دوست دشمن بن گئی ہے
جو موجِ آغوشِ ساحل میں پلی تھی
نئے طوفاں کا مسکن بن گئی ہے

مرتے ہیں ہم عشق کی بیگانہ وشی پر
جیتے ہیں محبت کے اشاراتِ خفی پر

اہلِ کشتی خوش نہ ہوں طوفاں اگر کوئی نہیں
بارہا بیڑے ڈبو دیتی ہے موج نہ نشیں
بے سہارا ہو چلا تھا کاروانِ زندگی
آکے ڈھارس دے گئی اسکی نگاہ خشمگیں
یہ بھی نظارے میری آنکھوں نے دیکھے بارہا
آفتاب اُبھرا کئے اور ظلمتیں بڑھتی گئیں

آشفتہ اب گریں گی کہاں بجلیاں کہو!
میرا تو باغباں نے نشیمن جلا دیا

یوں بھی کبھی فراق میں آیا ترا خیال
منزل پہ جیسے کوئی سرِ شام آ گیا
کہنے چلا تھا میں دلِ مضطر کی داستاں
یہ کیا ہوا کہ لب پہ ترا نام آ گیا
سجدے تری تلاش میں تھک تھک کے رہ گئے
اِک اشکِ انفعال مگر کام آ گیا

"مسدّس"

خاک ہو جائے نہ دانہ تو شجر کیونکر ہو
گل پہ ہے گل ہی ہمیشہ نو ثمر کیونکر ہو
شب نہ اپنے کو مٹائے تو سحر کیونکر ہو
دل نہ ٹوٹے تو محبت میں اثر کیونکر ہو
خندۂ گل کی بنا غنچہ کی قربانی پر
موت ہے ایک شکن زیست کی پیشانی پر

جو جہادِ زندگی میں ہو عمل کو تازیانہ
وہ شکست درحقیقت ہے شکستِ فاتحانہ

ہو شوق پُرخلوص تو مانع نہیں حدود
دریا رواں رواں ہے کناروں کے باوجود

راہی سے چھین لیتی ہے شوق سبک روی
آسودہ زندگی کی صعوبت کہیں جسے

نسیم آئی ہے اور یہ پیام لائی ہے
کہ رات بیت گئی صبح مسکرائی ہے

نہ ملا تجھ کو بہاروں سے اگر فیض کوئی
اس کا باعث کہیں خود تنگیٔ داماں تو نہیں

"مستزاد"

مشکل ہوا ان ہیں جنہیں پیاس سے جینا۔ افسوس زمانہ
واللہ وہ ہیں لختِ جگر ماہ مدینہ۔ افسوس زمانہ
درپیش سرِ شام ہے جن کو سفرِ شام، ہے عابد گلفام
اور ساتھ میں ہیں زینبؑ و کلثومؑ و سکینہؑ۔ افسوس زمانہ
بیٹے کی ذرا کلفتِ پا دیکھئے آ کر، اے سبطِ پیمبرؐ
اس آبلہ پائی میں انہیں شام سے جانا۔ افسوس زمانہ

گر جاتے تھے جب تھک کے تو کہتے تھے یہ ناچار۔ خود عابد بیمار
اس دھوپ میں یوں برہنہ پا شام سے جانا۔ افسوس زمانہ

تاریکیٔ زنداں سے جو گھبرا کے سکینہؓ ۔۔ چلّائیں حسینہ
بیساختہ زینبؓ نے کہا پیٹ کے سینہ افسوس زمانہ

زینبؓ درِ خیمہ سے نکل آئیں جو باہر۔ تھرا گئے اختر
گردوں پہ ہوُا شور کہ اے وائے زمانہ۔ افسوس زمانہ

تھے تیس ہزار ایک طرف ظلم پہ مائل۔ اور ان کے مقابل
خورشید امامت ہوُا یہ کہہ کے روانہ۔ افسوس زمانہ

ہاں آلِ محمدؐ پہ یہ تھا ظلم جگر سوز ۔ کہ تین شب و روز
خود شاہؑ نے پایا نہ کچھ آب نہ دانہ۔ افسوس زمانہ

ہاتھوں میں رسن برہنہ سر بیبیاں پیچھے۔ سر نیزے پہ آگے
اک قافلہ اس طرح ہوُا شام روانہ افسوس زمانہ

بیمار تھا زنداں کی صعوبت سے پریشان۔ زینبؓ بھی تھیں نالاں
ہمدرد تھا لیکن کوئی اپنا نہ بیگانہ ۔ افسوس زمانہ

جس گھر کے لئے خوان اُترتے تھے فلک سے، خدّام ملک تھے
ہے ظلم جو اس کو نہ ملے نان شبینہ ۔ افسوس زمانہ

خود اُلفت اولاد سے انصاف طلب ہے اُف کیسا غضب ہے
مظلومی و غربت میں جواں بیٹے کا مرنا افسوس زمانہ

چھ روز سے ہیں اہلِ حرم رن میں پریشاں۔ آشفتہ و حیراں
واکلفت و درد ہائے وائے حسینا۔ افسوس زمانہ

ہم پہ پڑا ہے وقت مگر دورِ انقلاب
تیرا بھی آفتاب لبِ بام آ گیا

بڑھ تو جائے گا اضطراب مگر
آکہ تجھ بن قرار بھی تو نہیں

کس کو معلوم کہ انساں کی معراجِ خرام
راہ چلنے میں ہے یا راہ بھٹک جانے میں

آپ کے لندن سے واپس آنے کی خبر قصبہ میں پھیل گئی، اور آپ کی آمد پر آپ کا پُرجوش استقبال کیا گیا جس کا حال سیّد محمد رفیع نقوی نے مجھے لکھا ہے۔

آشفتہ جب آئی۔سی۔ایس کی ٹریننگ مکمل کر کے ۱۱ر نومبر ۱۹۲۹ء کو ۸ بجے صبح کی گاڑی سے ریلوے اسٹیشن سراتھو اترے تو قصبہ کے عام لوگ ان کے استقبال کو پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ جن میں رفیع نقوی بھی تھے۔ گاڑی آنے کے بعد جب وہ پلیٹ فارم پر اُترے تو ازخود دوڑ دوڑ کر——

ہرکس و ناکس حتیٰ کہ چماروں پاسیوں سے لپٹ رہے تھے۔ جب وہ سبھوں سے مل چکے تو سب لوگ جلوس کی شکل میں انہیں قصبہ تک لائے جب اس کے مکان پر مجمع پہنچا تو دیکھا کہ ان کے والد میر علی احمد جو کہ فالج میں مبتلا ہو چکے تھے ایک آرام کرسی پر پیر لٹکائے ہوئے لیٹے ہیں۔ آشفتہ دوڑ کر والد کے قریب پہنچے اور پیروں سے لپٹ گئے۔ والد نے انہیں دعائیں دیں اور کبر و تکبر سے باز رہنے کی نصیحت کی جو آشفتہ نے مرتے دم تک پوری کی۔ اس آمد کی خوشی میں ایک محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوئی جس کا مصرع طرح یہ تھا۔

"پردے سے نکل آئی ہے تصویر کسی کی"

آشفتہ نے بھی اس طرح میں غزل سنائی۔ مگر اس کے قبل آشفتہ نے جو قطعہ پڑھا تھا اس کا ایک شعر یہ ہے۔

کچھ نہیں مجھ کو شکایت ہاں گذارش ہے ضرور
آپ نے جو کچھ کیا یہ آپ کو شایاں نہ تھا

اس میں غالباً اشارہ ہے کہ ان کے ایک قریبی عزیز نے ان کے مطالبے پر کچھ رقم لندن بھیجنے سے انکار کر دیا تھا

آشفتہ کے انتقال پر ملال پر راقم الحروف نے آپ ہی کی نظم "مرثیہ کرشنا" کے ایک مصرع سے تاریخ وفات نکالی ہے جو درج ذیل ہے۔

یاس سے صدیق کا واصلؔ نے مصرعہ پڑھ دیا
اب کرتے میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں

۱۹۶۳ء

اس کے علاوہ مختلف ماہرین تاریخ گو شعراء نے تقریباً ایک سو تاریخیں لکھیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

صدیق بہ رحمت الٰہی پیوستہ

۱۳۸۳ھ

خدمت انسانی از جہاں رفت

۱۹۶۳ء

آہ خلد منزل صدیق مرحوم

۱۳۸۳ھ

آہ سیّد صدیق حسن مرحوم برفتہ

۱۹۶۳ء

آہ صداقت شعار صدیق حسن مرحوم

۱۹۶۳ء

"خاتمۂ صدیق حسن ہے"

۱۳۸۳ھ

صدیق حسن ذیشان

۱۳۸۳ھ

ایک مکمل غزل درج ذیل ہے۔

دل مرا شرمسار بھی تو نہیں
چشم نم اشکبار بھی تو نہیں

اب یہ بے کیفیوں کا عالم ہے
زحمت انتظار بھی تو نہیں

زندگی زندگی بنی جس سے
وہ خلش بار بار بھی تو نہیں

غم ہی حاصل حیات مگر
غم کا کچھ اعتبار بھی تو نہیں

گل نہیں ہے مگر گل رعنا
چشمک نوک خار بھی تو نہیں

کس سے کہیے جو حادثے گزرے
اب کوئی رازدار بھی تو نہیں

آشفتہ کو کڑے سے بے پناہ محبت تھی اسی محبت سے مجبور ہو کر انھوں نے "مرثیہ کڑا" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جو حسب ذیل ہے۔

"مرثیہ کڑا"

آہ اے خاک وطن کھوئی ہوئی سطوت تیری
اے کڑے کی سرزمین کیا ہو گئی دولت تیری
سو رہی ہے تیری وہ دیرینہ عظمت اب کہاں
جس میں پائی تھی علاءالدین خلجی نے اماں
آج اس گم گشتہ عظمت کا پتہ کچھ بھی نہیں
اب کڑے میں سنگریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں
خفتہ بختی کا اثر ہے ہر رگ و پے میں تیرے
کہہ رہی ہے سرزمیں تیری زبان حال سے

بہ مزارِ ماعزیہاں نے چراغ نے گے!
نے پر پرکانہ سونز د نے سرایہ جلے
آہ اب اُجڑی پڑی ہیں نری سب وہ گھاٹیاں
نقش تھا جن پر کبھی فیضِ خیراتِ حساں
اب نہ وُہ اُونچے محل ہیں اور نہ ہیں ان کے مکیں
نقش پا بھی جانے والوں کا کہیں ملتا نہیں
منہ چھپائے سو رہی ہے اب کہاں عظمت تری
اس سے برگشتہ زمانہ تجھ سے خود قسمت تری
تجھ سے یہ پیرِ زمانہ آج گو برگشتہ ہے
تیری ویرانی دلیلِ عظمتِ گم گشتہ ہے
اُونچے اُونچے تیرے ٹیلے نیچی نیچی گھاٹیاں
کی ہے خود قدرت کے ہاتھوں نے جہاں گلکاریاں
یادگارِ عظمت دیرینہ تیری خاک ہے
تیرا ہر چپہ زمیں کا ہمسرِ افلاک ہے
ان کی رفعت آج بھی باقی ہمالے دل میں ہے
شانِ رفعت آج بھی ٹوٹے ہوئے ساحل میں ہے
گو نہیں کہتی ہیں بستی اپنی حیرانی سے کچھ
تیری عظمت کا پتہ چلتا ہے ویرانی سے کچھ

آج بھی تو خوابگاہِ اولیاء اللہ ہے
ساحلِ دریا پہ اب تک دیکھ لو درگاہ ہے
سرزمیں پر تیرے جب رحمت کی پڑتی ہے پھوار
سبز ہو جاتا ہے سرتاپا تیرا اُجڑا دیار!
پھول سے بھر جاتی ہیں جب گھاٹیوں کی گودیاں
ہوتی ہے خاکِ وطن اک اور جلوہ میں عیاں
یاد آتی ہیں مجھے گذری ہوئی باتیں تیری
رو رہی ہیں تیری بربادی پہ یہ آنکھیں میری
فرطِ غم سے آج میری چشمِ پرنم بند ہے
نالہ کش تیری مصیبت پر ترا فرزند ہے
تیرے گلشن میں چلی اس طرح کچھ بادِ خزاں
ہو گئی پامال سرتا سر امیدِ باغباں
گلشنِ امید کی کوئی کلی کھلتی نہیں!
اس چمن میں کیا صبا اٹھکیلیاں کرتی نہیں
ہاتھ سے بادِ خزاں کے یہ چمن تاراج ہے
تیرا گلشن اب گلوں کے واسطے محتاج ہے
اس چمن میں بلبلوں کے چہچہے باقی نہیں
اب وہ اگلے سے دلوں میں ولولے باقی نہیں

ہاتھ مل کر کہہ رہا ہے باغباں یہ یاس سے
"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"
کہتے ہیں کانٹے الجھ کر دامنِ گلچیں سے یاں
اس چمن میں برگِ گل کا بھی نہیں باقی نشاں
یاس کا عالم جو یاں ہے منحصر ہے دید پر
برق گرتی ہے یہاں ہر خرمنِ امید پر
کہتی ہے رو کر زبانِ حال سے تیری زمیں
"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"
اُٹھتا ہے شورِ قیامت اس کی مشتِ خاک سے
سنگ ریزے کہتے ہیں یہ گردشِ افلاک سے
ہم ہیں دھندلے سے نشاں اک عظمتِ دیرینہ کے
ہم ہیں اوراقِ پریشاں دفترِ پارینہ کے
کہہ رہی ہے آج بھی اُجڑی ہوئی بستی تری
السلام اے البعدما آیندگانِ در فلتی
سچ بتا کیوں تجھ سے برگشتہ زمانہ ہو گیا
کیوں ترا اقبال اک گذرا فسانہ ہو گیا
صفحۂ تاریخ پہ تو اِک نشانِ راہ ہے!
خاک تیری چشمِ عبرت کو زیارت گاہ ہے

گوہر مکنوں تیری اُجڑی ہوئی بستی میں ہیں
تیرے رفعت کے نشاں باقی تیری مٹی میں ہیں
سرزمیں ہے تیری اور گو بختِ نامسعود ہے
خاک تیری مجھ کو لیکن کعبۂ مقصود ہے
تیری ہی گلیوں میں مجھ کو خضر سا رہبر ملا
مجھ کو تیری وادیوں میں آبِ جاں پرور ملا
یہ صدا آتی ہے میرے دل کے ٹوٹے ساز سے
کہتے ہیں تارِ نفس گویا دلی آواز سے
ایک گلشن ہے وطن جس میں کہیں کانٹے نہیں
تا قیامت اس چمن کے پھول کمھلاتے نہیں
الفتِ خاک وطن یوں فطرتِ انساں میں ہے
جس طرح تخلیق گوہر قطرۂ نیساں میں ہے
کہتی ہے صبح وطن شامِ غریباں دیکھئے
اس کا دامن دیکھئے میرا گریباں دیکھئے
کہہ رہی ہے آج بھی مجھ سے میری خاکِ وطن
دخل صد خاقاں سزد یک ریزۂ اجزائے من
خاک سے تیرے دلی اُلفت مجھے ہے آج بھی
آج بھی دل سے دعا ہے خانماں برباد کی

پھول ہوں تب تک چمن میں گوہر شبنم رہے
اور تجھ پر یوں ہی گریاں میری چشم نم رہے

آپ کی وفات کے بعد لکھنؤ سے آپ کا مجموعۂ کلام شیشہ و سنگ کے نام سے طبع ہوا۔

برقؔ

مشکور علی نام برقؔ تخلص۔ آپ کے والد کا نام شیخ تقی الدین عثمانی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے بزرگ کڑا مانک پور کے رہنے والے تھے جو بعد میں نارنول اور وہاں سے جے پور منتقل ہو گئے تھے۔ برقؔ کی ولادت جے پور میں ہی ہوئی۔ مگر ان کو کڑا مانک پور سے تعلق رکھنے پر اب بھی فخر ہے۔ متعدد خطوط کے بعد بھی آپ نے اپنے حالاتِ زندگی اور شجرۂ نسب سے مطلع نہیں کیا۔ بقول احترام الدین احمد شاغل عدیم الفرصتی مانع جواب رہی۔ برقؔ نے ابتدائی تعلیم جے پور ہی میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی سند حاصل کی اور اُردو میں اعلےٰ قابلیت کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ انگریزی میں میٹرک کیا۔ اب راجستھان سیکرٹریٹ میں ملازم ہیں۔ آپ کو حضرت نور احمد تو بر جے پوری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

تیرے جلوؤں کی اس ہنگامہ آرائی سے گھبرا کر
رہِ دیر و حرم جانے کہاں سے چھوڑ دی ہیں نے

ہائے ناکامیٔ قسمت وائے مجبوریٔ عشق
کیا دعا مانگی تھی میں نے کیا اثر ہونے لگا

پاس تھا دل تو کوئی دل کا خریدار نہ تھا
اب نہیں دل تو ہے اک بھیڑ خریدارِ دل کی

بشیر

شیخ بشیر علی علوی شیخ امیر علی علوی کے فرزند ارجمند تھے۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعر اور استاد تھے۔ آپ کا شمار قصبہ کڑا کے روساء میں ہوتا تھا۔ آپ کا شجرہ نسب "تاریخ کڑا مانک پور" کے صفحہ ۱۲۵ پر درج ہے۔ شیخ کمال احمد وغیرہ بھی آپ کے اعزا میں سے تھے۔ آپ کے والد شیخ امیر علی کو علم و ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور فارسی و عربی میں کافی استعداد تھی۔ بشیرؔ نے بھی اردو ادب کا ذوق وراثت میں پایا تھا اور اپنی علمی لیاقت و ذہانت سے اہلِ کڑا سے اپنا لوہا منوا رکھا تھا آپ بہت زود گو شاعر تھے۔ معتبر کتابوں میں جہاں کہیں آپ کا تذکرہ ملتا ہے آپ کو خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ آپ کی قادر الکلامی فصاحت و بلاغت کا آپ کے زمانے میں بہت چرچا تھا۔ اب بھی اہلِ ذوق حضرات کے لئے آپ کا نام غیر مانوس نہیں ہے۔ بشیرؔ کا تذکرہ عبد الغفور

نساخ نے بھی اپنی مستند کتاب "سخن شعراء" میں کیا ہے۔ آپ نے اپنا دیوان مرتب نہیں کیا اور بقول بزرگان کرام لوگردں سے شاعری کی ہے۔ یعنی جو کچھ لکھا کسی ٹوکری میں ڈال دیا۔ بہرکیف مکمل دیوان تو آپ کا لوگوں کو دستیاب نہیں ہو سکا البتہ مولوی نہال احمد علوی کی تصنیف "حدیقہ احمدی" سے یہ بات پائے تحقیق کو پہنچی ہے کہ کمال احمد کمال کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے اور اپنی بیاض بھی انہیں کو دے ڈالی تھی۔ "حدیقہ احمدی" کریم احمد گہر کے حالات پر مشتمل ہے جو مجھے آفتاب احمد گہر برادر نادہ مولوی نہال احمد نے اس کتاب کی تصنیف کے سلسلہ میں عاریتہً پڑھنے کو دی تھی۔

بشیر کی بیاض ناقدری کی وجہ سے تلف ہو گئی۔ اب آپ کا کوئی کلام نہیں ملتا۔ البتہ "سخن شعراء" اور آپ کی لوح مزار سے چند اشعار دستیاب ہو سکے ہیں جو یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ آپ کا مزار قصبہ میں بالائے سڑک پختہ ایک بلند ٹیلے پر املی کے درخت کے نزدیک اب بھی پایا جاتا ہے اور حسرت و یاس کا مرقع ہے جب ایسے ایسے اہل علم و فن کی روپوشی اور گمنامی پر نظر جاتی ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

امام الشعراء کامل الفن استاد وحید الدین وحید نے ابتدا میں آپ سے ہی اصلاح لی تھی اور آپ کو بشیر جیسے استاد کی شاگردی پر ناز بھی تھا وحید نے بشیر کی استادی کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

اب تم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو
فیض بشیرؔ سے یاں کہئے تو کیا نہیں ہے

وحیدؔ کے علاوہ ان کے ایک شاگرد نعیم اللہ نعیم اور منشی کریم احمد گوہرؔ ولد محمد تقی ہیں۔ بشیرؔ کا انتقال انیسویں صدی کے نصف آخر میں بتایا جاتا ہے۔

آپ ایک نہایت خدا ترس۔ رحم دل۔ مہمان نواز اور سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ اطراف واکناف میں آپ کا تذکرہ اب بھی اکثر رہتا ہے۔ روایت ہے کہ بشیرؔ کا کلام ہمہ رنگ اور بوقلمونی کیفیات کا حامل تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کہہ رہی ہے موت ہر دم ہر گھڑی بالائے سر
غافلو آتا ہے وقت ناگہاں بالائے سر

ہم پاؤں اُٹھاتے ہوئے صحرا میں چلیں گے
کانٹوں نے اگر بوجھ اٹھایا کفِ پا کا

آپ کا درج ذیل قطعہ لوح مزار پہ کندہ ہے

اے سالکِ مسلک محمدؐ
افسوس یہ حسرت دِرجا ہے
تربت پہ بشیرؔ کے جو گذرے
تکبیر کی اُس سے التجا ہے

بصیر

آپ کا مولد و مسکن بھی کڑا ہی بتایا جاتا ہے۔ بصیر نامی شاعر کڑا میں اتنے مشہور و معروف نہیں تھے اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ اس زمانے میں بشیر کی شاعری کے چرچے تھے اور اردو شاعری کے ہنگامے میں ایک فارسی گو شاعر کا شہرت اختیار کرنا عجیب سی بات تھی۔ تذکرہ علمائے ہند مصنفہ رحمان علی میں جہاں قطب الدین محمد مدنی۔ مولوی فرید الدین وغیرہ کا تذکرہ ہے وہیں سید معین الدین کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ جن کی تاریخ وفات انہیں بصیر نامی شاعر نے لکھی ہے۔ سید معین الدین کڑا کے جید علما میں سے تھے جن کا دیار و امصار میں بڑا وقار اور بلند مرتبہ تھا۔ صاحب موصوف نے سنہ ۱۳۰۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس قطعۂ تاریخ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ بصیر کا انتقال سنہ ۱۳۰۴ھ کے بعد ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے حالات کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔

قطعۂ تاریخ وفات سید معین الدین کڑوی

معین جہاں کرد چوں انتقال — فلک در غم او گریباں درید
فرشتہ خصال وحید الزماں — چنیں عالمے کس ندید و شنید
بصیر ایں بگو مصرعہ سال فوت — بروحش بود رحمت حق پدید

۱۳۰۴ھ

؎ تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء انجمن ترقی اردو کتب نمبر ۶/۵/۲۶

بے تُک

سید ظہیر حسین نام بے تُک تخلص عرف چُنّو سید نور الحسن محلہ قضیانہ رمحل کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کی ولادت یکم جون ۱۹۱۱ء کو کڑے میں ہی ہوئی۔ یہیں مولوی غلام حسین سے اردو کی تعلیم حاصل کی بعد میں حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں مڈل پاس کیا پھر فتح پور چلے گئے اور گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے ۱۹۲۸ء میں درجہ دہم کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ملازم ہوگئے۔ آپ کا زیادہ تر قیام فتح پور میں ہی رہنے لگا۔ جس کی وجہ سے لوگ غلطی سے آپ کو فتح پوری تصور کرنے لگے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور اب ملیر کراچی میں مقیم اور پرسرام کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں۔

آپ چھریرے جسم کے بڑے نیک مزاج اور متین شخص ہیں شاعری مزاجیہ ہے۔ مزاح میں اپنا جواب نہیں رکھتے فصیح اللہ گرامی[1] سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ فتح پور میں آپ نے سید حامد حسین حامد سے بھی اصلاح سخن لی ہے۔ حامد فتح پور کی عدالت میں مختار تھے۔ اور ان کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا تھا۔

بے تُک کے دادا سید ابو الحسن بڑے عالم شخص تھے۔ اور انہیں تصنیف و تالیف سے بہت شوق تھا مگر ان کے ورثا کے پاس ان کی

---

[1] گرامی کا تذکرہ   صفحہ پر ہے۔

کوئی تصنیف موجود نہیں۔ ابوالحسن نے انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ مرتب کیا تھا جو قلمی شکل میں رہا طبع نہ ہو کر امتداد زمانہ کے ہاتھوں ناپید ہو گیا مہنے نمک کڑ دی ہیں اور اپنے آپ کو کڑوی کہنے پر فخر محسوس کرتے ہیں البتہ کڑا کے مشاعروں کی یادیں انہیں بہت ملول کرتی ہیں اور یہ بذلہ سنج انسان قہقہوں کی بجائے مرثیہ گوئی کی ٹھان لیتا ہے۔ اور کڑا کا غم اسے بہت غمدیدہ و ملدیدہ بنا دیتا ہے

آپ کے کلام میں بڑی نزاکتیں پائی جاتی ہیں۔ پھکڑپن اور سوقیانہ کلام کا کہیں دور تک نام و نشان نہیں ملتا خاص طور سے مزاح اور وہ بھی دیہات میں رہ کر ابتذال کی راہ اختیار نہیں کرتا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

باقی رہا وہ حسن نہ وہ دل کشی رہی
چاند آ گیا گہن میں تو کب چاندنی رہی
کرزن نے مرد و زن کی بنا دی ہے ایک شکل
پہچان کی نہ ظاہری صورت کوئی رہی
مغرب پرست بیوی کی اللہ رے مستیاں
شوہر کا دم نکلتا رہا ناچتی رہی
اب بھوت بن کے پھرتے ہیں کوٹے بتاں میں ہم
مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی۔

دیوانہ ہوا قیس تو رسوا ہوئی لیلےٰ
ہیں کتنے خطرناک یہ مشترکہ مدرسے
بت کعبے سے نکلے تو رہے خانۂ دل میں
لیکن ابھی نکلے نہیں اللہ کے گھر سے
یہ ہجر کے ایام یہ برسات کا موسم
کیا قہر ہے یا رب کوئی برسے کوئی ترسے
یک چشمیٔ معشوق بھی کیا چیز ہے بے شک
ہر ایک کو وہ دیکھتا ہے ایک نظر سے

جو حسیں آیا نظر شیدا ہوا
اک بلائے جاں ہوئی دل کیا ہوا
ہائے یہ فیشن کی چہرہ دستیاں
مرد و زن میں بارہا دھوکا ہوا

لگائیں قفل زباں پہ کریں نظر کو اسیر
مگر خیال کو قیدی بنا نہیں سکتے
ہمیں تو ایسی رہائی سے موت اچھی تھی
وہ آشیاں ہے مگر اُڑ کے جا نہیں سکتے

یہ سبز باغ کسی اور کو دکھا ناصح!
ترے فریب میں بلبل تک تو آ نہیں سکتے

نہ ہم پاگل نہ دیوانے نہ سودائی نہ خفقانی
کسی کی جامہ زیبی ہے ہماری وجہ عریانی
وہ رنگیں ہونٹ بھورا رنگ اچھوتا نہ بڑی آنکھیں
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ اک گڑیا ہے جاپانی
برابر سو نشاں مژگاں کی اس میں رکھتے جاتے ہیں
دلِ عاشق کو شاید وہ سمجھتے ہیں ستے دانی

غرض حُسن سے ہے نہ بدصورتی سے
تعلق ہے دل کو فقط دل لگی سے
یہ واعظ کی داڑھی وہ گیسوئے جاناں
پھنسانے میں دونوں ہیں بس ایک ہی سے
ہمارے بھی دل میں ہیں ارمان لاکھوں
مگر ہائے مجبور ہیں مفلسی سے

میں باپ دادا کی ساری دولت لٹاؤں گا اور اسی کے پیچھے!
یقین یہ ہے کہ جان اپنی گنواؤں گا اور اسی کے پیچھے

کبھی جو اپنی حسین گھڑیا پہ سیر کرنے کو جائے گا وہ
تو میں بھی اپنا پرانا ٹٹو بھگاؤں گا اور اسی کے پیچھے
وہ سنگ مرمر کی اپنی کوٹھی سب سڑک جو بنا رہا ہے
تو میں بھی چھوٹی سی اک جھپڑیا بناؤں گا اور اسی کے پیچھے
خدا نے چاہا تو ہم نشینو یہ دیکھ لینا کہ اپنی دنیا
بناؤں گا اور اُسی کے ہاتھوں مٹاؤں گا اور اسی کے پیچھے

جو کہنا نہ مانے جو بس میں نہ آئے
وہ کم بخت دل ایسی تیسی میں جائے
یہ ہے اس زمانے میں شوہر کی عزت
نہ بچے کھلائے تو روٹی نہ پائے
عجب کچھ زمانے کی حالت ہے بے ڈھنگ
جسے منہ لگاؤ وہی پھاڑ کھائے

وہ مجھ سے کہتے ہیں جب ہٹا کر کہ میرے جور و جفا سے ڈریئے
تو جی میں آتا ہے میں بھی کہہ دوں ذرا مرے کفش پا سے ڈریئے
بلائے بد ہیں یہ حسن والے نہ بھولی صورت پہ ان کی مریئے !
چھپے بھی رہتے ہیں ان میں کانٹے گلوں کی رنگیں قبا سے ڈریئے

بلائیں انساں کے واسطے ہیں تو ان سے ڈرنے سے کیا نتیجہ
تو میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ خوب صورت بلا سے ڈریئے

بہ خالِ مشکیں یہ زلفِ پُرخم وبا کے دانے دغا کے پھندے
جو عقل دی ہے خدا نے بے تُک تو ایسی کالی بلا سے ڈریئے

اس کو ذرا سا تاؤ دلانے کی دیر ہے
یعنی بس اک ٹیپ جمانے کی دیر ہے

رنگ آ چلا ہے نقشِ دفا میں مگر ابھی
آنکھوں سے دل کا خون بہانے کی دیر ہے

مقتل میں تیغ و مجرم و عساں و گورکن
سب آ چکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے

تکمیلِ آشیاں میں ہے خامی بس اس قدر
یعنی کہ بن چکا ہے جلانے کی دیر ہے

اُس ہاتھ میں بیزار ہے معلوم نہیں کیوں
اِس چاند میں جھنکار ہے معلوم نہیں کیوں

کیا شیخ و برہمن میں ہے کچھ رشتۂ پنہاں
تسبیح میں زنار ہے معلوم نہیں کیوں

پھولوں کی ہوئی جیت ملے اس کے گلے سے
سب کہتے ہیں یہ ہار ہے معلوم نہیں کیوں
سنتے ہیں کہ ہے نانِ جویں شیخ کی خوراک
پھر اتنا جو تن بار ہے معلوم نہیں کیوں
بت ٹک سے جو جاتا انہیں کیا ایسی خطا کی
ہر سمت سے پھٹکار ہے معلوم نہیں کیوں

اتنا تو ربط و ضبط ہو تیر میں اور شکار میں
دل میں نگاہِ یار ہو دل ہو نگاہِ یار میں
پہلی ہی نیند تھی مری آئے جو منکر و نکیر
مجھ کو یہی گماں ہوا چور گھسے مزار میں
حضرتِ دل کو خیر سے ڈھونڈھ ہی لائے آج ہم
اُلٹے لٹک رہے تھے آپ حلقۂ زلفِ یار میں

گرج رہے ہیں فضا پہ بادل فلک کو چکر سے آ رہے ہیں
زمیں پہ ہیں زلزلے مسلسل وہ آج کچھ گنگنا رہے ہیں
رہی جو کچھ رسی ... گرانی تو ایک دن یہ بھی دیکھ لینا
کہ سات ... کے رشتہ تڑا کے کنویں پہ بیٹھے مہا ... ہیں

سُنا ہے ہم نے کہ شیخ جی بھی گئے تھے اک دن شاعرے میں
ملی وہاں ان کو وہ داد ایسی کہ بیٹھے اب تک کھجا رہے ہیں

بتاؤں کیا تجھے ہمدم کہ کیا کیا کر کے چھوڑوں گا
اگر زندہ رہوں تو ان کو نکٹا کر کے چھوڑوں گا

یہ ٹھانی ہے کہ ان سے عقد کر کے زہر کھا لوں گا
بلا سے جان جائے ان کو بیوہ کر کے چھوڑوں گا

حیا کو ان کی یہ دُھن ہے نہ دیکھے بال تک کوئی
مگر فیشن کو یہ ضد ہے کہ ننگا کر کے چھوڑوں گا

لئے جاتا ہوں کچھ زہریلی گیسیں اپنی آہوں میں
رقیبِ روسیاہ کو آج اندھا کر کے چھوڑوں گا

وہ جس طرف تھے ہم بھی ادھر دیکھتے رہے
لیکن بقدرِ ظرفِ نظر دیکھتے رہے

لاکھوں ہوئے جو قسمتِ اغیار میں تو کیا
اپنے نصیب میں تو صفر دیکھتے رہے

بکھرا کے ان کے عارضِ روشن پہ زلف کو
ہم اتصالِ شام و سحر دیکھتے رہے

اب تک تو کیمیائے محبت نہ بن سکی
اک آنچ کی ہمیشہ کسر دیکھتے رہے

دشمن بھی خوش ہے ان کی ٹپنکی نگاہ سے
اور ہم بھی شاد ہیں کہ ادھر دیکھتے رہے

بے تک کو بھی ریسرچ کا شاید ہوا ہے شوق
کل خوردبیں سے ان کی کمر دیکھتے رہے

بیدار

سید بیدار علی نام بیدار تخلص۔ آپ سید حامد علی نثار کے فرزند ارجمند تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہنا ورثہ میں پایا تھا۔ قیام الدین قائم کے شاگرد تھے ایک شعر فارسی اور چند اشعار اردو مل سکے ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مدتے شد بفراق آں شوق
خواب گردید ز بیدار جدا

کیا کہیں کس سے خفا ہیں اور کس سے خوش ہیں وہ
ہر کسی سے ہر گھڑی ان کے نئے انداز ہیں

ہم تو ان کو بھول بھی جائیں مگر
پھول کر ان کو سلگے گا ہاتھ کیا

بینظیر

سید صدیق احمد۔ محمد بینظیر شاہ وارثی قادری گردیزی آپ کا نام نامی "قاموس المشاہیر" مصنفہ نظامی بدایونی اور مثنوی الکلام میں سید محمد بینظیر تحریر ہے مگر اصلی نام سید محمد صدیق احمد تھا۔ کلام بینظیر[1] جو بینظیر شاہ کے فرزند کی فرمائش اور اعانت پر ترتیب دی گئی ہے اس کا شاہد عادل ہے۔

آپ کے والد شاہ احسان علی قادری حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے خلیفہ تھے۔ شاہ احسان علی کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ملتا ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۲۸۹ھ / ۱۸۶۳ء ہے ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد شاہ احسان علی سے حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے مسلم شریف کا درس لیا۔ اور سلسلۂ قادریہ مجددیہ احمدیہ کی اجازت حاصل کی۔ سلسلہ قادریہ رزاقیہ کی سند و اجازت حضرت سید شاہ غلام جیلانی صاحب سجادہ نشین بانسہ شریف سے لی۔ جب سید وارث علی شاہ مانک پور تشریف لائے تو انہوں نے آپ کو اپنی غلامی و فرزندی میں لے لیا۔

---

[1] کلام بینظیر۔ مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی مطبوعہ حیدرآباد دکن

شعر و شاعری کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا۔ اس وقت کے مشہور شاعر اور استاد وحیدالدین وحید معروف بہ وحید میاں کڑدی سے اصلاح لینے لگے۔ اپنی مثنوی میں اس کا اعتراف بھی ان الفاظ میں کیا ہے۔

انہیں کا ہے یہ فیض اسے ذوالمنن
دیا تو نے ایسا جو استاد فن
لقب جس نے رحمت سے پایا وحید
نہ پھر کیوں ہو عالم میں یکتا وحید
شاہ محمد وہ قطب زمن
وحید دیگانہ خدائے سخن

غلطی سے مشہور ہے کہ غزل میں وحید اور مثنوی میں امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ امیر مینائی سے اصلاح لینے کا ثبوت کہیں سے بھی فراہم نہیں ہوتا۔ اگر مثنوی میں انہوں نے امیر سے اصلاح لی ہوتی تو مثنوی میں وہ اپنے استاد غزل کا تذکرہ نہ کرتے بلکہ استاد مثنوی کا تذکرہ کرتے کلام بلنظیر میں بھی امیر کی شاگردی سے انحراف کیا گیا اور مرتب کتاب کے نظریہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وحید اور صرف وحید کے ہی شاگرد تھے۔

عربی و فارسی کے علاوہ مولانا نے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اور اس غیر زبان پر اتنا عبور حاصل کیا کہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں انگریزی میں قصیدہ لکھا۔ جنگ بلقان کے موقع پر اردو میں ایک مسدس لکھا جس کا انگریزی میں اسی انداز میں ترجمہ کیا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے
نہیں کی دوستی نے آپ کو طب کی طرف راغب کیا۔اس طرح سے آپ
ب میں بھی ماہر ہو گئے۔ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ اکثر اوقات ایک
ں ایک کلام پاک ختم کرتے تھے۔ چوبیس پچیس سال کے سن میں ۱۶۵
پر مشتمل مثنوی الکلام۔ جواہر بینظیر۔ اور کتاب مبین تصنیف کی اور
دیوان بھی مکمل کر لیا۔ دیوان کہیں سفر میں گم ہو گیا۔ ۱۹۰۰ء میں آپ
ار حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کے سیکڑوں آدمی مرید
، ان کے مخصوص احباب میں سرکشن پرشاد شاد۔ عبدالحمید تر۔ پنڈت
محمد سرشار۔ مولوی عبدالحق۔ مولانا ظفر علی خاں۔ نواب اکبر یار جنگ۔ عزیز
سید علی حیدر حیدر یار جنگ طباطبائی جیسی مقتدر شخصیتیں تھیں۔
نفی حنفی مذہب تھے۔ تعصب و فرقہ واری سے نہایت نفرت کرتے
۱۹۳۲ء میں مولانا کا قیام گیا میں سید حسن امام وارثی کے یہاں تھا یا
ہے۔ آخر عمر میں آپ کا ایک پھیپھڑا کاٹ کر نکال دیا گیا۔ جس سے
یک سمت کج ہو گیا تھا۔ جمعہ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۲ ستمبر
ء کو علی الصباح یہ مشہور شاعر بزرگ زمانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش
محمد اکبر الدین صدیقی لکچرار جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے آپ کے
دے حامد بینظیر شاہ کی درخواست پر آپ کا کلام مرتب کر کے
ابراہیمیہ حیدر آباد دکن سے شائع کرا دیا جس میں آپ کا تفصیلی حال
ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

پہنچا دے اے صبا تو اس کو سلام میرا
ہے جس کی بوئے خوش سے خوشبو مشام میرا

زندہ ہوا ہوں مرکر اُس حسن جانفزا پہ
لوح ازل پہ لکھا تھا یوں دوام میرا

بیٹھا ہوں باغ دل میں امید کی روش پہ
شاید ادھر سے گذرے وہ خوش خرام میرا
کوئی پڑھے چرا کر اے بینظیر تب بھی
میری زباں میری میرا کلام میرا
ہیں سہل ممتنع ہیں مشکل زمین مضامیں
گو بینظیر سادہ ہے سب کلام میرا

وہ جو ساقی بن کے رات اپنا شریک جام تھا
چودھویں کا چاند تھا اُس کا بھلا سا نام تھا
تم مرے مرنے سے خوش ہوتے تو مرجاتا ضرور
کام آجاتا تمہارے یہ بھی کوئی کام تھا

یہ چھا رہا ہے چمن پر غبار صرصر کا
کہ سامنے ہے مگر آشیاں نہیں ملتا

تری شامِ گیسو کی خوشبو کہاں
گلوں تک نسیمِ سحر رہ گئی
اُٹھے ہو کے مایوس ہر در سے ہم
بس اب اک تری رہ گذر رہ گئی

دمِ آخر یہ کس کا حسن بے پردہ نظر آیا
یکایک کر گئے عالم سے پردہ دیکھنے والے
نگاہِ شوق کر لیتی ہے آخر بے حجاب ان کو
اشاروں میں اُٹھا دیتے ہیں پردہ دیکھنے والے

مر مٹے خاک ہوئے عشق میں برباد ہوئے
ہائے اس پر بھی انہیں ہم نہ کبھی یاد ہوئے

زلف کچھ رُخسار سے سرکی سرک کر رہ گئی
اس گھٹا میں برق سی چمکی چمک کر رہ گئی

کون میرے گھر کی جانب آتے آتے رُک گیا
داسنی آنکھ اپنی کیوں پھڑکی پھڑک کر رہ گئی

یوں تو ان کی ہر ادا ہے دلفریب
پر وہ کیا کچھ تھی جو دل کو بھا گئی

صدقے ترے کرم کے مری بات رہ گئی
آتے ہی آتے لب پہ مناجات رہ گئی
ہم سامنے نہ ہوں تو ہمارا کسے خیال
منہ دیکھی آج کل کی ملاقات رہ گئی

ترا نام لیتا ہوں میں دل میں لیکن
مرے منہ میں شیریں زباں ہو رہی ہے
کوئی بات تو ہے کہ سارے جہاں میں
زباں زد مری داستاں ہو رہی ہے

چہرۂ پُر عتاب کے قربان
کیسی رنگت شہاب کی سی ہے

سب کچھ آنکھوں سے دیکھتا ہوں مگر
یہ حقیقت بھی خواب کی سی ہے
مانع دید ہے فروغِ جمال
یہ بھی صورت حجاب کی سی ہے

مجھ کو ملا کے خاک میں اپنا وہ مان لیں
اتنی ہی بس تلافیٔ مافات چاہیئے

ان کے در پہ جان دی تو عرش سے آئی صدا
زندگی کہتے ہیں اس کو یہ ہے شانِ زندگی
جان آنکھوں میں رُکی ہے اب تو آ کر دیکھ لو
پھر کہاں ہم تم کہاں پھر یہ زمانِ زندگی

ستم کرتے مل کر تو پھر لطف تھا
جدائی میں کیا آزمایا مجھے!

رخصت کے وقت کیا کیا ہیں دلفگار دیا
وہ بار بار لپٹے ہیں بار بار رو دیا

فلک تجھ سے دیکھا گیا ہائے کیوں کر
کسی کو گلے سے لگانا کسی کا !

لحد پر ہماری وہی جب نہ آئے
کوئی آیا آیا نہ آیا نہ آیا !!

ہائے یہ سبزہ یہ متوالی گھٹا
جھومتی آتی ہے کیا کالی گھٹا

کیوں ان کی گلی میں قیام کیا
بدنام ہوئے بدنام کیا

وہ آئے نہ ارماں نکلنے دیا
ذرا بھی نہ مجھ کو سنبھلنے دیا

پکڑتی ہے پاؤں کو میرے زمیں
فلک اس کی رہگذر تو نہیں

نہ آئے وہ بہاری زندگی میں !
یہ حسرت لے چلے ہم جی کی جی میں !

قیامت تک ترا نازوں کو آنا یاد آئے گا
جلے گا میرے مدفن پہ چراغِ آرزو برسوں

الٰہی کس شہید ناز کا گردوں پہ ماتم ہے
سنا ہے کوچۂ قاتل میں برسا ہے لہو برسوں

وہ جو ایک دل تھا کبھی یہاں ہوا نذرِ غمزۂ جاں ستاں
جسے دل سمجھتے ہو دل کہاں یہ تو حسرتوں کا مزار ہے

جو امید عفو پہ اے خدا ہوئے جرم مجھ سے تو کیا ہوا
نہ ترے کرم کا حساب ہے نہ مری خطا کا شمار ہے
یہی ابر ہو مئے ناب ہو یہی بزم چنگ و رباب ہو
یہی بے نظیر شباب ہو تو بہار فصلِ بہار ہے

دلِ زخم خوردہ فگار ہے نہ سکون ہے نہ قرار ہے
مری ایک خاطرِ زار ہے کہ ہزار غم کا شکار ہے

مری قبر کا نہ پتا چلا تو صبا نے چل کے بتا دیا
کہ کبھی کسی کا مزار تھا یہی سامنے جو غبار ہے

ادھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
دعا کی شکایت مگر رہ گئی
ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی
کبھی کہہ دیا تھا کہ مرتا ہوں میں
شکایت انہیں عمر بھر رہ گئی

تری شکل ہر شکل میں ہو بہو ہے
جو تو ہے وہ میں ہوں جو میں ہوں تو ہے

جو ہزار بار حاصل مجھے وصلِ یار ہوتا!
یہی انتظار آخر یہی انتظار ہوتا
میں ضرور صبر کرتا ترے وعدۂ وفا پر
اگر اپنی زندگی کا کوئی اعتبار ہوتا

دل نہ دینے پہ ہوئے ناشاد کیا
خیر لو تم بھی کرو گے یاد کیا
یاد کرنے والے تو بھولے تجھے
بھولنے والے کریں گے یاد کیا

کیا کوئی اور قیامت بھی ہے اس سے بڑھ کر
دوست کا دوست سے دنیا میں جدا ہو جانا

ثاقب

سید ابو محمد نام ثاقب تخلص کرتے ہیں۔ آپ کا اصلی وطن کڑا تی ہے مگر چونکہ آپ کی ولادت کانپور میں سنہ ۱۹۰۴ء میں ہوئی اور زیادہ تر وہیں قیام رہتا ہے اس وجہ سے کانپوری مشہور ہو گئے ہیں۔ آپ کے خاندان کے افراد عربی میں کافی استطاعت رکھتے تھے۔ اس لئے اوائل عمری سے آپ کو السنہ شرقیہ میں کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ دادیہال کی طرف سے آپ سادات بارہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید حسین علی اور سید محمد عبداللہ کا تذکرہ ہندوستان کی تمام تاریخوں میں پایا جاتا ہے اورنگ زیب رح آپ کے پردادا حضرت مولانا سید شاہ رضا علی کے تقدس کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ نانہال کی طرف سے آپ سادات جمل الیل سے

تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے پرنانا حضرت مولانا حاجی سید شاہ غلام رسول صاحب رسول نما اپنے زمانے کے شیخ المشائخ تھے جن کا مزار کانپور میں آج بھی زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔ آپ کے خطاب "رسول نما" کے متعلق روایت ہے کہ سید صاحب جس پر توجہ کرتے تھے عالم بیداری میں زیارت حضور کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ محلہ طلاق محل کانپور کے چوراہے کے قریب آپ کا مزار ہے جہاں ثاقب کے بڑے بھائی سید محمد طاہر سجادہ نشین ہیں آپ کے والد سید شاہ محمد اکبر مرحوم نے تقریباً ۵۰ سال تک سجادہ نشینی کی مگر کبھی خانقاہ سے باہر تشریف نہیں لے گئے۔ آپ کا شجرہ نسب تاریخ کڑا مانک پور کے صفحہ ۱۴۹ پر درج ہے۔

ثاقب نے عربی تعلیم اپنے والد صاحب سے ہی حاصل کی۔ صرف ونحو کی کتابیں ختم کر لینے کے بعد مدرسۃ الالٰہیات میں داخل ہو گئے جہاں آپ نے مولانا حافظ عبد الحلیم صدیقی، مولانا محمد حسین نحوی اور علامہ آزاد سبحانی سے اکتساب علم و ادب کیا۔ بعد میں آپ نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی ادلہ کافی لیاقت حاصل کر لی۔ "متاعِ درد" میں جو انتظامی پریس کانپور سے ۱۳۴۵ھ میں طبع ہوئی تھی۔ آپ نے اپنی شاعری کی ابتدا اور اس کے اسباب یوں رقم کئے ہیں۔

"مجھے اپنے عزیز بھائی سید علی صاحب سے برادرانہ محبت ہے ۱۹۱۹ء میں جب میں حیدرآباد گیا تو موصوف وہیں موجود تھے لیکن میری کانپور کی روانگی سے دو تین دن قبل کسی ضرورت سے وہ حیدرآباد کے کسی قریبی

گاؤں میں چلے گئے۔ وعدہ یہ تھا کہ روانگی کے دن یا اس سے پہلے مجھے رخصت کرنے کے لئے وہ ضرور آجائیں گے مگر اتفاق کہ وہ اس عرصے میں واپس نہ آسکے اور میں بحسرت کانپور چلا گیا۔ بس یہی حسرت میرے جذبات کی محرک بن گئی اور ان احساسات نے خودبخود دل میں پیدا ہو رہے تھے نظم کی صورت اختیار کر لی۔"

آپ کو مولانا احسن اللہ احسن سے شرف تلمذ حاصل رہا جو اعظم گڈھ کے ایک دیہات ... کے رہنے والے تھے۔ آپ بڑے صاحب حال اور صاحب کیف شاعر ہیں۔ ہر وقت شعر و شاعری میں محو اور اپنے خیال میں مگن رہتے ہیں۔ بڑے زلیق النلب اور زود دائرہ شخصیت کے مالک ہیں اچھے شعر پہ دل کھول کر داد دیتے ہیں مشاعروں کی شرکت سے گریز کرتے ہیں میر، غالب اور اقبال کے مداحین میں ہیں۔ اگر کوئی اقبال کی برائی کر دے تو اس سے لڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ثاقب کا شمار یوپی کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ دور حاضر میں آپ کا دم غنیمت ہے۔ متاع درد کے بعد آپ کا دوسرا مجموعہ روح جاوداں پاکستان سے شائع ہوا ہے اس کو اُردو اکیڈمی سندھ نے شائع کیا ہے آپ کے انتخاب سودا کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن ہندوستان میں شائع ہوئے اور کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔

آپ کے فرزندوں میں ابوالخیر کشفی کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کے پروفیسر اور نامور ادیب و شاعر ہیں جن کی متعدد کتابیں تنقید اور قواعد

پر شائع ہو چکی ہیں۔ ثاقبؔ نے نظم، غزل، سہرا، قصیدہ سبھی صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کی نظموں میں "محبت" "عشق" "شمع" "سکوتِ شام" "چاند گرہن" "فوارہ" "بیوہ اور برسات" "گریۂ حسن" "خاکِ وطن" "محوِ دعا" "آبشار" قابلِ ستائش ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

"متاعِ درد"

کس کس انداز سے دل عشق میں برباد رہا
سب فسانوں میں فسانہ یہ مجھے یاد رہا

لے اسے دلِ پُر حسرت کچھ اور تمنا کر
دیکھا کہ گری بجلی جب اس نے ادھر دیکھا
کس کام کی ہتیاری اچھی تھی وہ بے ہوشی
جب آنکھ کھلی ان کی آغوش میں سر دیکھا

وطن کی یاد تجھ کو یاد کر کے ہم بہت روئے
کہ تجھ سے دور تھے اور شامِ غربت تھی بیاباں تھا

تو بتا ذوقِ تماشائے طلسمِ ہستی
کون لایا تھا مجھے عالمِ امکاں کی طرف

ہم نفس بس مری رُوداد تباہی یہ ہے
رحم آیا انہیں جب کر چکے برباد مجھے

کس قدر وہ بات بھاری تھی ترے بیمار پر
چارہ گر اُٹھ اُٹھ کے سوئے آسماں دیکھا کئے

ہر سمت مجھے اُس کا جلوہ نظر آتا ہے
ہاں بزمِ تصور بھی کیا بزمِ تماشا ہے
سوزِ غمِ فرقت سے یہ حال ہمارا ہے
جو سانس ہے شعلہ ہے جو اشک ہے چھالا ہے

ثاقبؔ کسی کی یاد سے رگ رگ میں ہے خلش
پنہاں ہیں دل میں خارِ بیابانِ آرزو

دل خوگرِ تپش نہ ہو دردآشنا نہ ہو
اب مدعا یہ ہے کہ کوئی مدعا نہ ہو

چلو اچھا ہوا دل مٹ گیا جھگڑا چکا ثاقبؔ
کہ اب باقی نہیں اندیشۂ سود و زیاں مجھ کو

مٹنا کسی کے غم میں دلیلِ حیات ہے
کتنا ہے دلفریب یہ عنوان آرزو

شمع نے بزم میں کیا جانئے کیا اس سے کہا
کہ سرِ شام ہی نیند آ گئی پروانے کو

"روحِ جاوداں"

کون کہتا ہے اسیرانِ قفس چھوٹ گئے؟
اب بھی راتوں کو وہی شورِ فغاں ہے کہ جو تھا

مہر و خورشید ترے بام سے آگے نہ گئے
تجھ کو پا کر سحر و شام سے آگے نہ گئے

اے بادہ کش اتنا اعجاز تو پیدا کر
خود عکسِ رُخِ رنگیں پیمانے تک آ جائے
جس نے تری محفل کی دیکھی ہے بہار اکثر
وہ رات کبھی میرے کاشانے تک آ جائے

اس آس میں آیا ہے صحرا کی طرف ثاقب
شاید کہ ہوائے گل پھیلنے تک آ جائے

اس عشق کا انجام میں کچھ سوچ رہا ہوں
ہاں لے ہوسِ خام میں کچھ سوچ رہا ہوں
خالی ہوئے سب جام نہیں کوئی بھی میکش
اے دردِ تہہ جام میں کچھ سوچ رہا ہوں
جی بھر کے تجھے آج میں دیکھوں کہ نہ دیکھوں
اے حسنِ لبِ بام میں کچھ سوچ رہا ہوں
اپنے دلِ بے تاب سے میں خود ہوں پریشاں
کیا دوں انھیں الزام میں کچھ سوچ رہا ہوں

"کلی"

جلوۂ صد نشاط ہے دائرۂ قضائے شب
خندہ زنی کی ہے تلاش تجھ کو پسِ ردائے شب
رنگِ سکوتِ خامشی غازۂ نوبہار ہے
دیدۂ نیم خواب کو صبح کا انتظار ہے
چاند کی ہے مجال کیا پردۂ رُخ اُٹھا سکے
برگ پہ ہو کرن کرن پھر بھی نہ تجھ کو پا سکے
زیرِ نقاب ہیں ابھی تیری شگوفہ کاریاں
لوٹ رہی ہیں زیرِ شاخ برق کی شعلہ باریاں
لمحۂ پُرسکوں میں ہے دور تیری حیات کا
کہتے ہیں جس کو پنکھڑی پردہ ہے کائنات کا
صبح کا راگ کیا سنا خندہ اُچٹ کے رہ گئی
برگ سمٹ کے رہ گئے نرم لپٹ کے رہ گئی
مرغِ سحر کی لوریاں بار ہیں گوش کے لئے
بادِ صبا کی بے خودی قہر ہے جوش کے لئے
شاخ کی سبز پتیاں تیری بلائیں لے چلیں
کونپلیں پھوٹ پھوٹ کر تجھ کو دعائیں لے چلیں
دیدۂ پُرحجاب پر صدقے ہے پاک دامنی
چھو نہ سکی ترا بدن صبح ازل کی روشنی

عطرِ عروس میں سب ہیں نور کی جلوہ ریزیاں
آپ بھرے ادس میں یا ہے پہ شرابِ ارغواں
عرصۂ شفتگیٔ زندہ کن بہار ہے
کیا تری منقشوں میں بند صحت خوشگوار ہے

"گریۂ حسن"

تو حسنِ مجسم ہے اے پیکرِ رعنائی
زیبا یہ نہیں تجھ کو اندازِ شکیبائی!
کیوں گریۂ پیہم ہے، کیوں سوگ کا عالم ہے
کیوں بال پریشاں ہیں، کیوں آہ یہ ماتم ہے
آنکھیں تری اے ظالم، لبریز ہیں آنسو سے
پیدا ہے پریشانی، اُلجھے ہوئے گیسو سے
کیوں سرد یہ آہیں ہیں کیوں زرد یہ چہرہ ہے
اے پیکرِ رعنائی کیا تیری تمنا ہے
بے چین ہے ہر لحظہ، بیتاب ہے ہر ساعت
ڈرتا ہوں نہ آجائے دنیا پہ کوئی آفت
آرام سے بے پروا، راحت سے ہے بیگانہ
شاید ترے سینے میں دل ہے کوئی دیوانہ

ہاں یاد مجھے اب تک وہ تیرا تبسم ہے
یعنی کہ خردمندی انساں کی جہاں گم ہے
ہونٹوں کی تیرے جنبش تھی محشر رعنائی
تجھ کو بھی خبر کچھ ہے اے غم کے تمنائی
یہ جوشِ جوانی کا، اندازہ یہ ماتم کا
برہم نہ کہیں کر دے شیرازہ دو عالم کا
تو جانِ تمنا ہے اے عشق کی دنیا میں
مضطر ہیں بگولے بھی تیرے لئے صحرا میں
تو حسن کے جلووں میں رنگینئ فطرت ہے
تو عشق کی منزل میں اِک شمع ہدایت ہے
اس عہدِ جوانی میں اندازہ یہ ماتم کا
یہ ذوقِ غم اندوزی عالم یہ شبِ غم کا
ثاقبؔ کی وفاؤں کو اب یاد نہ کر ظالم
اس حسن و ملاحت کو برباد نہ کر ظالم

جلال

جلال الدین حسین نام جلالؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ شاہ کمال حسین کمالی کے برادر خورد تھے۔ ابتدا میں آپ کا قیام کڑے میں تھا

میں اپنے بھائی کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لے گئے۔ آپ کا ذکر مجموعہ نغز اور عمدۂ منتخبہ مترجمہ نثار احمد فاروقی میں پایا جاتا ہے۔ موخر الذکر نے آپ کو دہلی کا ساکن لکھا ہے جو غلط ہے۔ آپ کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہو سکی۔ اس لئے صرف نمونۂ کلام پیش کر کے خموشی اختیار کی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ اپنے بھائی کی طرح آپ کو بھی دہن سے تجراشعث تھا۔ اور درویشانہ زندگی گذارتے تھے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

جی میں آتا ہے گریباں پھاڑ کر
دشت کو اُٹھ چلئے دامن جھاڑ کر

جوآد

سیّد اسرار علی نام جوآد تخلص۔ اپنے والد بزرگوار سیّد بیدار علی بیدار کے چشم و چراغ تھے۔ جوآد نے زیادہ تر علمی استطاعت اپنے ادبی ماحول سے حاصل کی۔ اور شاعری میں نواب کلب حسین خاں نادر بنارسی سے فیض پایا۔ اس خاندان سے کڑا کی سرزمین پر بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ جن میں میر پرورش علی سخیؔ کا نام نامی کڑا کے شعراء کی صفِ اوّل میں آتا ہے۔ جوآد کی صحیح تاریخ وفات نہیں معلوم ہو سکی اور نہ تاریخ ولادت کا علم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اواخر میں آپ کا انتقال کڑا ہی میں

ہوا۔ آپ کے دو شعر رفیع نقوی نے بھی مجھے لکھ کر اسے بھیجے ہیں جو نمونہ کلام میں درج ہیں۔

شمع کافوری جلائیں اہلِ دولت اپنے گھر
روزنِ دیوار مفلس کا چراغ خانہ ہے

متحمل[1] نہیں اب گوشۂ تنہائی کا
ہے تو صد ترے اعجاز مسیحائی کا
دیکھا کرتا ہوں تجھے دیدۂ باطن سے صنم
چشم ظاہر سے جو موقع نہیں بینائی کا
اُلفت زلف سے سمٹے گا صنم ہاتھ اگر
پاؤں پھیلائے گی وحشت ترے سودائی کا
وصل کے وعدہ پر آئے وہ مرے پاس اگر
تھا نہ تنہا آئینہ تھا شغل تھا زیبائی کا
فیض نادر کا رہا یونہی جو آگے بھی جو آر
شہرہ ہو جائے گا اک دن تری گویائی کا

---

[1] دیوان عزوب مصنفہ نادر صفحہ ۱۲۲

حامد

سید محمد حامد نام۔ حامدؔ تخلص۔ نقوی نسب ہیں۔ آپ کا شجرۂ خاندانی تاریخ کڑا مانک پور کے صفحہ ۱۲۰ پر درج ہے۔ آپ مشہور محقق مولوی محمد متین وکیل کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۹۰۲ء میں بتائی جاتی ہے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کر کے یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو الہ آباد ہائی کورٹ میں ملازم ہوئے اور ڈگری ڈیپارٹمنٹ میں بہ عہدۂ سپرنٹنڈنٹ رہے۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو آپ کو پنشن مل گئی۔ اب الہ آباد میں قیام ہے تاہم محرم اور رمضان میں آپ کا قیام قصبہ کڑا ہی میں رہتا ہے۔ آپ ایک اچھے شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔ شاعری میں آپ کو اپنے والد متینؔ ہی سے شرف تلمذ حاصل ہے ایک زمانہ میں الہ آباد سے ایک ادبی ماہنامہ "انیس" شائع ہوتا تھا اس کی بزم ادارت میں آپ بھی تھے۔ آپ نے فارسی، عربی دونوں زبانیں خاطر خواہ حاصل کی ہیں۔ مگر فارسی میں آپ کو زیادہ مہارت حاصل ہے۔ بی۔اے اور ایم اے کے طلباء آپ سے فارسی پڑھنے آتے ہیں اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ آپ کو فارسی سے بے پناہ دلچسپی ہے۔

نمونۂ کلام آپ کا یہ ہے۔

بگڑی ہی تھی مجھ سے عالم گلشن کی یہ ہوا
جو گل اٹھایا ہاتھ میں وہ خار ہو گیا

نہ منت کش ہوا ہیں غیر جنسوں کے مداوا کا
نہیں احسان بخیہ بھی مرے زخموں کے دامن پر

مجھے سوئے قفس جب لے چلا صیاد گلشن سے
گلوں سے خار بہتر تھے جو اُلجھے دامن کے دامن سے

قفس کو لا کے اے صیاد زیر آشیاں رکھ دے
بنے گا مرہم زخم جگر سایہ نشیمن کا

حسرت

سید ذکر اللہ کاظمی نام حسرت تخلص کرتے تھے آپ محمد حسام کے فرزند دلبند تھے۔ محلہ قضیانہ آپ کی جائے پیدائش ہے۔ نسباً کاظمی ہیں آپ بڑے نیک و شریف النفس انسان گذرے ہیں شعر و شاعری سے آپ کو بچپن ہی سے تعلق تھا۔ آپ کا سلسلہ تلمذ امیر مینائی سے ملتا ہے۔ کیونکہ آپ نے جلیل مانک پوری سے اصلاح لی تھی اور ان کی شاعری اور استادی کے بڑے مداح تھے استاد کے خلاف کبھی کوئی بات سننی گوارا نہیں کرتے تھے۔ آپ نے اپنی حیات میں کئی شادیاں کی تھیں۔ ایک بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو جواد الحسن شبو حسن کے نکاح میں آئیں انہیں کے پاس

آپ کی بیاض موجود ہی۔ جس سے منتخب کر کے یہاں اشعار دیئے جا رہے ہیں۔

آپ مولانا شاہ ظہیرالدین احمد کڑوی برادر بزرگ مولانا شاہ رکن الدین احمد رئیس کڑا کے مرید خاص تھے اور ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ اپنے ایک شعر میں اس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں

ظہیر ایسا جہاں میں کب ملے گا شیخ اے حسرت
جلا کر مشعل خورشید ڈھونڈے آسماں برسوں

آپ حیدرآباد دکن میں ملازمت کرتے تھے اور آخر عمر میں پنشن لے لی تھی۔ مگر پھر بھی زیادہ تر قیام حیدرآباد دکن میں ہی رہتا تھا عبدالشکور شیدا نے ان کا تذکرہ اپنی کتاب "بیاض سخن" میں کیا ہے اور چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ آپ کو کڑا سے بے پناہ محبت تھی جب کوئی حیدرآباد جاتا تو کڑا کے ہر فرد بشر کو پوچھتے، کبھی محلوں کی حالت، مسجدوں کی اذان، مندروں کے گھنٹوں کا تذکرہ کرتے تو وہاں کے ٹیلے، قبرستان مقبرے اور دریائے گنگا کے تذکرے سے محظوظ ہوتے۔ کڑا کا ذکر سن کو اکثر اوقات رونے لگتے۔ اس کیفیت کا اظہار اپنے ایک شعر میں بھی کیا ہے جو بیاض کے سر ورق پہ ہی تحریر ہے

نیا اک داغ فرقت دل پہ پڑ جاتا ہے اے حسرت
کڑا جس وقت یاد آتا ہے وہ اپنا وطن مجھ کو

اپنی اہلیہ سے بہت محبت رکھتے تھے اتفاق سے ان کا انتقال عالم شباب

میں ہو گیا ان کی وفات حسرت آیات پر قطعۂ تاریخ لکھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

گفت حسرت سال با آہ و فغاں
سوئے جنت رفت محبوب جواں

۱۳۲۷ ھ

حسرت کی زندگی بڑی عسرت و تنگ دستی میں گذری اور اکثر اوقات اس کے شاکی رہے۔ اسی کی آئینہ داری ان کا درج ذیل شعر کرتا ہے جو انہوں نے حیدر آباد دکن کے دورانِ قیام میں ۱۲ فروری ۱۳۱۳ھ کو لکھا تھا۔

مصیبت چند روزہ ہے کٹی جاتی ہے اے حسرت
گذر جائیں گے یہ دن بھی مزے آہستہ آہستہ

عام شعراء کی طرح ان کی جوانی بڑی رنگین اور سرمستیوں میں گذری ہے۔ اکثر اوقات طوائفوں کے یہاں جاتے تھے اور شعر و شاعری کے چرچے ہوتے تھے۔ ایک طوائف مشتری نام کی حیدر آباد میں بہت مشہور تھی۔ اس کے یہاں کبھی کبھی جانے تھے جب عرصہ گذر جاتا تھا تو وہ خود انہیں دعوت دے کر بلاتی تھی۔ اور انہیں چار و نا چار جانا ہی پڑتا تھا۔ ایک شعر میں انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

مشتری ہیں کہاں، چلیں جلدی
دلِ حسرت تو آج بکتا ہے:

ایک بار آپ اتفاقیہ کسی طوائف کے کوٹھے سے گرنے لگے تھے۔

دیکبارگی سنبھلے اور برجستہ اُس وقت یہ شعر پڑھ دیا۔

گرپڑے بھی غش ہی تو ان کے قدم پر

یہ غفلت میں بھی ہوشیاری رہے گی

آخرکار بات وہی پیش آئی اور یہ عاشق کڑا انہیں دونوں اور تنگدستیوں کے ہاتھوں ۱۰ فروری ۱۹۴۱ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کا مقولہ صحیح نکلا۔

بس مرجاؤں گا حسرتؔ ہاتھ تم رہ جاؤ گے مل کر

نہ لی یونہی مری کچھ دن اگر تم نے خبر دیکھو!

نمونۂ کلام یہ ہے۔

ان کا ہلکا سا تبسم یاد کر لیتا ہوں میں

اک جہانِ آرزو آباد کر لیتا ہوں میں

دل سے وہ عہدِ اسیری کی خلش جاتی نہیں

آشیاں میں بھی قفس کو یاد کر لیتا ہوں میں

میرا ان کا اب فقط اتنا تعلق رہ گیا

یاد آجائیں تو حسرتؔ یاد کر لیتا ہوں میں

شعر بھرتی کے لکھے جا حسرتؔ

لکھتے لکھتے ہی مہارت ہو گی

خبر رہتی نہیں کچھ انتہا کی
بُری ہوتی ہے اُلفت ابتدا کی

ہوا اس شمع رو سے ایک شب روشن نہ گھر اپنا
جلائے آتشِ فرقت میں ہم نے استخواں برسوں
نہ کی اُس سنگدل نے چشمِ نم تک بھی مری تربت پر
کہ جس کے ہجر میں آنکھیں رہی ہیں خونفشاں برسوں
ظہیرؔ[1] ایسا جہاں میں کب ملے گا شیخ اے حسرتؔ
جلاکر مشعلِ خورشید ڈھونڈھے آسماں برسوں

یہ حسرتؔ ہے گدا اُس آستاں کا
غلامی جس کی ہے فخر آسماں کا
ہوا ظاہر اُسی سے نامِ باری!
نشاں پایا اُسی سے بے نشاں کا
یہ ہے حسرتؔ ہمیشہ یادِ احمدؐ
محمدؐ ہو سخن تکیہ زباں کا

---

[1] مولانا شاہ ظہیرالدین احمد کرڑوی برادر بزرگ مولانا شاہ رکن الدین احمد رئیس کرڑا۔

کعبہ میں پتہ ہے نہ کلیسا میں نشاں ہے
دل میں ترے وہ قبلۂ حاجات نہاں ہے

منہ زرد ہے لب خشک ہیں اور سُرخ ہیں آنکھیں
آثار محبت تری صورت سے عیاں ہے

شب ہجر جاناں بسر ہو گئی
تڑپتے تڑپتے سحر ہو گئی

اُٹھ گیا اس جہاں سے حسرت
آپ بیٹھے ہیں بے خبر دیکھو!

کوچۂ یار لاکھ ہو پُر خار
ہم چلیں گے برہنہ پا ہو کر

نیا اک داغِ فرقت دل پہ پڑ جاتا ہے اے حسرت
کڑا جس وقت یاد آتا ہے وہ اپنا وطن مجھ کو

وہ حالِ زار اپنے عاشقوں کا سُن کے کہتے ہیں
مرا کیا جائے گا کمبخت اپنی جان کھوئیں گے

چلا دل لے کے حسرت سامنے کیوں ان کی مژگاں کے
نکیلے تیر ہیں کانٹے ترے حق میں یہ بوئیں گے

ابھی ہم تم سے کہتے ہیں ذرا مڑ کر ادھر دیکھو
ہؤا ہے جو تمہارے ظلم سے حالِ جگر دیکھو
جگر میں ہزاروں داغ لاکھوں زخم ہیں دل پر
یہی پایا ہے نخلِ عشق سے ہم نے ثمر دیکھو
غزل میری وہ اپنی بزم میں بُلوا کے سنتے ہیں
کہاں سے لے گئی مجھ کو کہاں قدرِ ہنر دیکھو
میں مر جاؤں گا حسرت ہائے تم رہ جاؤ گے مل کر
نہ لی یونہی مری کچھ دن اگر تم نے خبر دیکھو

حباب آسا نظر آئے گی اُس دم کشتیٔ عالم
وفورِ اشک ہو گا جس گھڑی اس چشمِ گریاں میں

رفاقت کی ہمارے دردِ غم نے تا دمِ آخر
جنہیں سمجھے تھے ہم دشمن وہ ایسے مہرباں نکلے

تم جب سے ہوئے چاہنے والے مرے دل کے
اللہ نے ارمان نکالے مرے دل کے
اُلفت میں تری جب سے گرفتار ہوا ہے
غم کھاتے ہیں سب دیکھنے والے مرے دل کے
حسرت یہ اُٹھائے گا کہاں تک غمِ فرقت
خوں روئے گا پڑ جائیں گے لالے ترے دل کے

نہ ہو یارب جُدا دلبر کسی کا
نہ اُجڑے یا الٰہی گھر کسی کا
نظر آیا رُخِ انور کسی کا
بلندی پر ہے اب اختر کسی کا
پتہ ہے کوئے قاتل کا یہ قاصد
جدا تن سے پڑا ہے سر کسی کا

نہ رہ جائے ستم جلاد باقی
اُٹھا رکھنا نہ کچھ بیداد باقی
دکھا دے ایک دن دیدار گلشن
یہی ہے آرزو صیاد باقی

غزل پُر درد ہے حسرتؔ یہ لیکن
نگاہِ یار کا ہے صاد باقی

دل کے پردوں میں عداوت کو نہاں رکھتے ہیں
یہ مسلماں ہیں تو اسلام کہاں رکھتے ہیں

دوستو جب سے وہ میرا مہ انور چھوٹا
غم فرقت کا کبھی ساتھ نہ دم بھر چھوٹا
یاد آئی ہے کسی کی وہ نگاہِ مخمور
مے کشو لیجو مرے ہاتھ سے ساغر چھوٹا

کیوں چپکے ہو کچھ بولو تو اے حضرت حسرتؔ
بتلائیے دل آپ کا اس وقت کہاں ہے

کس کی اُلفت نے جلایا ہے تجھے اے حسرتؔ
خاک سے تیری ہمیں بوئے وفا آتی ہے

ان کو اغیار نے افسوس اُچھالا کیا ہے
خیر اُجڑی تو اُجڑنے دو ہمارا کیا ہے

کیا کہوں ہجر میں جو آپ کے مجھ پر گذری
تم نے یہ بھی نہ کہا حال تمہارا کیا ہے
گنگا جمنا میری آنکھیں ہیں نہاؤ ان میں
آشنا ہو کے مری جان کنارا کیا ہے
تیغ موجود ہے سر نذر ہے ڈر ہے کس کا
شوق سے کاٹئے ابرو کا اشارا کیا ہے
آپ حسرت سے جو ناراض ہوئے ہیں اپنے
وجہ خفگی کی بتائیں تو خدا را کیا ہے

کیوں نہ ہو حیرت سے ششدر آئینہ
رُخ ترا روشن مکدر آئینہ
روز کرتا ہے نظارا یار کا!
ہے عجب تیرا مقدر آئینہ

قصہ غم ہمارا سُن کے کہا
نیند آتی ہے ہم کو سونے دو
زندگی بھر تو جاگے ہیں حسرت
گوشۂ قبر میں تو سونے دو

کیا لائی ہے نکہت یہ کسی غیرتِ گُل کی
آتی ہے شگفتہ جو نسیم سحر ایسی

ہم دُرِ اشکِ غم میں کھو بیٹھے
عشق کی آبرو کو رو بیٹھے

دل ہے پہلو میں درد ہے دل میں
دشمنِ جاں ہیں گھر میں دو بیٹھے

مٹ گئے اُس کے در سے پر نہ اُٹھے
نقش پا کی طرح سے جو بیٹھے

عشق میں اُس بُتِ ستمگر کے
ہاتھ دونوں جہاں سے دھو بیٹھے

زخمِ خنداں سے چشمِ تر نے کہا
ہم تو روتے ہیں تم ہنسو بیٹھے

قطعہ
۱۰ مئی ۱۹۰۹ء

تو پاس نہیں ہے جب سے جانی
بے لُطف مری ہے زندگانی

اک دل پہ ہزار سنگِ بیداد
سہتا ہوں میں وائے سخت جانی
روتا ہوں مثالِ شمع ہر چند
بجھتی نہیں سوزشِ نہانی
اُس بُت سے ہے یہ سوال میرا
کچھ میں بھی سُنوں تری زبانی
اُٹھتا نہیں بارِ زندگی کا !
اس درجہ ہے زورِ ناتوانی
اغیار کو تو نے گُل دیئے ہیں !
ہم کو دیا داغِ دل نشانی
دل لے کے دغا سے مجھ کو مارا
کی تو نے یہ خوب قدردانی
ذرہ سے بھی ہوں حقیر تر میں
کم جب سے ہے تیری مہربانی
مانندِ شفق کے میں کہاں تک
آنکھوں سے کروں گا خوں فشانی
یاد آتی ہیں جب وہ میٹھی باتیں
ہو جاتی ہے تلخ زندگانی

سننے کی نہیں ہے تاب حسرتؔ
پُر سوز وہ ہے تری کہانی

قطعۂ تاریخ وفات اہلیہ خود

گفت حسرتؔ سال با آہ و فغاں
سوئے جنت رفت محبوبِ جواں

۱۳۲۷ھ

بھولا ہوا غم یاد دلانا نہیں اچھا
پھر آگ نئے سر سے لگانا نہیں اچھا

لکھنا یہی حسرتؔ کے لحد پر پسِ مردن
موت اچھی ہے پر دل کا لگانا نہیں اچھا

مشتری ہیں کہاں چلیں جلدی
دلِ حسرتؔ تو آج بکتا ہے

اثر حسرت کا دیکھو بعد مردن
بہت رحمے وہ ہم کو یاد کر کے

غم حسرت کو روؤں کیوں نہ حسرت
جدا ہوتے ہیں ساتھی عمر بھر کے

نام جن کا لیتے لیتے خشک ہوتی ہے زباں
ہائے حسرت ان کو نفرت ہے ہمارے نام سے

گریں گے بھی غش میں تو ان کے قدم پر
یہ غفلت میں بھی ہوشیاری رہے گی

مصیبت چند روزہ ہے کٹی جاتی ہے اے حسرت
گزر جائیں گے یہ دن بھی ضرور آہستہ آہستہ

نہ آئیں گے نہ آئیں گے کبھی وہ میری میت پر
مرے احباب کیوں مٹی مری برباد کرتے ہیں

• بزمانۂ قیام حیدرآباد دکن ۱۲ار فروری ۱۳۱۹ھ

بہر حق دیکھ وقتِ دید ہے یہ
حالِ دل قابلِ شنید ہے یہ
ملتے ہیں آج دوست دشمن سب
تو بھی لگ جا گلے سے عید ہے یہ

دل پسے جاتے ہیں ظالم تری رفتار کے ساتھ
فتنے جاگ اُٹھتے ہیں پازیب کی جھنکار کے ساتھ
بعد مرنے کے بھی یک دم مجھے راحت نہ ملی
میری مرقد پہ وہ آئے بھی تو اغیار کے ساتھ

کس سے تھی رسمِ وفا بھول گئے
اب اُسے یاد کیا کرتے ہیں

حقیقت بادپیمائی کی اب اس سے عیاں ہو گی
عدم سے جانب ہستی تلاشِ یار میں آئے

نہ ٹھکراؤ خدا کے واسطے تم
مرا دل ہے مرا دل ہے مرا دل

گلبرگ اب کے جائیں گے اے حسرت اسلئے
کہتا ہے حال دل ہمیں بندہ نواز سے

جو سب ہیں رہو سب سے الگ تم
نکل تھا یہ کسی نے آپ .. سے

بہت پُر درد ہے اپنی کہانی
کہو تو کچھ سنائیں ہم کہیں سے

وطن کی یاد تھی حسرت کو اتنی
کہ آنسو پونچھتے تھے آستیں سے

کھول کر گیسو جو وہ شانے پہ سلجھانے لگے
دیکھنے والوں کے دل پر سانپ لہرانے لگے

تم پہ مرنے کی قسم کھائی تھی لو ہم مر گئے
آپ کی روئے بلا کیوں آپ پچھتانے لگے

نہ خبر تم نے لی ہماری رات ہم نے کاٹی تڑپ کے ساری رات

دم بھر نہیں اعتبار دم کا حسرتؔ
مانندِ حباب زندگانی دیکھی!

جا اگر چاہے چشمِ مردم میں
سُرمہ بن جائے خاکِ پا ہو کر

ذبح کے وقت تو ہم دیکھ لیں جی بھر کے انہیں
یا خدا ہو نہ کہیں خنجرِ جلاد بینا

ہائے حسرتؔ وہ سفر کر گئے دنیا سے امیرؔ
کون ایسا ہے جسے کیجئے اُستاد نیا
ہاں جلیلؔ اب ہیں سخن سنج و سخنور جیسے
ویسا عالم میں نہیں ہے کوئی اُستاد نیا

حسنؔ

سید محی الدین نام حسنؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ کے حالات سے اہلِ قصبہ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ آپ کا کس خاندان اور کس محلہ سے تعلق تھا۔ گلدستۂ سخن حیدر آباد جلد دوم نمبر ۲ بابت ذی الحجہ

مطابق ماہ نومبر ۱۸۸۰ء کے صفحہ ۲۳ پر آپ کی ایک غزل ملی ہے جس کی سرخی میں یہ بھی لکھا ہے کہ حال وارد حیدرآباد جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل آپ حیدرآباد میں نہیں تھے۔ بعد میں آپ کہاں رہے اور کب انتقال ہوا کچھ پتہ نہیں چلتا ایک غزل نقل کی جاتی ہے۔

گر نہیں رکھتا تعلق اُس کے در سے آفتاب
دیکھتا رہتا ہے پھر کیوں چرخ پر سے آفتاب
ضرب شمشیر حوادث کا اگر ہوتی نہیں
ہے مشابہ کچھ مگر شہ کی سپر سے آفتاب
جس کو جتنا فوق ہے اتنا ہی اس کو تحت ہے
روز بتلاتا ہے سب کو دوپہر سے آفتاب
ہے جسے اوج سحر شام تنزل ہے اُسے
منہ کے بل گرتا ہے چڑھ کر دوپہر سے آفتاب
بخت جو کھلتا ہے وہ دیر تک رہتی نہیں
چند لمحے ہیں گذر جاتا ہے سر سے آفتاب
شاہد شب کا طلوع آتا نہیں پھر کچھ نظر
تاج زر یہ سر نکلتا جب ہے گھر سے آفتاب
شاہ کی شفقت ہمیشہ عام ہونی چاہیے
ذرہ ذرہ دیکھتا ہے اک نظر سے آفتاب

۱؎ گلدستۂ سخن انجمن ترقی اردو کتب خانہ نمبر الف ۱۳۲۴

تخت پہ کون آج کل رونق فزا ہونے کو ہے
تھرتھراتا ہے فلک پہ جس کے ڈر سے آفتاب
اس سے ہو ظاہر عیاں اس سے ہو باطن منکشف
کب ہے روشن تر حسن عقل بشر سے آفتاب

حسن

سید حسن اعلیٰ نام حسنؔ تخلص کرتے تھے۔ سید منصب علی کے فرزند تھے منصب علی کی سکونت اینٹ گاؤں کی تھی۔ میر حسن اعلیٰ میاں کا زیادہ تر قیام کڑا ہی میں رہتا تھا۔ آپ کا رنگ کالا۔ قد پستہ اور آواز بھدی تھی آپ کے کچھ اعزا حیدرآباد دکن میں مقیم و ملازم تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا جانا بھی وہاں ہوا۔ وہاں رہ کر آپ نے رسوخ اتنے بڑھائے کہ مدین السلطنت راجہ سرکشن پرشاد تک رسائی ہو گئی۔ اس تعجب خیز واقعے کی تفصیل یہ ہے۔

ایک دن راجہ اپنی خیرات بانٹ رہا تھا اور در پہ بیٹھا تھا اتفاق سے حسن اعلیٰ بھی ادھر سے گذرے اس نے ان سے بھی فرمایا کہ دامن پھیلاؤ آپ نے فرمایا "جامہ نہ دارم۔ دامن از کجا آرم" یعنی میں قمیص ہی نہیں رکھتا دامن کہاں سے پھیلاؤں" راجہ نے یہ جواب سن کر حسن اعلیٰ کو اپنے پاس بلوا بھیجا اور اپنے مصاحبوں میں رکھ لیا۔ راجہ آپ کی مصاحبت سے بہت خوش ہوتا تھا۔ اکثر اوقات آپ اس سے خفا بھی ہو جاتے تھے

مگر راجہ آپ کو راضی کر لیتا تھا۔ راجہ آپ کے دوستیہ مزاج اور طرز گفتگو سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ حسن امین میاں کو ۴۰ روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ حسن کو اپنے قصبہ سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کی مثال یہ ہے کہ وہ خود بتایا کرتے تھے کہ جب میں راجہ کرشن پرشاد کے ہمراہ دلی جاتا تھا اور راستے میں کوسے کے ریلوے اسٹیشن سرائے تھو پر ریلوے قلی آواز لگاتا اور کہتا۔ "سرائے تھو اسٹیشن" "سرائے تھو اسٹیشن" تو میں بغیر راجہ کی اطلاع کے سرائے تھو اسٹیشن پر اتر جاتا اور گاؤں پہنچ جاتا۔ جب کہیں راستے میں راجہ کو میری ضرورت محسوس ہوتی اور مجھے دریافت کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ غائب ہیں۔ راجہ مسکراتا اور سمجھ جاتا کہ "سرائے تھو اسٹیشن" کی آواز کی کشش نے انہیں سرائے تھو ہی میں اتار لیا ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہوتی۔ اصل میں حسن اعلیٰ بڑے شگفتہ مزاج، خدا ترس، رحم دل، بذلہ سنج، خوش گو اور قادر الکلام شاعر تھے وہ مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے مگر شعر ضرور کہتے تھے انہیں شعر و سخن سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ ان کی صحبت میں کوئی انسان کبھی پژمردگی محسوس نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ راجہ آپ کو بہت عزیز رکھتا تھا حسن امین کی اولاد میں حسین علی تھے جو راقم الحروف کے حقیقی پھوپھا تھے۔ حسین اعلیٰ کے صرف ایک فرزند بدر اعلیٰ اور دو لڑکیاں ہندوستان میں ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق ایک عمر سے ان کو تھا۔ حسن نے ایک استغفار شائع کرایا تھا۔ خاص طور سے رمضان کے مہینے میں اس کا مطالعہ خاندان کی عورتیں جمع ہو کر کرتی تھیں۔ اسی استغفار کے آخر میں حسن کی کہی ہوئی چند مناجاتیں بھی شامل تھیں۔ استغفار

اب کہیں نہیں ملتا۔ البتہ موصوف کا صرف ایک شعر یاد ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے

دشت یثرب میں ترے ناقہ کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

خرم ۔ آپ کی مناجات اور نعتیں دستیاب ہو گئی ہیں اور صفحہ ۴۹۳ پر شائع ہو رہی ہیں۔

رائے سیتل پرشاد نام خرم تخلص تھا آپ کے والد لچھمی پرشاد ابن لعل چند ابن راجہ لچھمی چند تھے۔ آپ کا قیام حیدرآباد دکن میں تھا۔ مگر قدیم اور آبائی وطن کڑا ہی تھا۔ حیدرآباد دکن میں صرف خاص کے آپ منصب دار تھے شمس الدین فیض حیدرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ شعر و شاعری سے خاص شغف تھا خاص طور سے تاریخ نکالنے میں مہارت رکھتے تھے ہر شاہی تقریب میں کوئی قطعۂ تاریخ لکھ کر حاضر خدمت ہوتے، اور اپنا کلام سناتے غفران مکاں نے خرم ہی سے داغ دہلوی کی تعریف سنی تھی اور انہیں سے یہ بھی علم ہوا تھا کہ داغ واپس چلے گئے۔ جس کے بعد داغ کو واپس بلایا اور مراتب جلیلہ سے سرفراز فرمایا۔ آپ کی وفات ۱۳۲۱ھ میں بتائی جاتی ہے۔ شدید "سخنوران چشم دید" آپ کی مادۂ تاریخ ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

ہوئی ہے حبس کہ کن سے نمود ہستی کی
فنا بھی ہو گی یونہی ایک روز ہو ہو کر

کب آگہہ تھے چناں سے اور چنیں سے
نئی سیکھو آئے ہو باتیں کہیں سے
جناب فیضؔ کی درگہہ ہے فیاض
ہے عزمؔ فیض عالم کو یہیں سے

عزمؔ ترے سخن میں ہے فیضِ جناب فیضؔ
ہر اہلِ دل کے منہ پہ صدا واہ وا کی ہے

جاری جناب فیضؔ کا ہے فیض دہر میں
جو بے ہنر تھے ان کو ہنر دار کر دیا
واقف نہ تھے جو خالقِ باری کی ذات سے
ان خادموں کو واقفِ اسرار کر دیا
عزمؔ نے پڑھ کے اپنی غزل آب و تاب سے
محفل کو شاعروں کی پُر انوار کر دیا

لہ داستان ادب حیدرآباد مصنفہ سید محی الدین قادری زور مطبوعہ طارق برقی پریس حیدرآباد بار اول ۱۳۷۰ھ قیمت ؎ صفحہ ۱۵۰

(۲) عروس الافکار۔ نصیر الدین نقش ۱۲۸۹ھ قلمی

(۳) ثمرۂ فصاحت ۱۲۲۳ھ دیوان مولوی محمد ریاض الدین ص ۱۴۳

میں نے تو سر دے دیا دل دیدیا اور جان دی
تم بھی کچھ دیدو تصدق حسن کے اقبال کا

میں اپنی ناتوانی کو توانائی سمجھتا ہوں
کہ پتھر کوہکن نے ناتوانی میں تو توڑے ہیں

سنا کرتے ہیں پھر چرچا حسن روز افزوں کا ہم ان کے
رباعی میں غزل میں شعر میں قصہ کہانی میں

بلبل باغ فصاحت تھے جناب فیاض[1]
ان کا دیوان گل باغ سخن سے ہے بھرا
پوچھی حزم نے جو ہاتف سے طبع کی تاریخ
کہا ہاتف نے "زہے گلشن فیاض چھپا"

۱۳۲۲ھ

حزم کے جد امجد رام لچھمی چند پیر بہادر کرڑا مانک پور کے دیوان تھے رجہ بھونی پرشاد کمندان (لعل چند) حزم کے دادا بعہد نواب سکندر جاہ حیدرآباد دکن آ گئے تھے۔ حزم کی پیدائش ۴ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ بتائی جاتی ہے۔

---

[1] فیاض الدین خاں فیاض ابن   حیدرآبادی لال کے استاد بھائی تھے۔ سنہ میں وفات پا گئے۔

ہم کو فراقِ یار نے ناچار کر دیا
عشقِ ستم شعار نے بیمار کر دیا
اس کی مے ادا نے جو سرشار کر دیا
آکر قضا نے مست کو ہشیار کر دیا
اک دخترِ رز کے عشق نے میخوار کر دیا
ز شیخ حی کا جبہ و دستار کر دیا
زلفوں نے اس کے دل کو گرفتار کر دیا
جادو بھری نگاہ نے بیمار کر دیا
منصور کو پچا نہیں جامِ مے الست
وحدت کا راز نشہ میں اظہار کر دیا
سونے دیا نہ چین سے بزمِ نگار کے
مرغِ سحر کے نالوں نے بیدار کر دیا
دل میرا جیتا جاگتا چھینا ادا کے ساتھ
بے رحم نے پھر اس کو مجھے مار کر دیا
دامن ہے اپنا دشت کے خاروں سے تارتار
دیوانہ عشق نے سرِ بازار کر دیا
ٹھوکر لحد پہ مار کے مُردے جلا دیئے
اُس فتنہ گر نے حشر نمودار کر دیا

لہ گلدستۂ فیض، ۱۳۲۰ھ۔ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی نمبر الف ۷/۲۲/۹۴
" " ۱۳۲۱ھ " " " " " " " "

جل بھن کے کالا رنگ ہوا آسمان کا
آہوں نے میری اُس کو دھواں دھار کردیا
اسے ہمدمو فراق نے اُس گلعذار کے
داغوں سے دل کو غیرتِ گلزار کردیا
جاری جناب فیضؔ کا ہے فیض دہر میں
جو بے ہنر تھے ان کو ہنرور کردیا
واقف نہ تھے جو خالقِ باری کی ذات سے
ان خادموں کو واقفِ اسرار کردیا
حزمؔ نے پڑھ کے اپنی غزل آب و تاب سے
محفل سخنوروں کی پُر انوار کردیا

دل اپنا روئے یار پہ شیدا ابھی سے ہے
سر میں ہمارے زلف کا سودا ابھی سے ہے
ہم سے خفا جو وہ بُتِ ترسا ابھی سے ہے
ہم نے بھی دل خدا سے لگایا ابھی سے ہے
پوری گندی نہ ہوسکے ابھی جعد یار کی
عالم میں مار مار کا بلوا ابھی سے ہے
تم نے گلوری پان کی ہم کو ابھی نہ دی
منہ دیکھئے رقیبوں کا کالا ابھی سے ہے

قاتل نے تیغ کھینچی نہیں میان سے ابھی
سر تن سے دور ہونے کا دھڑکا ابھی سے ہے
شاید کسی کے زلف کی پرچھائیں پڑ گئی
اپنے سر دماغ میں سودا ابھی سے ہے
شاید چڑھے گا کوٹھے پر وہ رشک مہر حشر
طبقہ زمیں کا منہ و بالا ابھی سے ہے
پورا پڑا نہ عکس ابھی زلف یار کا
دیکھو تو روئے ماہ پہ دھبا ابھی سے ہے
کب تک امید وصل میں ہم زندگی کریں
فرقت میں چاک چاک کلیجا ابھی سے ہے
یا رب خلاص کر مجھے اب بند نفس سے
بطحا میں جا رہوں یہ تمنا ابھی سے ہے
کس کی نظر ہے بن گئے دیوانے ہم جنوں
صحرا کا اپنے دل پہ تقاضا ابھی سے ہے
پردہ رخ صنم سے اٹھا تک ابھی نہیں
منہ چھپ سے سحاب میں ڈھانکا ابھی سے ہے
باقی ہے صبح ہونے کو یک پاس شب ابھی
کیا ظلم ہے وہ کہتے ہیں جانا ابھی سے ہے

مجھ ایسے مبتدی سے ہے کیا غزل کا رنگ
نقشہ زمین شعر کا بگڑا ابھی سے ہے
خرم کے دل کو کھینچ تری سمت اے خدا
بیزار اں بتوں سے یہ بندہ ابھی سے ہے

درد اٹھتا ہے ہر بار جو فرقت میں جگر سے
کہتا ہے جنوں اب تو نکل چل کہیں گھر سے
جب آپ کی ایڑی تک اتر آئی ہے سر سے
ہے خوف یہ الجھن کہیں لپٹے نہ کمر سے
جیسا کہ گرائے ہو مجھے اپنی نظر سے
تو تیغ جدا جلد کرو تن میرا سر سے
صورت تو بتا پھر خدا اسے بت بیرحم
کب تک ترا عاشق ترے دیدار کو ترسے
ابرو ہیں کماں تیر مژہ چشم ہے جادو
کیوں باندھے ہوئے پھرتے ہو شمشیر کمر سے
برسات لگا دی ہے مری آنکھوں نے اے یار
کب تک یہ جھڑی ہجر میں ان آنکھوں کی برسے
خرم تو جما کوچۂ دلدار ہیں آسن
آ جائے گا وہ خود ہی اسی رہگذر سے

مولانا خواجگی

نام محمد شمس الدین اور خواجگی خطاب تھا۔ حضرت سید احمد بن سید شمس الدین مفسر ملتانی کے بیٹے تھے جن کا نسب امام ابو عبد اللہ جعفر صادق سے ملتا ہے۔ آپ کی ولادت بیانہ میں [illegible]ھ میں بتائی جاتی ہے۔ فقہ تفسیر، حدیث اور علم دین میں آپ بے مثال تھے۔ آپ سہروردیہ سلسلہ میں مرید ہو کر اجازت یافتہ ہوئے۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے "مراد مرید" اور "الاربعین" استداد زمانہ کے ہاتھوں بھی مٹ نہ سکیں۔ مراد مرید محمد زبیر فاروقی شوکت سے لے کر راقم الحروف نے پڑھی ہے۔ اور اس کے مطالب و معنی پر بھی توجہ دی ہے۔ یہ کتاب فارسی میں تھی جس کا ترجمہ سہال احمد سہالوی نے اردو میں کیا ہے اور مع متن اُسے شائع بھی کرایا۔ تصوف کی کتاب ہے اور اہل تصوف کے نزدیک معرکۃ الآرا تصور کی جاتی ہے۔ آپ نے اپنے مرشد سید علاء الدین متوطن جیور ضلع بلند شہر کے ساتھ ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیاحی کی۔ آخر میں کڑا میں آکر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سید علاء الدین جیوری کو سہروردی سلسلے سے تعلق تھا۔ آپ کی شادی مسماۃ بی بی فاطمہ دختر سید ہاشم بخاری قنوجی کے ساتھ ہوئی تھی جن کے بطن سے سید محمد اسد اللہ پیدا ہوئے۔ سید کبیر الدین احمد ظہیر آپ ہی کی اولاد میں سے تھے۔ جن کے فرزند عماد الدین عماد دور حاضرہ میں اچھے شاعر گذرے ہیں۔ آپ کا خاندانی شجرہ تاریخ کڑا مانک پور کے

صفحہ ۱۲۴ پر دیا ہوا ہے۔ آپ کی وفات ۴ محرم الحرام ۱۰۶۹ھ کو بتائی جاتی ہے۔ نہال احمد نہ آل مراد مریدؔ کے اردو ترجمہ کی تمہید میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"حضرت مولانا شمس الدین ثانی المعروف بمولانا خواجگی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار شریف بلدہ کڑا ضلع الہ آباد میں جانب اتر دریا سے گنگ کے مغربی کنارہ پر واقع ہے جو اہل بلدہ کی اصطلاح میں گڑی گھاٹ کے نام سے موسوم ہے آپ کے جد امجد حضرت مولانا سید محمد شمس الملت والدین عربی رحمۃ اللہ علیہ سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ غزنی سے تشریف لائے آپ نسبا سید حسینی الحسینی اور حضرت محمد اسمٰعیل ابن جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں تھے۔ آپ کو خرقہ خلافت قطب الاقطاب غوث الاعظم شیخ المشائخ حضرت سید محی الملت والدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملا تھا۔ مزار شریف آپ کا ملتان میں ہے اور ایک تفسیر بھی آپ کی جملہ تصنیفات میں سے ہے جو تفسیر ملتانی کے نام سے معروف ہے۔ آپ کے بڑے بیٹے حضرت مولانا سید احمد الملقب سلطان خلیفہ المعروف بہ پیر جنہیم معہ اپنے صاحبزادوں کے مولانا سید قطب الدین مدنی کے ہمراہ کڑا تشریف لے آئے۔ مگر چونکہ یہ زمانہ خواجگی کے طلب علم و کمال کا تھا۔ غالباً اسی غرض سے مولانا خواجگی صاحب کڑا میں رہ گئے۔ اور آپ کے والد حضرت سید احمد صاحب معہ اپنے متعلقین کے پنجاب واپس تشریف لے گئے حضرت سید احمد صاحب کا مزار شریف لاہور میں ہے۔ اور آپ کا سلسلہ اکثر بلاد و

حصہ پنجاب میں پھیلا ہوا ہے۔ حضرت مولانا خواجگی رحمۃ اللہ علیہ عالم متبحر اور جامع علوم معقول و منقول ہوئے اور علوم ظاہری کے سوا علم باطن اور کمالات معنوی میں بھی بلندیوں پر گوئے سبقت لے گئے۔ اگرچہ آپ کو بہت سے مشائخ سے فیض پہنچا اور اپنے پدر بزرگوار و برادران عالیمقدار سے بھی نعمتیں ملیں لیکن حضرت شیخ علاء الدین جیوری رحمۃ اللہ علیہ سے پہنچایا آپ پر نسبت سہروردیہ غالب آئی:

بڑے قادر الکلام شاعر تھے مگر کوئی موثر کلام راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہو سکا۔ آپ کے مزار پر آپ کا کہا ہوا جو قطعہ کندہ ہے وہی ہدیۂ ناظرین ہے

برائے خدا اے عزیزان من
نویسید بر گور من این سخن
کہ چون خواجگی در تہہ خاک شد
نگویند کہ خس کم جہاں پاک شد

خوشدل

لالہ امر سنگھ نام تھا تخلص خوشدل کرتے تھے۔ آپ کے والد جیون رام کالسنہ تھے جو اپنی شرافت کی وجہ سے قصبہ میں مشہور تھے یہ پڑھے لکھوں کا خاندان تھا اور اپنی علمی لیاقت کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں بڑے عزو وقار

کا حامل تھا۔ خوشدل کا زمانہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ جب خوشدل غازی پور کے ناظم یا حاکم اعلیٰ تھے خوشدل فارسی، عربی، سنسکرت اور اردو زبان کے بڑے جید عالم تھے۔ علوم متداولہ پر آپ کو کافی عبور حاصل تھا۔ خوش دل ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے علی گڑھ کے ناظم مقرر ہوئے تھے اور اسی زمانے میں انہوں نے "تاریخ فرمانروایانِ ہند" لکھی تھی۔ یہ تاریخ علاءالدین غوری کے زمانہ پر ختم ہوتی ہے اس کتاب میں ہندوستان کے تفصیلی حالات لکھے گئے ہیں اور ضمنی طور پر انگریزوں کے حالات بھی قلمبند کئے گئے ہیں۔

خوشدل صرف خوشدل ہی نہیں تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خوش رو اور خوش مزاج بھی تھے۔ آپ علم و ہنر میں یکتائے روزگار تصور کئے جاتے تھے۔ اپنی نظامت کے دوران آپ نے علی گڈھ میں مشہور مشاعرے منعقد کرائے اور کڑا بھی جب تشریف لاتے تو طرحی مشاعرے منعقد کراتے۔ آپ کو طرحی مشاعروں کا بہت شوق تھا۔ خاص طور سے سنگلاخ زمینوں سے آپ کو بڑی اُنسیت تھی۔ آپ نے سنسکرت اور اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ آپ کا تذکرہ "قاموس المشاہیر" مصنفہ نظامی بدایونی جیسی مستند کتابوں میں پایا جاتا ہے ۱۲۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا صبحِ گلشن ۱۲۹۵ھ مصنفہ سید علی حسن خاں ولد محمد صدیق حسن خاں مطبوعہ ریاست بھوپال کے صفحہ ۱۵۵ پر اس طرح درج ہے۔

جلد اوّل صفحہ ۱۰۴

"خوش دل تخلص راے امر سنگھ ولد جیون رام از قوم کایتھان ست اصلش از کڑہ مانک پور و شہر غازی پور مولد خوش دل خوش بیان جیون رام در سرکار وزیر الممالک نواب ابوالمنصور خان صفدر جنگ منزلتی حاصل کردہ بوسیلۂ جمیلۂ آن دستور معظم از حضور محمد شاہ بادشاہ بمنصب و خطاب سربلندی یافت در زمان حکومت نواب شجاع الدولہ بہادر بہ نظامت سرکار غازی پور مامور گردیدہ بدار الخلود شتافت ذرۂ امر سنگھ بعد تحصیل علوم و فنون اولاً در سرکار مہاراجہ اجیت سنگھ راجۂ بنارس و آخر در سرکار انگریزی بدایونی نظامت ضلع عیدگاہ کامران و مقضی المرام گشت. در سنہ یک ہزار و دو صد و لبست و پنج از منجہان گذران درگذشت بہاط دانش نظم و نسخہ تاریخ فرمانروایان ہنود تا سلطان علاء الدین غوری از دی یادگار رست و اشعار دیوانش تخمیناً پنجہزار است

گرم است بسکہ نالۂ آتش فشان ما
سوزد برنگ شمع زبان در دہان ما

زلف خوش در حلقہ میدارد رُخ یار مرا
صبح صادق در بغل باشد شب تار مرا

بر سر راہش نشانده عشق کافر تا مرا
طاقتِ برخاستن گم شده چو نقش پا مرا
بسکه در سودائے زلفت شده سیاه ایام ما
نیست فرقِ یک سر مو در صباح و شام مرا

ساقیا ساغرِ شراب کجا صبح گل کرد آفتاب کجا
این صدا از مزار من خیزد تشنه ام تشنه ام شراب کجا

گذار اے بُتِ مخمور کبریائی را
مکن برائے خدا دعوے خدائی را
از آتش عشق تو دلم در تب و تاب است
ہر لخت جگر سوختہ مانند کباب است
آن آئینه رو دوش که در جلوه گری بود
حیران ہمہ تن بر رُخ او چشم پری بود
نمیدانم چه تاثیر ست در عالم نگاہش را
پری در شیشه و دیوانه در ویرانه میر فصد
شنیدم بسملی میگفت اشب با دلِ سوزان
که آیا آب تیغ قاتلِ من آتش ست آتش

گویم چه حالت دل خود بی نو باز من روز قیامت ست شبِ انتظار من

ذکی

سید ذکی اکبر نام۔ ذکی تخلص کرتے ہیں۔ آپ سید رضا اکبر کے بڑے فرزند ہیں۔ مبین کڑوی سے شرف تلمذ حاصل ہے ۲۲ر جولائی ۱۹۱۰ء کو محلہ نصیا نہ میں جنم لیا۔ بی اے، ایل ایل بی کامیاب ہونے کے بعد الہ آباد میں وکالت شروع کی۔ محلہ روشن باغ میں ایک بہت عالیشان کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔ غزلیں عام طور سے ترنم سے پڑھتے ہیں۔ آپ کا مختصر سا حال جو کچھ بھی یہاں تحریر کیا جا رہا ہے رفیع نقوی کی عنایات کا مرہونِ منت ہے۔

ذکی کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

بینشِ اہلِ نظر میں بس وہی ذی ہوش ہے
زندگی کے ہر قدم پر جو کفن بردوش ہے
کس قدر مجمع ہے لیکن پھر بھی تنہائی وہی
منزلِ گورِ عزیزاں محفلِ خاموش ہے
خوبرو کا ذکر دیوانے کے ہے وردِ زباں
ہوش کی باتیں کئے جاتا ہے پر بے ہوش ہے
آرزو ہے اس کی میں خاک قدم ہوں اے ذکی
بوسہ گاہِ عرش جس محبوب کی پاپوش ہے

ادھر شورِ بہار گُل اُٹھا صحنِ گلستاں میں
ادھر وحشی لگے سر پھوڑنے دیوارِ زنداں میں

زمیں خشک نے شاداب ہو کر ابرِ باراں سے
بساطِ سبزہ پر موتی جڑے گلہائے خنداں سے
بس اتنی بات پر مجھ سے مزاجِ یار برہم ہے
میں پروانے کی حالت کہتا ہوں شمعِ شبستاں سے

تعلق جن کو جن سے ہے انہیں کا سامنا ہوتا ہے
گلوں پہ عندلیب اور شمع پہ پروانہ آتا ہے

رفیع

سید محمد رفیع نام رفیعؔ تخلص۔ سید محمد معین کے واحد فرزند اور مولوی سید محمد منبنؔ کے بھتیجے ہیں۔ منبنؔ الہ آباد میں وکالت کرتے تھے اور مستند شاعر تھے۔ رفیعؔ کی ولادت ۴ دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۶ شوال ۱۳۲۲ھ ہے رفیع خداداد ذہانت و ادراک کے مالک ہیں۔ عالمِ طفلی سے اُردو ادب سے شغف ہے چند مثنویات لکھیں اور کچھ سنجیدہ غزلیں کہیں مستقل طور پر شاعری نہیں کرتے جو کچھ کہتے ہیں تفریحاً کہتے ہیں۔ آپ کی ایک تازہ نظم در مدح علامہ

*حبد زیر تصنیف کتاب "وحید الدہادی" میں شامل ہے۔ رفیع کو تعلیم و تحقیق و تنقید سے خاص دلچسپی ہے۔ پرانی کتابوں کے مطالعے اور تدقیق تحقیق و تخلیق میں مصروف رہتے ہیں۔ کڑا کی دور حاضرہ کی تاریخ ادب سے ایسی محقق، فاضل عالم اور فہیم شخصیت خارج کر دی جائے تو جواب صفر رہ جائے گا۔ کڑا کے اس انحطاطی دور میں آپ ایسے قابل شخص موجود ہیں جس پر کڑا اور اہل کڑا کو فخر کرنا چاہئے۔ کتاب ہذا کی تصنیف و تالیف میں آپ نے جس فراخدلی، مستقل مزاجی اور وسیع النظری سے میری رہنمائی کی ہے وہ قابل صد ستائش و تحسین ہے۔ اگر آپ میری امداد نہ فرماتے تو شاید اس کتاب کا بیشتر حصہ تشنۂ تکمیل رہ جاتا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سید محمد اصفہانی متوفی ۱۲ر جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ بزمانہ خلفشار ہلاکو خاں مغل محلہ گلستان شہرِ اصفہان سے وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ ان کی پختہ قبر مع دو فرزندوں کی قبروں کے جامع مسجد کڑا کے پہلو میں ہے۔ ان کا تذکرہ بیشتر کتب تواریخ مثل "تاریخ کڑا مانک پور" و "تاریخ ظہور قطبی" و "تذکرہ السادات" و "تاریخ شمس تبریز" و "تاریخ آئینہ اودھ" وغیرہ میں موجود ہے۔

ٰ رفیع کا شجرہ خاندان تاریخ کڑا مانک پور کے صفحہ ۱۲۰ پر درج ہے

بیشتر شعراء و ادبا زود رنج ہوا کرتے ہیں چنانچہ آپ بھی بڑے نازک مزاج واقع ہوئے ہیں لیکن چونکہ دل کے صاف ہیں جلد ہی مان بھی جاتے ہیں۔

آپ کا شمار دکڑا کے) صف اوّل کے روساء میں ہوتا ہے۔ آپ کے

ٰ کتاب کے چھپتے چھپتے رفیع اللہ کو پیارے ہوگئے (راقم)

زنانہ اور مردانہ مکانات بہت شاندار ہیں۔ مردانہ مکان میں ایک نہایت خوش نما اور عالیشان سنگین دالان بھی ہے جو آپ کے بزرگوں نے بعہد شاہجہاں بادشاہ تعمیر کرایا تھا۔ وہی دالان امام باڑہ ہے اور اسی میں مجالس ہوا کرتی ہیں۔ زنانہ مکان میں بھی ایک امام باڑہ ہے اس میں زنانہ مجالس ہوتی ہیں۔ آپ کا گھر پاٹی گلی کے نام سے مشہور ہے۔ مکان سے ملحق جو گلی ہے وہ زمانہ شاہی میں پٹی ہوئی تھی۔ اس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ ہاتھی بآسانی گذر جاتا تھا۔ اس گلی کے کچھ آثار چالیس سال قبل تک باقی تھے۔ آپ کی زمینداریاں تحصیل سراتھو ضلع الہ آباد اور تحصیل کھاگا ضلع فتح پور میں تھیں ۱۹۲۸ء میں اپنے نانا سید محمد یوسف حسن تعلقدار ساکن قصبہ مصطفے آباد تحصیل سلون ضلع رائے بریلی کے انتقال کے بعد ان کے تعلقہ کے بھی مالک ہو گئے کیونکہ ان کے نانا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔

آپ کا ذاتی کتب خانہ قابل قدر ہے جس میں کئی ہزار کتابیں مطبوعہ اور قلمی موجود ہیں جن میں اکثر ایسی کتابیں بھی ہیں جو کمیاب اور نایاب ہیں پاکستان و ہند کے اکثر ریسرچ اسکالر آپ سے رجوع کرتے ہیں۔ آپ کو کتابوں سے مثل اپنی اولاد کے عشق ہے۔ ہر اچھی کتاب خریدنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ آپ سے ہندوستان کے مختلف صوبہ جات اور اضلاع کے اہل علم وادبا پڑھنے کے لئے کتابیں لے جاتے ہیں۔ کتب خانہ میں ہر صنف (علاوہ ناول وقصص) کی تاریخی اور ادبی کتب موجود ہیں۔ جن میں علاوہ ہندوستان، پاکستان، حجاز، عراق، ایران، مصر، کشمیر وغیرہ کی بھی مطبوعہ کتابیں ہیں۔

مقامی تاریخ پر بہت وسیع نظر رکھتے ہیں۔ رفیع ایک آسودہ اور مطمئن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والدین کے اکلوتے فرزند ہیں۔ انتہائی ناز و نعم اور لاڈ پیار سے پرورش پائی ہے۔ ایسے بچے بیشتر عیش پسند اور لہو و لعب میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن یہ (ایام طفلی) میں بھی ان چیزوں سے دور رہے۔ اب تک ان کی یہ حالت ہے کہ اگر الٰہ آباد، لکھنؤ اور کانپور وغیرہ جاتے ہیں تو علما اور ادبا کے گھروں میں اور کتابوں، دکانوں اور اخبارات کے دفتروں یا کتب خانوں میں اپنا وقت گذارتے ہیں۔

رفیع نے بچپن میں گھر ہی پر ایک ذی استعداد مولوی (عبدالغفور) سے فارسی اور اُردو کا اور ایک پنڈت سے ہندی کا درس لیا بعدہٗ انگریزی کی تعلیم ماڈرن ہائی اسکول الٰہ آباد میں پائی۔ دوران تعلیم ہی میں تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ الٰہ آباد و لکھنؤ کے اطبا اور ڈاکٹروں نے دق کی تشخیص کی۔ والدین نے تعلیم ترک کرا دی تو رفیع نے گھر پر ہی علمی مشاغل شروع کر دیئے اور اخبارات و رسائل میں مضامین بھیجنے لگے ایک دن کچھ لکھ رہے تھے کہ والد آ گئے انہیں لکھتے دیکھ کر بہت ناخوش ہوئے۔ "دو رُہا یہ جب بھی دیکھتا ہوں لکھتے پڑھتے ہی پاتا ہوں۔ اسی وجہ سے تمہاری صحت خراب ہو گئی ہے آئندہ سے احتیاط رکھو۔"

رفیع کو اپنا وطن بہت عزیز ہے اور اس عالم کس مپرسی میں بھی حالِ وطن سے ہمکنار رہیں۔ کبھی کڑا میں اور کبھی مصطفےٰ آباد میں قیام رہتا ہے۔ باوجودیکہ ان کی واحد بہن پاکستان میں ہیں اور وہ ان کو بہ اصرار بلاتی ہیں

لیکن وہ ہجرت نہیں کرتے کہتے ہیں کہ بزرگوں کی قبور اور مساجد دامامباڑے دوسروں کے رحم وکرم پر مجھ سے چھوڑے نہیں جاتے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔ وحید الہ آبادی

رنگین وحید کا تھا وہ عنوانِ شاعری
آراستہ کیا تھا گلستانِ شاعری
اِک دہ میں کر لیا تھا وہ سامانِ شاعری
آباد ہو گیا تھا بیابانِ شاعری
عالم تحیر میں دیدۂ حیراں سے اے وحید
ہمعصر دیکھتے تھے تری شانِ شاعری
اشعار ہیں نمونۂ مشّاقیٔ سخن
مظہر ترے کمال کا دیوانِ شاعری
طبع رواں ہے یا کوئی دریائے نور ہے
ہے لفظ لفظ گوہرِ عمانِ¹ شاعری
گلزار کا ہے صفحۂ قرطاس پر گماں
پھولوں سے ہے بھرا ہوا دامانِ شاعری
شاہد زبانِ حال سے ہے نغمۂ سخن
منہ میں زباں ہے بلبلِ بستانِ شاعری
اوستاد کا یہ فیض ہے یا زورِ طبع ہے
آتش کے رنگ میں ترا عنوانِ شاعری

¹ ایک شہر کا نام ہے جہاں گوہر پیدا ہوتے ہیں۔

قرباں بہارِ شعر ہے طبعِ لطیف پر
نازک خیالیاں ہیں تری جانِ شاعری
سوزِ دروں نے باغِ سخن میں لگائی آگ
پھولا پھلا نہ پھر چمنستانِ شاعری
دردِ دل و جگر نے کئے حوصلے فنا
سینے میں گھُٹ کے رہ گئے ارمانِ شاعری
کہتا ہے صدقِ دل سے ترا ہم وطن رفیعؔ
جادو نگاریاں تھیں تری جانِ شاعری

عجب ہے کہانی عجب، ہے فسانہ
سناؤں اگر تاب لائے زمانہ
شریف ایک بانکا سپاہی تھا میرا
سپاہی تھا گیا ایک بھائی تھا میرا
وہ تھا اپنی مادر کا اکلوتا بیٹا
یہی تھا ضعیفی کے اس کے سہارا

رفیعؔ

آپ مولوی عطاء اللہ فاروقی کے بیٹے اور مولوی وحید الدین احمد

کے سگے چچا زاد بھائی تھے۔ انہوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم ابتدائی دور میں مولوی صدرالدین ساکن نارہ ضلع الہ آباد سے حاصل کی جس کی تکمیل فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی۔ اس کے بعد وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اوّل آئے۔ ذہین، طباع اور فہیم شخص تھے۔ امتحان میں اوّل درجہ میں کامیاب ہونے کے وقت کا ایک بہت اہم واقعہ مشہور ہے۔ جب سند ملتے وقت آپ کا نام چپراسی نے پکارا تو آپ کے بڑھنے پر چپراسی نے روک دیا اور کہا کہ تمہیں نہیں بلایا جا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صاحب موصوف معمولی لباس میں روئی کا ایک موٹا سا دگلا پہنے ہوئے تھے، کسی کو گماں بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ اوّل درجہ میں کامیاب ہونے والے رفیع الدین ہیں۔ لکھنؤ اس وقت لباس وضع قطع کے اعتبار سے ہندوستان کا پیرس تصور کیا جاتا تھا۔ اس واسطے اس شکل و ہیئت کا آدمی وہ بھی وکالت میں اوّل درجہ میں کامیاب ہونے والا ایک عجوبہ معلوم ہوتا تھا۔ بہرکیف چپراسی سے کافی بحث اور منت سماجت پر انہیں اندر جانے دیا۔ سند دیتے وقت ججوں نے دریافت کیا کہ اب تک کہاں تھے انہوں نے کہا کہ چپراسی آنے ہی نہیں دے رہا تھا آخر میں کیسے آتا۔

مولوی رفیع الدین کالے رنگ، لمبے قد کے نہایت پاک طینت نیک مزاج انسان تھے۔ معاملے کے بہت صاف تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں وکالت شروع کی اور پہلا مقدمہ ایک طوائف کا ملا۔ ان کی وکالت بہت چمکی اور اتنی آمدنی ہوئی کہ اپنے تمام غریب اعزا و اقربا کو تنخواہیں اور سرمائی و گرمائی کپڑے

دیا کرتے تھے۔ داد و دہش میں کبھی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ بڑے متشرع اور علم دوست تھے۔ آخر عمر تک عربی مدرسہ کے پانچ طلبا کا کھانا کپڑا دیتے رہے۔ ان کی داد و دہش سے متعلق ایک واقعہ بہت مشہور ہے جو نقل کیا جاتا ہے

ایک بار لکھنؤ میں مکان کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے، نیچے ایک مسخرہ گزر رہا تھا اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا کہ ایک کالا شخص بیٹھا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے سوچا کہیں یہ کوئی جملہ نہ چست کر دے ایک روپیہ چاندی کا پھینک دیا۔ مسخرے نے روپیہ اٹھا لیا اور اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوا اگرچہ کالا ہے مگر بیٹ سفید کرتا ہے" اس پر مولوی صاحب ہنس پڑے اور خود آکر انہوں نے یہ لطیفہ گھر میں سنایا۔

مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے آپ کو بڑی گہری عقیدت تھی شروع شروع لکھنؤ میں مولانائے مغفور سے ملاقات کا ایک عجیب و دلچسپ واقعہ خاندان میں چلا آتا ہے۔ ایک بار مولانا لکھنؤ تشریف لائے۔ مولوی رفیع الدین کو اس کا علم ہوا انہوں نے کھانے پر مدعو کیا۔ مولانا نے دعوت سے عذر کر لیا اور استفسار پر وجہ یہ بیان کی کہ میں وکیلوں کی دعوت پسند نہیں کرتا اتفاق سے ایک روز مولانا پینس پر تشریف لے جا رہے تھے دوسری طرف سے مولوی رفیع الدین کی سواری بھی پینس پر آ رہی تھی۔ مولوی رفیع الدین کی شریف نیک اور متین شکل و شباہت دیکھ کر مولانا نے اپنی پینس روکنے کا حکم کہاروں کو دے دیا مولوی صاحب نے بھی اپنی پینس دوسری جانب رکوا دی۔ اور

دونوں ایک دوسرے کی سمت بڑھے قریب آکر اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا۔ لیکن معاً ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا کہ میں وہی رفیع الدین ہوں جس کی دعوت سے آپ نے انکار کیا ہے۔ میں ایسا گنہگار شخص آپ سے ہاتھ کیسے ملاؤں۔ یہ سن کر مولانا نے فرمایا کہ نہیں میں آپ کو سمجھا نہیں تھا۔ اور میں ضرور آپ کے یہاں آؤں گا۔ لعدۂ مولانا نے مولوی صاحب کے یہاں جا کر کھانا بھی کھایا اور ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

آپ کو تصنیف و تالیف سے بہت دلچسپی تھی۔ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے آپ نے "سہیل یمن" ایسی مشہور تصنیف کو جنم دیا۔ اُردو فارسی دونوں زبان کے شاعر تھے۔ آپ صلحا۔ شعراء۔ صوفیاء۔ علماء۔ ادبا۔ غرضیکہ ہر جماعت میں ہمیشہ ممتاز و نمایاں رہے۔

رفیع الدین صاحب کا فارسی کلام "سہیل یمن" (ان کی مشہور و معروف کتاب) سے نقل کر کے ناظرین کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ اردو کلام کا کوئی نمونہ مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

"حمد"

ثنا ہا میکنم باطرز نو ایجاد یزداں را
کہ از ہر موئے تن سازد رواں دریائے عرفاں را
نباشد گوش کو ذوقِ سخنہائیش نمیدارد
ندانم لب اگر گویا نشد تسبیح سبحاں را

درون کعبہ و بت خانہ یکساں جلوہ ہا دارد
نہ را ہ مختلف ہا خود کشد گبر و مسلماں را

بباطن رشتۂ زنار و در ظاہر بود سبحہ
زنیرنگی بہ یک جا جمع سازد کفر و ایماں را

چو شد حسن ازل جلوہ فگن در صورتِ آدم
ز بیب عشق مسجودِ ملایک کرد انساں را

بداں را با نکوکاراں ز فیض عام خود بخشد
بزیر سایۂ گل پرورد خارِ مغیلاں را

چو رنگ و بوے گل از رنگ و بوی او اثر دارد
بود صد داستاں حمد از مرغ خوش الحاں را

ز شکر نعمت حق آب در ہنگہ گر کند حاصل
چہ نسبت بالب انساں بود لعل بدخشاں را

فلک را گر دہد پیرایش از مہر و مہ و انجم
دہ عکسش لالہ و نسریں و گل بخشد گلستاں را

چو خود از کلک نقاش ازل یک نقش موہوم
چہ سازم گر نگیں نام او سازم دل و جاں را

رفیع از حمد ایزد کے تواند یک سخن گفتن
کہ از ایمای کن انگندہ طرح کاخ امکاں را

"نعت"

سرور انبیاء شدی مظهر کبریا شدی
بوالعجبم چگونه شد بنده و هم خدا شدی
جان و تنم فدای تست این دل دریده جای تست
در سر من هوائے تست تا بمن آشنا شدی
سید هاشمی نسب رحمت عالمین لقب
مظهر عام و خاص رب در صفت انبیاء شدی
هر دو جهان برائے تو قدر و قضا زرای تو
چون نه فتم بپائے تو خواجه دو سرا شدی
حسن ملیح تو تنها شور فگند در سما
از دل زار من مپرس بهر چه مبتلا شدی
مست ز بوی تو صبا چون ندرود گل قبا
محشر تازه شد بپا تا ز چمن جدا شدی
نشو و نمای خلق را بود وجود تو بنا
زین نگاه اهل حق جام جهان شدی
کشتهٔ تیغ ابروم بستهٔ موی گیسوم
بی تو بخاک و خون طپم عیسی من کجا شدی
نیست خطر پئ رفیع ذات تو هست اگر شفیع
ز انکه برائے دیگران نثار صدر جا شدی

گل را برای نقش و نگار آفریده اند
گل را برای زیب بهار آفریده اند
از بهر صوت و نغمه هزار آفریده اند
در جبر تم مرا بچه کار آفریده اند

دست رفیع بهر خدا ناخدا بگیر
در ورطه ایم و باد مخالف وزیده است

سنبل و گل را پئے زیب گلستاں ساختند
بلبل دیوانه را ناحق پریشاں ساختند
خاماں آواره شد مجنوں برائے یک نظر
حسن لیلی را عبث در پرده پنہاں ساختند
مفت پروانه در آتش جاں خود برباد کرد
شمع را گر بہر تنویر شبستاں ساختند
در قفس بنمم ره صیاد بے پروائے خویش
ہمچو مرغ نو گرفتارم پریشاں ساختند
ہر طرف در حسرت نیم نگہ عشاق را
طائر بسمل صفت برخاک غلطاں ساختند

عاشقان کز کفر و ایمان دست بردار آمدند
سینه را آماجگاهِ تیر و پیکان ساختند
شرطِ آدابِ عبودیت بنا شد در مزدن
زین سبب اربابِ معنی را خموشان ساختند
جنت و دوزخ بحق دیگران باشد رفیع
ملالبانس هر دو را بر طاقِ نسیان ساختند

از دیر و کعبه درگذر و مست شو رفیع
آموخت پیرِ مےکده ایمانم این چنین

در حضورِ خود طلب فرما رفیعِ خسته را
تا کجا دربند باشد با دلِ زار و حزین

روز و شب خورشید و مه در طاعتش حلقه بگوش
آستانِ حضرتش بالائے چرخِ چارمین

رضا

میرزا علی رضا نام رضاؔ تخلص تھا۔ آپ کے حالات سے زیادہ آگاہی نہیں ہو سکی صرف ایک غزل کا مقطع دستیاب ہو سکا ہے جو درج ذیل ہے۔[1]

خودنمائی کا اگر ذوق ہے تجھ کو پیارے
بس رضاؔ اپنے کو دکھلا دے بہار دامن

رضی

سید رضی اکبر نام رضیؔ تخلص۔ آپ سید رضا اکبر کے فرزند ارجمند ہیں۔ سکونت محلہ قصبیانہ میں ہے آپ کے مورث اعلیٰ سید ابوالخیر جن کی اولاد میں بندگی شاہ فرید کانی نامی گرامی گذرے ہیں کڑے میں اقامت گزیں ہوئے تھے آپ کی دادی میر پرورش علی سخیؔ جیسے ادیب شہیر کی بھتیجی تھیں۔

رضیؔ کی ولادت ۳ رفروری ۱۹۱۱ء کو سیدواڑہ محلہ رسول پور الٰہ آباد میں ہوئی۔ وہاں اپنے چچا محمد شریف اور محمد شفیع صاحبان کے ساتھ مقیم رہے۔ اور انہیں کے سایۂ عاطفت میں رہ کر آپ کی تعلیم و شاعری پروان چڑھی۔ ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے کیا۔ اور اس کے بعد ایجی

---

[1] عمدہ منتخبہ یعنی تذکرۂ سرور مصنفہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرورؔ مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ ۱۹۶۱ء

آفس میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۹ء میں ایل ایل بی کا امتحان ——— کامیاب کیا۔ مگر وکالت نہ کر سکے اور ملازمت کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانان ہند جذبۂ قومی و ملی سے سرشار ہو کر پاکستان آ رہے تھے تو رضی بھی پاکستان آ گئے اور ۱۹۶۱ء میں پنشن لے کر وکالت شروع کی۔ اس طرح وہ خوابیدہ تمنا جو سالہا سال پردۂ خفا میں تھی تکمیل کو پہنچی۔ کراچی کے وکیلوں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ قیام ۳۲/۱۵۸ بی سیکشن لالوکھیت میں ہے۔

آپ کے چچا محمد شریف صاحب شاعر و طباع تھے جنہیں میر عباد علی نیاز سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شریف کے یہاں شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ جس کا اثر رضی کی زندگی نے بھی قبول کیا۔ اور بچپن سے ہی شعر کہنے لگے۔ میر، غالب، اقبال، صفی، انیس اور جوش سے بہت متاثر اور ان کی شاعری کے مداح ہیں۔ مشق سخن نے آپ کو اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا کہ اساتذہ کی محفلوں میں جی کھول کر غزلیں سنائیں اور داد حاصل کرنے میں تنگ دامانی کے شاکی رہے۔ اب مشاعروں سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ دوستوں کے اصرار پر کچھ نہ کچھ اب بھی سنا دیتے ہیں۔ ابتدا میں غزلیں لکھیں اور اب رہوار طبع کی باگ نعت و منقبت کی سمت موڑ دی ہے۔ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھایا ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

دل چاہتا ہے بزم کی غمگیں ہو فضا اور
اسے مطرب دل سوز ذرا لے تو بڑھا اور

باقی ہی رہی تشنگیٔ ذوقِ نظارہ !
جتنا وہ سنورتے گئے نظروں نے کہا اور
برداشت کئے جاتا ہوں جتنا ہیں خوشی سے
٥ گرتی چلی جاتی ہے رضیؔ برقِ بلا اور

آئینہ دیکھ کے انگڑائی لی   کیا مردِ ذوقِ نظر یاد آیا

شاید ترے نفس میں ہے روحِ نسیمِ صبح
دل کی کلی کو جس نے گلستاں بنا دیا
٦ شبنم نہیں ہے نالۂ بلبل کے درد نے
سارے چمن کو دیدۂ گریاں بنا دیا

اقتباسات از نعت و منقبت

حدِ امکاں سے ہے آگے نفسِ یزداں کا جواب
جس طرح نحوِ بشر سے باہر ہے قرآں کا جواب
ہاتھ میں ہیرے ہے خاکِ زیرِ پائے مصطفےٰؐ
اے مسیحا لے یہ اپنے سارے درماں کا جواب

ہر جزو و کل کی غایتِ اولیٰ تم ہی تو ہو
آفاق کی حقیقتِ کبریٰ تم ہی تو ہو

پائی تمہاری وجہ سے محفل نے زندگی
ارض و سما کی جانِ تمنّا تم ہی تو ہو

تم لفظ کُن کی رُوح ہو کون و مکاں کی جان
تخلیق کائنات کا منشا تم ہی تو ہو

منزل تمہاری وہ جسے منزل نہ کہہ سکوں
وقت و مکاں کی قید سے بالا تم ہی تو ہو

جو وقت کی جبیں پہ ہے اک نقشِ جاوداں
تاریخ کی زباں کا وہ دعویٰ تم ہی تو ہو

تم کو بنا کے جھوم اُٹھا نازِ کبریا
شہکارِ فنِ صانعِ یکتا تم ہی تو ہو

ساقی جو آیا نور کی مینا لئے ہوئے
لپکے نجوم جامِ ثریا لئے ہوئے
دوڑے سرورِ ش ساغرِ طوبیٰ لئے ہوئے
آئے مسیحؑ و خضرؑ تمنا لئے ہوئے

ہر جُرعۂ شراب تھا کیفِ ارم لئے
رِندان نے بڑھ کے آنکھوں پہ نقشِ قدم لئے

آنچل سٹا جو رات کا نکلا نگار صبح
اپنے عروج ناز پہ تھی نو بہار صبح
تاروں کا رس پئے ہوئے تھی آبشار صبح
تنویر کی تھی روح کہ تھا سیم زار صبح
ہر سمت تھا نور رحمت داور بسا ہوا
تھا ذرہ ذرہ جسم سمن بر بسا ہوا

رونق

۲ محمد اسحاق فاروقی نام رونق تخلص کرتے ہیں سنہ ۱۹۶۳ء میں آپ کا مجموعۂ کلام بعنوان "عروش جرس" ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور سے شائع ہوا ہے جس میں "مختصر حالات مصنف" کے عنوان سے سید مختار حسن لکھنوی بی اے ایل ایل بی (علیگ) نے آپ کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ حالات بہت جامع ہیں اس لئے اس تحریر کا اقتباس یہاں نقل کر دینا زیادہ مناسب ہے۔

"خطاب علامہ۔ نام نامی محمد اسحاق نسبت فاروقی تخلص رونق۔ ولادت باسعادت سنہ ۱۹۱۲ء میں تاریخی مقام کڑا[1] ضلع الہ آباد میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب خلیفہ دوم امیرالمومنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ اجداد با مولوی محمد اسمٰعیل عہد اکبری میں ملک عرب سے وارد سرزمین ہند ہوئے

---

[1] تاریخ کڑا مانک پور مصنفہ عبداللہ نفیس کے مطابق عہد ہمایوں میں (مولف)

اور مدد بار سے حصول جاگیرات کے بعد اس متبرک وجود نے موضع اسمٰعیل پور نواح الٰہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ پدر والا گہر مولوی سجاد حسن سجادؔ مرد سخن طراز اور جد امجد مولوی رفیع الدین رفیعؔ سرمدآور وہ وکیل شہر لکھنؤ نامور شاعر و نثر نگار مصنف عالی مرتبت تصنیف سہیل یمن سے تھے جد امجد کے حقیقی برادر عم نژاد سخنور نادار یگانہ روزگار بلبل ہند مولوی وحید الدین وحیدؔ تھے جن سے حصول فیضان کے بعد لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم زمرۂ مشاہیر میں اکبر الہ آبادی کہلائے۔

ابتدائی تعلیم وطن مالوف دستظ الرا میں قدیم سکے اردو پرائمری مدرسے میں پائی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے ہائی اسکول اگزامینیشن اور گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ بعد میں الہ آباد یونیورسٹی سے امتیازی ڈگری حاصل کی اور متواتر دوبارہ انڈین سول سروس اور ایک بار انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے امتحانات مقابلہ میں شرکت کی۔ لیکن غیر معمولی ذہانت و مسلّم علمی استعداد کے باوجود قدرت مجبر المقدرل نے سر کامیابی کا سہرا نہ بندھنے دیا۔ اور ہر بار انٹرویو کے نمبروں کی قلت کے باعث ناکام رہے پے در پے ناکامیوں نے دل پاش پاش کر دیا اور قوت پرواز سلب کر لی۔ آخر کار الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے ضلع کچہری الہ آباد میں وکالت شروع کی۔

۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب سے متاثر ہو کر ہجرت پاکستان کا منصوبہ باندھا اور سیلاب مظلومیت کی رو میں وارد صدر مقام کراچی ہوئے جہاں آٹھ

ماہ کا دفعہ کس مپرسی میں قہر درویش بر جان درویش گذار کر لاہور تشریف لائے۔ ضلع کچہری لاہور میں وکالت کا آغاز کیا اور اب ماشاء اللہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ لاہور میں وکالت کرتے ہیں۔ ابھی حال میں سپریم کورٹ کے ایڈووکیٹ بھی ہو گئے ہیں۔

شاعری بھی ورثے میں ملی تھی اور پرورش و پرداخت بھی گہوارۂ سخن و شعر میں ہوئی تھی چنانچہ شعر و سخن کا جذبہ کم سنی ہی میں کارفرما ہوا۔ شاعری کا آغاز آٹھ سال کی عمر سے ہوتا ہے۔ پہلا شعر جو اس کم عمری میں زبان معجز بیان پر آیا یہ تھا۔

باغ میں جاتا ہوں تو ہنستی ہیں کلیاں دیکھ کر
عشق نے تیرے مجھے بدنام و رسوا کر دیا

صغر سنی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

تم جو آجاؤ تو اُمڈے دل میں آجائے بہار
ہو ہرا نخل تمنا خشک ہو جانے کے بعد۔

افسوس کہ شاعر جدت پسند نے کم سنی کی (۸۰) غزلیات اس وقت دریا برد کر دیں جب شفیق عم بزرگوار استاد العصر مولوی ضیاء الدین فخر الہ آبادی مدظلہ العالی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور فاضل استاد کی خدمت میں منجملہ سات غزلیات کے پہلی غزل برائے اصلاح پیش کی۔

رونق بہت پرگو اور خوش گو شاعر ہیں۔ آپ کا کلام شاعرانہ محاسن سے مملو ہے جس میں آمد سلاست روانی۔ جوش، اصلیت اور جذبات کی عکاسی

بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ایک بار آپ نے "پانچ پیغمبرانِ غیب" کے عنوان سے ایک نظم شائع کرائی تھی۔ جس میں رومیؔ، سعدیؔ، میرؔ، اقبالؔ اور رونقؔ تھے۔

آپ کی شادی محمد حسین بیرسٹر الہ آباد ہائی کورٹ کی عزیزہ سے ہوئی تھی مگر طلاق ہو گئی۔ اس وقت آپ نے ایک نظم "خونِ آرزو" کے عنوان سے لکھی تھی جو آپ کی معرکۃ الآرا نظم تصور کی جاتی ہے۔ آپ کی دوسری شادی حکیم تدبیر حسن دارانگری (ضلع الہ آباد) سے ہوئی جن سے ماشاءاللہ اولادیں ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے ریڈیو پاکستان لاہور میں خبریں پڑھتے ہیں۔

آپ کی شاعری میں فکر انگیز پہلو بہت ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی شاعری عام روش سے مختلف ہے زبان اور بیان کے چٹخارے آپ کے کلام میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ آپ ایسے قادر الکلام شاعر ہیں کہ فارسی تراکیب کو اردو کے قالب میں ڈھالنا صرف آپ ہی کا کام ہے۔

مزاج کے اعتبار سے بھی آپ عام لوگوں سے مختلف ہیں اسی باعث اکثر لوگ آپ سے گفتگو میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔

آپ کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

پسِ قتل دامن کا خون دھونے والے
خبر ہے تجھے نیم جاں رہ گئے ہم
فسانہ رہائی کا چھیڑا تو ایسا
قفس لے اڑے ناتواں کہتے کہتے

نعش قفس نصیب پہ کہتی ہیں بے زبانیاں
آج سے ختم ہو گئیں درد بھری کہانیاں

مری موت ہی مجھے کیا بُری جو اٹھاؤں منت زندگی
ہیں خضر نہیں کہ دو روزہ عمر کو چاہوں عمر دراز ہو

پس پردہ جا کے صدا مری یہی مانا دل میں اُتر گئی
تھا مزہ تو جب کہ وہ آپ بن کے جواب آتے جواب میں

وہ تبسم حالت بیمار ہجراں دیکھ کر!
مرنے والا جی اُٹھا انداز درماں دیکھ کر
گھات میں تیری رہا غارت گر حسن جہاں
راہ چلنی تھی تجھے عمر گریزاں دیکھ کر
صد حیات جاوداں اور ایک مرگ ناگہاں
پھیر لینا تھا خضر منہ آب حیواں دیکھ کر
کیسی رونق حسرت پرواز ہوئے گلستاں
پست ہمت ہو چکی دیوار زنداں دیکھ کر

محبت میں یہی تیرا یہی میرا فسانہ ہے
ترا خاموش ہو جانا مرا برباد ہو جانا

لے گیا شیریں کو بھی سیلاب خون کوہکن
مختصر چھینٹیں لہو کی موجِ دریا ہو گئیں
یاد ہیں خلوت کی بے پردہ ملاقاتیں ہمیں
ہاں مگر اب وعدۂ امروز و فردا ہو گئیں

کرو نظارۂ وحشت اٹھاؤ پردۂ محمل
بہار چاک دامان و گریباں دیکھتے جاؤ

جلوہ گر تم کو جو ہم محفل کے اندر دیکھتے
شمع بن کر دیکھتے پروانہ بن کر دیکھتے
دیکھتے اک بار وہ ہم کو تو سو سو بار ہم
ایک صورت اپنی صورت کی بنا کر دیکھتے

کچھ قفس ہی میں نہ بلبل کے شریک غم رہے
ہم گلستاں میں بھی گریاں صورت شبنم رہے

اللہ اللہ اپنے دیوانوں سے اتنا بدگماں
دیکھتا جاتا ہے کوئی قفل زنداں کی طرف

شوق ہے اُس غیرت لیلیٰ کی محمل کا اگر
پائے مجنوں سے گذر گرد بیاباں کی طرف

مرے دل کے نغمۂ درد میں مجھے ہوا جو مزا ملا
نہ صدائے ساز میں وہ ملا نہ صدائے چنگ و رباب میں

رہا رونق ان کے خیال میں تو مژہ کی چھوڑ کے چلمنیں
جو خراب کر کے نہ آئے پھر تری چشم خانہ خراب میں

وہ تلاش چشم سکندری وہ قضا کی عمر پہ پھبتیاں
کوئی قہقہہ تھا کہ گونجتا تھا سواد آب حیات میں

رہی دل میں حسرت دید ہی کبھی تم کو دیکھ سکے نہ ہم
نہ تم آئے بزم مجاز میں نہ ہماری کم نظری گئی

شاباش مری قسمت کے لکھے پھولوں میں مجھے راحت نہ ملے
جس راہ سے گذروں سوئے چمن اس راہ میں زنداں آجائے

اک عمر جو دل کے ساتھ رہی وہ آج بھی دل کے ساتھ رہے
حسرت ہے کہ خاکِ حسرت بھی خاک سر مدفن ہو جائے

دکھا دوں حسنِ نماز، ذوق کہاں ہے محراب تیغ قاتل
ہزار میں انتخاب سجدہ مری جبینِ نیاز میں ہے

"خونِ آرزو"

سبق دے کر خموشی کا نوا نا آشنا کر کے
مرے سازِ طرب کو انجمن میں بے صدا کر کے
مجھے پامالِ غم کر کے ، اخونِ وفا کر کے
بھلا کر یاد میری حق محبت کا ادا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

نہ ہونے پایا اک دن غنچۂ دل سرخرو میرا
چمن زارِ محبت رہ گیا بے رنگ و بو میرا
رہا اُجڑا اپھلا پھولا نہ نخلِ آرزو میرا
بہارِ گل کی آمد کو خزاں کا ماجرا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

جہاں میں سے کے دردِ عشق میں جانا خراب آیا
جو میرے ساتھ غم آیا غموں میں انتخاب آیا

محبت میں نہ دن کو چین راتوں کو نہ خواب آیا
جو پایا تو یہ پایا جان و دل تم پہ فدا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

محبت لوح دل پر نقش بھی ہے سے نشاں بھی ہے
تمنا راز غم بھی ہے تمنا رازداں بھی ہے
وہی ہے مہر خاموشی وہی طرز فغاں بھی ہے
مرے سینے میں ٹکڑے دل مرا حسرت بھرا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

جو خون روئے غم منزل میں وہ ناکام منزل ہوں
بیابانِ طلب میں پا شکستہ رہرو دل ہوں
بگولہ نجد میں ہیں یادگار شوق محمل ہوں
سرِ راہ وفا نکلا تھا تم کو رہنما کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

شب تاریک ہجراں میں نہ ہو کر شمع رو آئے
نہ شام وصل میں بن کر چراغ آرزو آئے
گیا جس دن سے پردہ پھر نہ پھیرے روبرو آئے
غم دیدار دے کر مائل آہ و بکا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

حوادث میں اسیر حلقۂ گرداب مشکل ہوں
کبھی ڈوبے کبھی اُبھرے جو وہ محروم ساحل ہوں
ہیں طوفاں خیز دریا ہیں شکستہ کشتیٔ دل ہوں
محیط عشق میں موج فنا کو نا خدا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

دل آزردہ کو درس طرب دن رات دیتے تھے
نگاہوں سے اُمید لطف کی سوغات دیتے تھے
تبسم تھا وہ دولت جس کی تم خیرات دیتے تھے
مرے کاسے کو خالی کاسۂ دستِ گدا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

جفا کی شرمساری نے وفا کے پاس نے روکا
ستم کی آہ پیہم نے کرم کی آس نے روکا
دلِ مجبور نے روکا نگاہِ یاس نے روکا
نہ روکے رُک سکے تم التجا پر التجا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

میں ہنگامِ فغاں لب پاس رسوائی سے سیتا ہوں
اُمنڈتے ہیں جو آنسو آنکھوں ہی آنکھوں میں پیتا ہوں
پڑی ہے کشمکش میں جاں نہ مرتا ہوں نہ جیتا ہوں
تمہارا باوفا دونوں ہوں اپنا مبتلا کر کے
نگاہیں پھیرے جاتے ہو مجھے بے آسرا کر کے

ریاضؔ

شیخ ریاض الحسن ریاضؔ اظہر حسن عرف الہٰی بخش۔ عثمانی کے فرزند ارجمند تھے۔ اپنے خاندان میں نامی گرامی شخص گذرے ہیں۔ اندرون بازار حویلی تمام عمر قیام رہا آپ عالم شباب میں بڑے قوی اور تندرست تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چمڑے کے جس پُرسے آب پاشی کے لئے دو بیل گھسیٹ کر پانی نکالتے ہیں وہ اپنے ایک ہاتھ سے کھینچ لیتے تھے۔ عالم جوانی کی قوت اور طاقت کے قصے آپ کے آج بھی اطراف واکناف میں زبان زد ہیں۔ اواخر عمر میں آپ علیل رہنے لگے تھے۔

شعر و شاعری سے آپ کو دلی لگاؤ تھا کوئی مکمل دیوان نہیں چھوڑا۔ البتہ چند غزلیں ملتی ہیں۔ ایک غزل اپنے چھوٹے ماموں بدر الحسن صاحب کی بیاض سے نقل کر کے لکھ رہا ہوں جو انہوں نے اپنے والد ریاض الحسن صاحب مذکورہ سے سن کر لکھی تھی۔ بدر الحسن ریاض الحسن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ آخر وقت میں ریاض الحسن ریاضؔ ان سے اکثر اوقات رات میں "گلستان سعدیؒ" اور "مثنوی مولانا رومؒ" پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ ریاضؔ قصبہ کے مشاعروں میں بڑے ذوق شوق سے حصہ لیا کرتے تھے۔ آپ کی چند مزاحیہ غزلیں بھی سنی گئی ہیں جن میں آپ اپنا تخلص چونکا کرتے تھے آپ کو مولانا وحید الدین وحیدؔ سے بڑی نیازمندی اور عقیدت دارادت تھی۔ اور وحیدؔ میاں کے اشعار اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ آپ کا نسب حضرت عثمانؓ

سے ملتا ہے۔ آپ کے جد امجد قاضی احمد محتسب عثمانی قطب الدین محمد مدنی فاتح کڑا کے ساتھ تشریف لائے اور یہیں قیام پذیر ہوگئے۔ آپ کے بزرگوں میں قاضی شمس الدین کے پوتے بدر جہاں جو آپ کے دادا محمد باقر اوّل کے دادا تھے۔ بڑے ذی علم، مخیر، درویش صفت فاضل اور بزرگ شخص تھے۔ بدر جہاں کا نام نامی اب بھی قرب و جوار میں کہانی قصوں میں سنا جاتا ہے آپ کا شجرۂ خاندانی تاریخ آئینہ اودھ کے صفحہ ۴۶ و تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۳۱۔ اور شجرہ عثمانی کڑا رشیدیہ کے صفحہ ۲۳ پر درج ہے انتقال ۱۹۱۴ء میں کڑا میں ہی ہوا اور آبائی قبرستان واقع موضع سلطان پور خواجہ کڑک عرف بھائی پور متصل کڑا میں دفن ہوئے۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

لکھوں میں وصف خلعت پروردگار کیا
رنگ بہار گل سے نہیں آشکار کیا
قابو میں دل نہ ہو تو کرے جان نثار کیا
منظور جب تجلی کو یہ ہے اختیار کیا
اگلی سی اب نہیں ہے وہ دلسوزئ فنا
دیکھو تو کل ہوئی مری شمع مزار کیا
اپنے گناہوں کا جو ابھی سے نہیں حساب
ہوتا ہے حال دیکھئے روز شمار کیا

امیدِ وصلِ یار کا کس منہ سے لوں میں نام
فرقت میں زندگی کا مجھے اعتبار کیا

رونے میں دن کو وہ بھی نہ ساتھ اپنا دے سکی
شبنم سے بڑھ کے ہوگا کوئی اشکبار کیا

میری نظر تو جانبِ در تھی میں کیا کہوں
گذری تھی میرے دل پہ شبِ انتظار کیا

مضموں کی اس کمر کے ہے بے فائدہ تلاش
پنہاں رہے جب تو ہوگا بھلا آشکار کیا

مضطر ہوں آج نالۂ بلبل سے باغ میں
پردہ میں گل کے خود ہی ہے وہ گلعذار کیا

آتی ہے یاد سرخی رخسار دمبدم
بے یار جائیے طرف لالہ زار کیا

بے طور تاک جھانک ہے تیرِ نگاہ کی
اس دم وہ پھر کریں گے کسی کو شکار کیا

داغِ جنوں میں پاتا ہوں اپنے میں تازگی
گلشن میں پھر ہے آمدِ فصلِ بہار کیا

اچھا نہیں ہے کھیلنا یہ روز کا شکار
جب صید ہی نہ ہوں گے تو ہونگے شکار کیا

جب خاک میں ملا دیا صدمے نے ہجر کے
اب آپ مجھ سے رکھتے ہیں دل میں غبار کیا
جاتا ہوں جب میں سینہ سپر ہو کے سامنے
تیغ نگاہِ یار کے ہوتے ہیں وار کیا
بلبل تجھے خزاں میں ہے کیوں اتنا اضطراب
گلشن میں پھر نہ آئے گی فصلِ بہار کیا
پہلو میں دل تھا جب تو مزا اور تھا ریاضؔ
تنہا اُٹھائیں اب ستم و ظلم یار کیا

ریاضؔ

سیّد ریاض احمد نام ریاضؔ تخلّص کرتے ہیں۔ آپ سیّد فیاض احمد ساکن محلہ قضیانہ کے فرزند ارجمند بڑے ذی علم۔ خدا رسیدہ۔ متقی پرہیزگار اور عابد شخص ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۰ سال کی بتائی جاتی ہے۔ اس طرح سنہ ۱۸۹۰ء کے کسی مہینے میں آپ کی ولادت قرار دی جا سکتی ہے۔

کڑا ہی میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر دسویں جماعت کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ اور انگریزی سے بھی خاطر خواہ واقفیت حاصل کر لی آپ گورے چٹے، وجیہہ شکل ہیں اور چہرے بشرے سے تقدس ٹپکتا ہے۔
انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ریلوے میں ملازم ہو گئے اور

اسٹیشن ماسٹر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ جبل پور۔ جہاں پور۔ فیض اللہ پور۔ اٹاوہ۔ دہلی۔ غازی آباد وغیرہ میں اسی سلسلہ میں تعیناتی ہوتی رہی۔ آپ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ آپ کے صاحبزادے نوری سعید نے آپ کے حالات زبانی بتائے ہیں جو نذر قرطاس ہیں۔ انہیں کے پاس آپ کی بیاض کی نقلیں ہیں جس سے نمونۂ کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ کے فرزندوں میں کسی کو ادبی ذوق و شوق نہیں ہے اور صرف تبرک کے طور پر اپنے والد کا کلام رکھتے ہیں۔

بیاض سلسلۂ نقشبندیہ میں پیر سید نجم الدین شاہ فتح پوری سے بیعت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرید ہونے کے بعد آپ نے بارہ سال کا چلہ کیا۔ اور ۹ سال بغیر دانہ کھائے ہوئے گذارے۔ سحری اور افطار چائے سے کرتے تھے اور جب چلہ مکمل کر لیا تو گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ابھی تک قیام فتحپور ہی میں ہے۔ مریدین کثیر تعداد میں اکتساب فیض کرتے ہیں۔

شاعری سے بہت شوق ہے۔ کلام عارفانہ اور صوفیانہ ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو جو بیاض بغرض انتخاب دی گئی تھی اس میں ٹھمری، غزل، نظم، نعت وغیرہ کافی تھیں۔ اس کا انتخاب درج ذیل ہے۔

نعت نبیؐ میں شعر جو منہ سے نکل گیا
خرمن مرے گناہوں کا فی الفور جل گیا

ہوتا ہے دل میں درد محبت کچھ اس طرح
جیسے کوئی کلیجہ کو میرے مسل گیا

قسمت کی ہے خطا نہ مقدر کا ہے قصور
جب تم بدل گئے تو زمانہ بدل گیا

لگی تو ہے اب دل میں پاؤں مدینہ
کسی طرح سے اُڑ کے جاؤں مدینہ

کروں پہلے میں حمد مسرور ہو کر
خدا کی محبت میں مخمور ہو کر

ادب سے قلم لکھ تو پھر نعت احمد
کہ ہر لفظ شاہد ہو منصور ہو کر

دین حق پہ جو مرا واللہ وہ آزاد ہے
سب مرادیں مل گئیں حاصل سعادت ہو گئی

نبیؐ کے در پہ پڑا رہوں گا پڑے ہی رہنے سے کام ہو گا
کبھی تو قسمت کھلے گی میری کبھی تو میرا سلام ہو گا

مرحبا صلے علیٰ خیر البشر آنے کو ہے
رحمۃ اللعالمین نور نظر آنے کو ہے

کھلکھلا کر ہنس پڑیں کلیاں تو گلچیں نے کہا
خوشنما ارماں میں اُلفت کا ثمر آنے کو ہے

اندوہ غم سے یا رب دے مجھ کو رستگاری
لطف و کرم سے اپنے کر میری غمگساری

بہار گلشن ہستی میں خوشبو ہو کے پھولوں میں
نگار حسن و خوبی کو شعور انس و جاں پایا

کیا جانے کہاں کھو گئی تحریر ہماری
یا جا کے کہیں سو رہی تقدیر ہماری

جلوہ خدا کا دیکھا مولیٰ تری گلی میں
کعبہ تری گلی میں قبلہ تری گلی میں
عالم میں دھوم تیری بخشش کی ہو رہی ہے
نعمت جو بٹ رہی ہے شاہا تری گلی میں
کون و مکاں میں پھر کر آخر یہ آمن تیرا
دل میں تجھی کو لے کر آیا تری گلی میں

کتاب چھپنے کے لئے جا رہی تھی کہ معلوم ہوا کہ آپ کا انتقال ہو گیا اور فتحپور ہندستان میں دفن ہوئے۔

زار

سید عبدالحکیم نام زار تخلص تھا۔ آپ کا شمار ارباب علم وفن میں تھا آپ کے پاس اپنا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں عربی و فارسی کی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ تھا۔ آپ مولوی محمد عسکری ندیم کے برادر حقیقی اور سید محمد ماہ رئیس کے فرزند تھے میر محمد ماہ قبل غدر باندہ شہر میں شہر کوتوال اور فیل نشین تھے ان کا سلسلہ نسب سید جلال الدین بخاری سے ملتا ہے۔ غدر کے بعد منجانب ایسٹ انڈیا کمپنی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے اور گورنمنٹ کی خیر خواہی کے سلسلہ میں ضلع رائے بریلی میں علی پور جکرائی کا تعلقہ حاصل کیا۔ آپ نے زمانہ ملازمت میں ایک عالیشان کوٹھی اور ایک محل بنوایا تھا۔

بڑے منکسر المزاج۔ خلیق اور غربا پرور تھے۔ تعطیلات میں ان کے یہاں دوست احباب کا بڑا جمگھٹا ہوتا۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہوتی تھیں شطرنج گنجفہ تاش، پچیسی، مشاعرے ہر طرح کی تفریحات سے شوق اور شعر کہنے کا بہت ذوق تھا۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

آپ کے پانچ فرزند احمد شفیع۔ محمد محسن۔ محمد احسن۔ محمد سلیمان اور ولی حسن تھے جو اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہ کر اس عالم فانی سے کوچ کر گئے۔

"دیوان غریب" کے صفحہ ۱۹۹ سے چند اشعار ونتخاب ہوئے ہیں، جو ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

تا بہ پائے نگار دسترس است

این قدر هم بس است کہ ہوس است
زُلف ہا روئے دلپشت او ، نمود
شمع یکساں بہ بہیں زپیش ویس است
ہست سرگرم و محو شب گردی
شانۂ زلف او مگر عس است
کیمیائے وصال می خواہد
دل صد پارہ ام چہ بوالہوس است
زار فکر دگر کنم اکنوں !
غزل طرح گفتنم ہوس است

سبطین

مولوی محمد سبطین نام سبطین تخلص۔ ممتاز حسن کے فرزند۔ عربی و فارسی میں فاضل فیضیہ عربک کالج میرٹھ کے ایک ممتاز طالب علم۔ بے مثل مقرر و ذاکر۔ بہت مہذب، خلیق اور مہمان نواز۔ ضلع ہردوئی کے ایک انگریزی اسکول میں عربی و فارسی کے استاد تھے۔ دسہرہ کی تعطیل میں اپنی سسرال موضع میرا پور ضلع فتح پور گئے ہوئے تھے ایک روز کچھ اشخاص نفریحاً جنگل کی طرف لے گئے۔ ایک شخص نے بندوق سے شکار پر گولی چلائی اتفاق سے آپ سامنے پڑ گئے اور آپ کے داہنے کلائی پر گولی لگی جو ہڈی توڑ کر نکل گئی۔ آپ کو کوئی احساس نہیں ہوا اب

لوگ آپ کو ہمراہ لے کر مکان کی جانب روانہ ہوئے۔ راستہ ہی میں آپ کو پیاس غالب ہوئی۔ لوگوں نے پانی پلا دیا۔ پانی پینے کے بعد ایک قدم نہ چل سکے اور گر گئے۔ پلنگ پر لٹا کر آپ کو لے جایا گیا اور وہیں سے بذریعہ موٹر فتحپور کے ہسپتال پہنچایا گیا۔ کئی ماہ کے بعد صحت پائی۔ لیکن کمزوری بہت بڑھ گئی۔ جس کی بنا پر آپ کی تندرستی خراب رہنے لگی۔ اسی حالت میں فالج کا حملہ ہوا اور ۲۴ر فروری ۱۹۴۱ء مطابق ۱۰ر محرم ۱۳۶۰ھ بروز جمعہ انتقال فرمایا۔ رفیع نقوی آپ کی مفارقت سے کئی سال تک روتے رہے۔ ایک لڑکا ظہیر حسین تھا لیکن اس کی بھی رحلت ہو گئی۔ پسماندگان میں صرف بیوہ موجود ہے سکونت محلہ متولی تھی۔ آپ کے کلام کا نمونہ صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا ہے۔

دل ٹوٹ جائے گا ترے بیمار کا ابھی
للہ چھوڑ کر اسے تنہا نہ جائیے

سجاد

مولوی سجاد حسن فاروقی مولوی رفیع الدین وکیل کے صاحبزادے تھے اپنی وجاہت مالی و استعداد علمی کی بنا پر کڑا اور اس کے قرب و جوار میں مشہور تھے۔ آپ نے علم دین اور فن شناوری کی تعلیم لکھنؤ میں پائی تھی۔ تیراکی میں میر مچھلی تیراک کے شاگرد تھے۔ کڑا کے بہترین تیراکوں میں شمار تھا۔ کہا جاتا ہے چار زانو پانی میں بیٹھ کر اور ران و زانو پر حقہ رکھ کے پیتے ہوئے تیر سکتے تھے فارسی اور عربی علوم میں دستگاہ حاصل تھی۔ کڑا کی ادبی فضا میں رہ کر آپ نے

بھی اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں کی طرح طبع آزمائی شروع کی تو اردیخ کہا لیں۔ واقعاتی قطعات نظم کرنا۔ غزلیں لکھی آپ کے جملہ مشاغل میں سے تھے چند اشعار لوگوں کے حافظہ سے مستعار لے کر نقل کئے جاتے ہیں۔

لٹتے ابرو پہ جو بل کھنچتی ہزاروں تیغیں
تیر چل جاتے جو تم جنبش مژگاں کرتے
دیکھتے قبر میں بھی چین نہ پاتا میرا
گر قدم رنجہ سوئے گورِ غریباں کرتے

باعثِ خلق زمین و آسماں تم ہی تو ہو
جس نے کی اک دم میں سیرِ لامکاں تم ہی تو ہو

جب سید صدیق حسن آشفتہ آئی سی ایس ہو کر لندن سے گڑگانؤ تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مصرعہ طرح تھا ۔

"پردے سے نکل آئی ہے تصویر کسی کی"

اس پر سجاد نے گرہ ایسی اچھی لگائی تھی جو حاصلِ مشاعرہ تھی گرہ یہ تھی

بے رونقیٔ بزم چراغوں سے نہیں ہے
پردے سے نکل آئی ہے تصویر کسی کی

الزارالنساء بی بی جو مولوی سجاد حسن کی والدہ تھیں ان کی تاریخ وفات یوں لکھی

فکرِ تاریخِ وفاتِ بی بی الزارالنساء
جن کا باقی رہ گیا اس عالمِ فانی میں نام

جب ہوئی سجادؔ حسن کو دل سے یہ آئی صدا
کیوں نہیں کہتے ہو صاحبؔ خاص جنت ہے مقام

مولوی سجادؔ حسن کا انتقال ۸ رمحرم ۱۳۵۳ھ مطابق ۲۲ر اپریل ۱۹۳۴ء بروز دوشنبہ بمقام ڈورما بوقت ۵ بجے شام ہوا۔

آپ کے صاحبزادگان مولوی فضل احمد عزیزؔ و مولوی محمد یعقوب اور اسحاق رونقؔ وکیل ہیں۔ ایک صاحبزادے آپ کے محمد زکریا بڑے قوی اور طاقت ور انسان تھے جن کے لڑکے زبیر فاروقی شوکتؔ کا شمار کرہ اسکے اچھے شعرا میں ہوتا ہے۔

سجادؔ

شیخ محمد نوازش علی نام سجادؔ تخلص کرتے تھے۔ نہ حالات معلوم ہو سکے نہ یہ پتہ چل سکا کہ کس خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ مختلف تحریرات اور کتابوں میں چھپے ہوئے قطعات ملتے ہیں۔ وحیدؔ نے بھی اپنے ایک شعر میں ان کا تذکرہ اس طرح کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے پُرگو شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شعر یہ ہے ؎

اب نہ وہ سجادؔ و افضلؔ ہیں نہ عیاشؔ و بشیرؔ
شاعری کا چار دن کہنے کو چرچا ہو گیا

مثنوی "مہر و ماہ" مصنفہ نواب علی بہادر مطبوعہ مطبع خاص حاجی صوفی شریفین مولوی محمد حسین شہر کانپور رجسپر محال مکان سبتا رام صفا میں ایک قطعہ تاریخ آپ کا

درج ہے جسے مع عنوان نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ تاریخ از شیخ محمد نواز علی سجاد متوطن کڑا ضلع الہ آباد برادر حاجی محمد حسین مطبع محمدی۔

چھپ گئی جب مثنوی نواب عالی جاہ کی
شعر پر جس کا گماں ہے مطلع خورشید کا
خامۂ سجاد نے تاریخ اس کی یوں لکھی
کیا ہی ہر دماہ کا راحت فزا قصہ چھپا

الٰہی بخش عثمانی نے ایک بیاض واقعات و ضروری مسائل و اذکار کی مرتب کی تھی جس کا نام "مجموعہ قلمی" رکھا تھا۔ اس بیاض کا آغاز ۱۲۵۱ھ میں ہوا تھا انہوں نے اپنے جد امجد احمد بخش عثمانی کی تاریخ وفات بھی اس میں درج کی ہے قطعہ تاریخ سجاد کا ہی کہا ہوا ہے جو حسب ذیل ہے۔

چو ناگہ رئیس کڑا شیخ احمد ‏— ز دنیا سوئے جنت اقصیٰ شدہ
بمرد از وفاتش طریق سعادت ‏— سبیل کرم پیشش اجابت شدہ
ز اخلاص عامش بدل خاص و عام ‏— بتوصیف والاش گویا شدہ
چو بود او گلستان و گنج شرف ‏— بخلد نعیم رونق افزا شدہ
چنیں گفت سجاد تاریخ فوتش ‏— مقامش ز فردوس اعلیٰ شدہ

۱۲۵۸ھ

وفت زوال روز دوشنبہ ۲۲ شوال

مندرجہ بالا تحریرات سے ہم چند باتیں اخذ کر سکتے ہیں۔
(۱) سجاد کا انتقال وحید کے انتقال سے قبل ہو گیا تھا کیونکہ وحید نے ان کا تذکرہ اسی طرح کیا ہے کہ اب لطف شاعری اس وجہ سے نہیں رہ گیا کہ ایسے ایسے صاحب علم وفضل اور خوش گو شعراء انتقال فرما چکے ہیں۔ وحید کا انتقال ۱۳۰۹ھ میں ہوا ہے اس لئے سجاد کی وفات ۱۳۰۹ھ سے قبل واقع ہونے کا خیال صحیح ہے
(۲) اظہر حسن عرف الٰہی بخش نے ۱۲۵۴ھ میں اپنا مجموعہ قلمی مرتبہ کرنا شروع کیا اور ان کے دادا احمد بخش متوفی ۱۲۵۸ھ کا قطعہ تاریخ سجاد کا کہا ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ سجاد کا انتقال ۱۲۵۸ھ کے بعد کسی سنہ میں ہوا۔

سجاد اس زمانے کے پرگو اور تاریخ گو شعراء میں اپنا مقام رکھتے تھے جس کی وجہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے اس زمانہ کے رؤساء اور اعزاء واحباب کی قطعہ تاریخ لکھی اور ان لوگوں سے داد تحسین حاصل کی۔

سحر

سید حبیب اختر نام سحر تخلص کرتے ہیں۔ آپ کے والد سید اختر حسن سید صدیق حسن آشفتہ کے خالہ زاد بہنوئی تھے جن کا ننھیال کڑا ہی تھا۔ اس طرح سے سحر کا دادھیال کڑا ہی تھا۔ سحر کی ولادت یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی مگر والد کا سایہ جلد اٹھ گیا۔ اور انہیں

اپنی تعلیم و تربیت کی خود فکر ہوئی۔ اپنی سعی و کوشش سے ۱۳ سال کے اس بچے نے تعلیم کے مختلف مراحل طے کئے۔ اور مستقل مزاجی و حوصلہ مندی کا دامن تھامے علی گڈھ سے ۱۹۶۱ء میں بی ایس سی کا امتحان کامیاب کیا ۱۹۶۲ء میں بی ایڈ کرنے کے بعد مدرسی اختیار کر لی۔ آج کل ضلع بیا کے ایک گورنمنٹ اسکول میں ریاضی اور سائنس کے مدرس ہیں۔

حبیب اختر سحرؔ کی تلاش میں میں نے مختلف لوگوں کے دروازوں پر دستک دی اور متعدد خطوط لکھے مگر سب بے سود ثابت ہوئے۔ اسی اثناء میں ایک مرد خضر اخترؔ کاظمی نے میری مشکل آسان کی اور اپنی طرف سے ایک خط سحرؔ کو لکھ کر میری ضرورت کا احساس دلایا۔ اس حکم نامے کو وہ کیسے ٹال سکتے تھے۔ آخر کار اس محفل شعر و سخن میں انہیں آنا ہی پڑا۔ جہاں دحیدؔ۔ کمالؔ اور سخیؔ جیسے استادانِ فن جلوہ گر تھے۔ یہ محفل سونی رہتی اگر اسکول اور کالج کی میگزین میں لکھنے والا یہ ہونہار طالب علم جسے بچپن سے ہی شعر و سخن کا شوق رہا شریک نہ ہوتا۔ ابھی یہ آکر بیٹھا ہی تھا کہ شعر و کلام کی فرمائش ہونے لگی "میاں صاحبزادے تمہارا تخلص کیا ہے" "کس کے شاگرد ہو" "کب سے شعر کہتے ہو" "بچہ ذہین معلوم ہوتا ہے" کے جملے محفل میں گونجنے لگے۔ اتنے میں ایک کونے سے صدا آئی "ارشاد ہو" سحرؔ نے اپنے آپ کو ان اساتذہ کی محفل میں دیکھ کر اور شعر پڑھنے کے اصرار پر فرمایا کہ اب تو مدرس ہوں وہ بھی ریاضی اور سائنس کا مگر تعمیل حکم میں عرض ہے ؎

ان کی چشم عنایت جدھر ہو گئی　　　خود بخود ساری دُنیا ادھر ہو گئی

ہجر کی شب بھی کیا مختصر ہو گئی — تارے گنتا رہا اور سحر ہو گئی
حسن کی ہے رُخی الاماں الاماں — جب بھی دیکھا اُنہیں آنکھ تر ہو گئی
جب بھی اُن کے ستم حد سے بڑھنے لگے — نا امیدی مری چارہ گر ہو گئی

اے دلِ مضطرب تو پشیماں نہ ہو
رات گھٹنے لگی لے سحر ہو گئی

واہ واہ۔ سبحان اللہ ماشاء اللہ۔ مکرر ارشاد کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ مگر دلدوز ترنم میں یہ اپنی غزل سناتے رہے۔ ایک غزل اور ارشاد فرمائی اور فرمایا کہ والد صاحب کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔

فنا سب کچھ ہوا لیکن ہے رنگ بے خودی باقی
نہ ہے احساس غم باقی نہ اُمید خوشی باقی
نہ وہ رنگِ وفا ہے اب نہ رنگِ عاشقی باقی
بہارِ زندگی میں رہ گئی افسردگی باقی
تعجب کیا چمن میں ہے اگر افسردگی ہر سُو
گلوں میں ہے ابھی تک فطرتِ بیگانگی باقی
ترے حالِ پریشاں پہ سحر وہ بھی خجل تو ہیں
مگر ان کی نگاہوں میں ہے اب بھی بے رخی باقی

ایسے نفیس، شگفتہ، پُرمغز شعر کہنے والے لڑکے پر سب کی نظریں اُٹھیں اور کمرا کی آبرو، و روشن مستقبل کے نام سے اسے نوازا گیا۔ بعد میں کئی غزلیں

اور بھی سنائیں۔ دادِ تحسین اتنی وصول کی کہ تنگ دامنی کا شکوہ کرنا پڑا۔ وہ اشعار جو دوسری غزلوں سے بہت پسند کئے گئے ہیں یہ ہیں۔

حالِ دل کیونکر سناؤں آہ میرے غمگسار
درد ہے کچھ کرب ہے، کچھ سوز ہے کچھ ساز ہے
کیوں پڑا ہے میرے پیچھے ناصحا مجھ کو بتا
میری لغزش عشق ہے اور اس پہ مجھکو ناز ہے
اک ذرا سی چوٹ کھائی جھنجھنا کر رہ گیا
آہ میرا دل بھی کیا ہے اک شکستہ ساز ہے
دل میں دھڑکن ہو چلی اے دستِ کیوں قسمتِ سحر
تار کوئی چھیڑتا یا مضطرب خود ساز ہے

جب کبھی رندوں سے دست و گریباں ہو گئے
چاک دامانِ اہلِ حرم ہو گئے
زہد و تقوے کی دُنیا لُٹی بارہا
ان کے ہاتھوں سے کیسے ستم ہو گئے
ہم نے ہر ذرّے میں سیرِ جنت کیا
شیخ نذرِ بہارِ ارم ہو گئے

آہ یہ ہجر کے لمحات تمہیں کیا معلوم
شعلہ زن ہیں مرے جذبات تمہیں کیا معلوم
تم نے ساحل ہی سے دیکھے ہیں سفینے سب کے
ڈوبنے والوں کے حالات تمہیں کیا معلوم

ہندوستان کی سکونت ذہنی کش مکش اور حالات کی ناسازگاری کا اندازہ ان کے اس قطعہ سے ہوگا جو ان حالات کی غمازی کرتا ہے۔

میں نے مانا ایک مدت سے ہوں پابندِ قفس
کیا مرے دل سے خیالِ آشیاں جاتا رہا
اس سے بڑھ کر بدنصیبی اے سحرؔ اب ہوگی کیا
کارواں کے دل سے عزمِ کارواں جاتا رہا

غم نے مری حیات کا ساماں بنا دیا
دورِ خزاں کو فصلِ بہاراں بنا دیا
میں تو غمِ فراق میں ڈوبا تھا اے سحرؔ
کس نے غزل پہ چھیڑ کے حیراں بنا دیا

سحرؔ ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں گوآ اور اہلِ گوآ کو ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں امید ہے کہ وہ ان توقعات کو پوری کریں گے اور اس اجڑے دیار کو پُر رونق اور گل و گلزار بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

سخاوت

سید سخاوت حسین نام۔ سخاوت تخلص۔ میر عاشق علی کے بڑے فرزند آپ سادات نقوی میں سے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید شہاب الدین شہر گردیز، (افغانستان) سے وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ آپ صرف غزل کہتے تھے۔ اور مستقل شاعر نہ تھے۔ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ شعراء کی صحبت نے شاعر بنا دیا تھا آپ لاولد تھے۔ نمونۂ کلام محفوظ نہیں ہے۔ ایک غزل کا صرف ایک شعر یہ ہے۔

سادات کی آہوں کا ادنیٰ یہ کرشمہ ہے
سارا مکاں گر گیا ابن زیاد کا!

آپ کا انتقال ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۱ء مطابق ۲۶ر جمادی الاول ۱۳۷۱ھ بروز شنبہ ہوا۔

سخی

سید برورش علی نقوی نام سخی تخلص کرتے تھے۔ آپ کے مورث اعلےٰ حضرت سید جلال بخاری ہیں جو کہ بخارا سے تشریف لائے تھے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی نقی سے ملتا ہے۔ خاندان بخاری کڑا میں تقریباً ساڑھے چھ سو سال سے آباد ہے۔ اس خاندان میں بڑے بڑے عالم فاضل پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۳۶ پر درج ہے۔ آپ کے والد ماجد سید بیدار علی بیدار۔ آپ کے برادر سجاد علی فیاض اور اسرار علی جواد بھی اچھے شاعر

تھے۔ اسرار علی جواد کے فرزند عارف حسین عارف کا نام تاریخ گوئی میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ اس طرح یہ خاندان شعراء، ادباء، علماء و فضلاء کا مصدر و منبع رہا۔ افسوس کہ اس زمانہ میں اس کے نام لیوا تو ضرور ہیں مگر نمائندہ نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سخی کی ولادت ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں ہوئی۔ سخی نے نہایت ادبی و علمی ماحول میں آنکھ کھولی اور اسی فضا میں پروان چڑھے۔ شعر و سخن کی محفلوں میں حصہ لیتے تھے اور بڑی دلچسپی سے اساتذہ کی غزلیں سنتے اور سمجھتے تھے۔ آپ کے جدامجد حامد علی نثار کے بزرگانہ اثر کا نتیجہ تھا کہ خاندان کا ہر فرد شعر و سخن سے بے پناہ دلچسپی رکھتا تھا۔ مرزا کلب حسین خاں بہادر متخلص بہ نادر ڈپٹی کلکٹر اٹاوہ آپ کے جگری دوستوں میں تھے اور خیال ہے کہ شاید ان سے کچھ مشورۂ سخن بھی سخی نے کیا ہو۔ "دربار حسینؑ" کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرثیہ گوئی میں آپ کو دبیر لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کلکتہ۔ لکھنؤ، کانپور الہ آباد۔ اٹاوہ۔ بنارس۔ جونپور اور پٹنہ کے مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔

آپ کی شاعری خالص لکھنوی رنگ کی شاعری ہے۔ روانی و سلاست جوش و اثر ـــــ شاعری میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ آپ ترنم سے اشعار پڑھتے تھے ـــــ خوش الحانی آپ کی خوش بیانی کے رنگ کو اور بھی دوبالا کر دیتی تھی ـــــ اردو اور بھاشا دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے بھاشا میں ـــــ تخلص انوپ تھا۔ آپ نے اچھے اچھے دوہے، ہولی، ٹھمریاں، گیت

اور بر ہا کہے ہیں۔ اکثر بر ہا لکھنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور بڑے درد انگیز لہجہ میں بر ہا پڑھتے بھی تھے۔

ابتدا میں کچھ دنوں تک حکومت برطانیہ کی طرف سے الہ آباد کے تھانہ دار رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خبر پر نواب اودھ کو بہت افسوس ہوا اور فرمایا کہ سخی نے ملازمت کے لئے مجھ سے نہ کہا۔ سخی جیسے شاعر کے لئے تھانیداری کوئی قابل افتخار ملازمت نہ تھی اس وجہ سے چند دنوں بعد اس سے دستبردار ہو گئے۔

سنہ ۱۲۹۰ھ میں واجد علی شاہ کی قدر افزائیوں سے مجبور ہو کر کلکتہ گئے۔ اور مٹیا برج میں ایک ایسی معرکۃ الآرا غزل پڑھی جو زبان زد عوام وخاص ہوئی سنہ ۱۲۹۱ھ میں جب آپ مٹیا برج سے تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں بہت سا کلام تلف ہو گیا۔ بہار ربیع الاول سنہ ۱۲۹۳ھ میں ۲۵ برس کی عمر پاکر دار فانی سے کوچ کر گئے۔ سخی کا انتقال مٹیا برج ہی میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

سخی اپنے دور کے اساتذہ میں تھے اکثر وبیشتر شعرا آپ سے مشورۂ سخن کرتے تھے مگر افسوس کہ ان کے شاگردوں کی کوئی فہرست مل نہیں سکی آپ کا دیوان آپ کے انتقال کے بعد چھپا انجمن ترقی اردو کراچی میں اور ایک نسخہ سید کلیل احمد نقوی کی تحویل میں ہے۔ آپ کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

جل جل کے تمہیں جلائیں گے ہم
لو شمع سے اب لگائیں گے ہم

جس کو دامن سے اس نے جھاڑ دیا!
ہائے شامل تھے اس غبار میں ہم

دیکھئے کب وہ شعلہ رو آئے
شام سے لو لگائے بیٹھے ہیں

قبر میں اب کسی کا دھیان نہیں
سچ ہے جب جی نہیں جہان نہیں

آج دیکھیں دلِ عاشق تو نہیں
آپ آنچل میں یہ کیا باندھتے ہیں

کون کہتا ہے کہ آیا نہ کرو
میں تو کہتا ہوں کہ جایا نہ کرو

جب ہمیں پوچھا کسی نے تو کہا
وہ تو اک مدت ہوئی جاتے رہے
ایک دن وہ لا کے کچھ لوگوں کو ساتھ
تربتیں یہ کہہ کے دکھلاتے رہے
اس میں مجنوں ہے اور اس میں کوہکن
عاشقاں تازہ جاتے رہے

بعد اُس کے پھر ہماری قبر پر
دیر تک افسوس فرماتے رہے
سب نے جب پوچھا کہ اس میں کون ہے ۱
آپ جو رو رو کے پچھتاتے رہے
بولے ہے ہے یہ سخی کا ہے مزار
جان دے دی لاکھ سمجھاتے رہے

دم نہ دیکھا مرا نکلتے ہوئے
سن کے موت آئے ہاتھ ملتے ہوئے

دل کھلونا نہیں جو کہتے ہو
ہم یہی لیں گے ہم یہی لیں گے

چلے پھر ہاتھ غیروں کا پکڑ کے
یہ سمجھایا تھا ان کو پاؤں پڑ کے

رُخ ہاتھ پہ رکھا نہ کرو وقت تکلم
ہر بات میں قرآں اٹھایا نہیں جاتا

مری قبر پر سے پھر آئے کیوں یہ جمال کیوں نہ دکھا دیا
میں تو سو رہا تھا مزار میں مجھے کیوں نہ تم نے جگا دیا
ہوا غسل لائے جنازہ بھی تہہ خاک ہم کو دبا دیا
نہیں چھوٹے گھر سے مزار تک یہ اجل نے کیسا سلا دیا
مجھے دفن کرنے کے ساتھ ہی مرے گلبدن نے وفا کی لی
جو گلے میں پھولوں کا ہار تھا وہ لحد پہ میری چڑھا دیا
ابھی عین ذکر وصال میں جو رقیب سامنے آ گیا
وہیں اس غرض سے کہ چپ رہوں مرا پاؤں چپکے دبا دیا
ہوئے ٹیا برج میں اے سخی جو شریک بزم مشاعرہ
یہاں شاعروں کے کلام نے ہمیں لکھنؤ کو بھلا دیا

کہئے بخیر و عافیت اے مہرباں رہے
مدت پہ آج آئے مرے گھر کہاں رہے

آکے پہلو میں بیٹھئے رل کے
حوصلے کچھ نکال لیں دل کے

آج وہ بلبلوں کا جی لیں گے
پھول سے ہاتھ میں کلی لیں گے
اب جگر دہ گیا ہے یہ بھی سہی
اور کیا وہ کسی کا جی لیں گے
آؤ شکوہ نہ ہجر کا ہوگا
وصل میں ہم زباں سی لیں گے
حشر میں ہم پئے نجات سخی
دامن مرتضیٰ علی لیں گے

سعید

غلام پیر نام شیخ ابوسعید عرفیت اور سعید تخلص کرتے تھے۔ آپ محلہ مولویانہ میں تولد ہوئے جہاں آپ کے والد شیخ اشرف حسن کا مولد و مسکن تھا شیخ اشرف حسن قصبہ کے زمینداروں میں تھے۔ مولوی امر اللہ نے خاندان کے باہر بھی ایک شادی کی تھی۔ اس خاتون کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کی شادی اشرف حسن سے ہوگئی اور اسی سے ابوسعید پیدا ہوئے اسی طرح سے مولوی امر اللہ آپ کے نانا اور فصیح العصر یکتائے روزگار حضرت وحید آپ کے ماموں تھے۔ ابوسعید چار بھائی تھے۔ ابونصر۔ ابوالبرکات۔ ابومحمد اور ابوسعید

سعید کو اوائل عمر ہی سے شعر و شاعری کا بہت شوق تھا اور مصرعے موزوں کر لیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اچھے شاعر ہوگئے۔ اپنے اشعار وحید میاں کو دکھلاتے اور ان ہی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ سعید بہت سنجیدہ و متین شخص تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں پختگی اور سنجیدگی کے بیش بہا مرقعے ملتے ہیں۔ شوخی اور چلبلاہٹ خال خال پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ نے اپنی تمام عمر عالم تجرد میں گذاری اس واسطے محرومی یاس کے نمونے آپ کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اور سنجیدگی آپ کے کلام سے ٹپکتی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم وطن ہی میں حاصل کی اس کے بعد تقریباً چالیس سال تک ریاست دیواں میں وکالت کرتے رہے۔ یہ پیشہ خاندانی تھا اور آپ نے اس میں کافی مہارت و شہرت حاصل کی تھی۔

سعید کو اپنا دیوان شائع کرانے کا شوق تھا۔ اور اپنی وفات سے قبل اس کے تمام انتظام مکمل کر چکے تھے مگر مشیت ایزدی کچھ اور تھی۔ وہ اپنی زندگی میں اس نخل کو بار آور نہ دیکھ سکے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے برادر خورد مولوی ابو النصر نے ۱۳۴۹ھ میں آپ کا دیوان شائع کیا جسے اعزا احباب اور دوسرے اہل کمال و قدر دانان علم و ادب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سعید کا دیوان اب نا پید ہے۔ راقم الحروف کے پاس بھی ایک نسخہ تھا جو کسی دراز دست کی چابک دستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ پاکستان آنے پر راقم الحروف کو سید سہیل احمد نقوی نے جو میرے خالہ زاد بھائی ہیں ایک اور نسخہ بطور ہدیہ کے پیش کیا۔ ——— اور درج ذیل شعر اُسی دیوان سے منتخب ہیں۔ سعید کا انتقال ۴ رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء کو ہوا۔

آپ کا دیوان ۱۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ابو النصر کا دیباچہ ہے اور حافظ نظامی کا قطعۂ تاریخ طبع دیوان ہے۔ اس کے بعد ایک نظم ہے اور اس کے بعد "التماس ضروری" کے عنوان سے سعید کا لکھا ہوا اپنا حال ہے جو ان کے ذہنی رجحان کی آئینہ داری کرتا ہے۔ "التماس ضروری" کا اقتباس یہ ہے۔

"میری عمر اس وقت ۶۵ سال کی ہو چکی ہے۔ کوئی آل اولاد نہیں ہے زمانۂ موت سر پہ آپہنچا ہے"

"اور کسی قدر مجموعہ غزلوں کا اور بھی موجود تھا جو وقتاً فوقتاً

کہنے کا اتفاق ہوا تھا جن کی کل مجموعی حیثیت بطور ایک مختصر دیوان کے ہوگئی ہے۔ اس لئے مجھ کو خیال گذرا کہ اس کو چھپوا کر شائع کر دوں اور اپنی ایک ہی یادگار دنیائے ناپائدار میں چھوڑ جاؤں۔ پس مجھ کو اسی قدر کہنا ضروری ہوا کہ میرا کلام استادانہ نہیں بلکہ بہت کمزور شاعری ہے۔"

میری اس قدر عمر تردد و پریشانی میں گذری جس کی بابت اشعار ذیل حسب حال خود میں نے عرض کئے ہیں ؎

اسیرِ پنجۂ غم ہوں تو میں ہوں
چراغِ بزم ماتم ہوں تو میں ہوں
فلک پر میرے نالوں کا اثر ہے
ہوا پھر گردشِ درد جگر ہے
نہ میں تنہا بہ رنگ خاک پا ہوں
حریف دامنِ بادِ صبا ہوں"

نمونہ کلام یہ ہے۔

میں یہ سنتا ہوں وہ خنجر کو جلا دیتے ہیں
اس طرح اب مجھے پیغام قضا دیتے ہیں
اب انہیں بھی کسی پہلو نہیں آتا ہے قرار
کیوں مرے دل کے تڑپنے کا تماشا دیکھا

پڑ گیا چسکا کسی بیدرد کو بیداد کا
اب خدا ہے حافظ و ناصر دلِ ناشاد کا
لے چلی ہے وحشت دل مجھ کو صحرا کی طرف
نام روشن پھر سے ہو گا وامق و فرہاد کا

اس ترکِ راہ و رسم سے دل کو الم ہوا
آنکھیں کسی کی پھر گئیں کیسا ستم ہوا

ہمارے دل میں کھٹکا کس لئے ہو روزِ محشر کا
وسیلہ ہے فقط کافی ہمیں اپنے پیمبر کا

گل ہوا ہے آج روشن میری قسمت کا چراغ
وہ جلانے کے لئے آئے ہیں تربت کا چراغ

زندگی بھر تو رہے مجھ سے وہ برگشتہ سعید
یاد آئی ہے انہیں میری وفا میرے بعد

مجبور ہو گئے ستمِ ناروا سے ہم
بیٹھے ہیں اب تو ہاتھ اٹھا کر جفا سے ہم

نہ پائیں گے انہیں گلچیں کسی صورت سے گلشن میں
عنادل نے چھپایا ہے جنہیں کنج نشیمن میں

دکھایا یہ اثر ہم نے ترے تیر نظر میں
دل سے کبھی نکلا تو چھپا آ کے جگر میں

شاغل

امیرالدین عرف امراللہ نام شاغل تخلص۔ آپ مولوی عبدالقادر فاروقی رئیس کے فرزند اور وحید العصر استاد زماں فصیح دوراں وحید کرموی کے والد ماجد تھے۔ آپ الہ آباد میں وکالت کرتے تھے ان کی وکالت کا بہت شہرہ تھا دور دراز مقامات سے لوگ اپنے مقدمات کے سلسلہ میں ان کے پاس آکر مقیم ہوا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی وکالت اتنے عروج پر تھی کہ ایک دن میں تین چار سو روپیہ تک آمدنی ہو تی تھی۔ وہ اکثر اوقات اپنی تمام آمدنی کو غریبوں، یتیموں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے مشہور ہے کہ ایک بار کچہری تشریف لے جارہے تھے کہ پڑوس کی ایک عورت ملی۔ اور اس نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ میری لڑکی کی شادی ہونے والی ہے اور میرے پاس کوئی سبیل نہیں۔ آپ میری کچھ مدد کیجئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ اچھا آج کی جتنی آمدنی ہو گی وہ میں سب تجھے دے دوں گا

مولوی صاحب کچہری سے گھوڑا گاڑی پر واپس تشریف لا رہے تھے کہ انہیں اس عورت کا خیال آیا۔ اس دن اتفاق سے ان کو کچھ آمدنی نہ ہو سکی تھی۔ ان کے منشی ہمراہ تھے کہ ایک شخص راہ میں ملا اور مولوی صاحب کے منشی جی سے کہا کہ میں نے بہت کوشش کی مگر ایک وکیل ہیں امراللہ صاحب ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ منشی جی مسکرائے اور بتایا کہ مولوی امراللہ صاحب تو یہی ہیں۔ اُس نے اُسی وقت پانچ سو روپیہ محنتانہ مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور اپنے مقدمہ میں پیروی کرنے کی درخواست کی۔ مولوی صاحب نے منشی سے کہا کہ روپیہ لے لو جب گھر پہنچے تو عورت انتظار میں تھی۔ مولوی صاحب نے کل روپیہ اُسے دلا دیا۔ عورت نے کہا مجھے صرف دو سو روپیہ درکار ہے مگر مولوی صاحب نے جواب دیا کہ باقی تین سو روپیہ کنوئیں میں ڈال دینا کیونکہ یہ میرے نہیں صرف تمہاری قسمت کے ہیں۔

بہر حال مولوی صاحب نے اپنے در سے کبھی کسی کو محروم نہیں جانے دیا اُس وقت قصبہ کڑا اور الہ آباد اور اس کے اطراف میں مولوی صاحب کی داد و دہش کی مثالیں دی جانے لگی تھیں۔

مولوی صاحب کی بزرگی کے قصے بھی مشہور ہیں۔ ایک بار آپ حضرت خواجہ کڑک ابدالؒ کے مزار پر تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بزرگ ملے اور انہیں دو اشرفیاں دے کر تاکید فرمائی کہ اسے کسی اور کو مت دینا۔ مولوی صاحب آگے بڑھے راستے میں ان کا مالی جو گھر میں پھول وغیرہ لاتا تھا ملا اور اپنی کسی اشد ضرورت کا اظہار کر کے مدد چاہی۔ مولوی صاحب

خالی الذہن تھے انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دونوں اشرفیاں اُس مالی کو دے دیں فاتحہ پڑھ کر واپس ہونے لگے تو اس بزرگ کی تاکید یاد آئی مولوی صاحب فوراً تلاش کرتے ہوئے مالی کے گھر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مالی تو گذشتہ ہفتہ سے کہیں آیا ہی موجود نہیں ہے۔ انہیں بہت تعجب ہوا اور ایک ہفتہ بعد جب مالی واپس آیا تو اس سے اس واقعہ کو دریافت کیا۔ اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس پر مولوی صاحب نے سجدۂ شکر کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے کامیاب فرمایا جو چیز میرے پاس جیسے آئی تھی میں نے اُسے اُسی طرح دے ڈالا۔

مولوی صاحب الہ آباد میں اپنی وکالت کے سلسلہ میں "لوچڑ کی حویلی" میں رہا کرتے تھے۔ یہاں کا ہر شخص آپ کے اعلیٰ اخلاق وکردار۔ تبحرِ علمی نیک نفسی۔ روشن ضمیری اور داد ودہش کا معترف تھا۔ مولانا مرحوم نے تین شادیاں کی تھیں۔ زوجہ اوّل اپنے خاندان کی تھیں۔ ان کے بطن سے فصیح العصر، یکتائے روزگار وحید العصر وحید الدین وحید اور زین العابدین متخلص بہ عابد جیسے بزرگ پیدا ہوئے جنہوں نے دنیائے علم وادب وتصوف میں نام پیدا کیا۔

مولوی صاحب کو شعروشاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اپنے پیشے کی مصروفیت سے مجبور تھے تاہم غزل کہتے تھے اور اچھے بلند خیالات نظم کرتے تھے۔ آپ غلام ہمدانی مصحفی کے ارشدہ تلامذہ میں سے تھے۔ اثر رامپوری نے اپنے قلمی تذکرہ سلسلۂ مصحفی میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ "چراغ محفل فصاحت"

کے صفحہ ۲۱۵ "سخن شعراء" کے صفحہ ۲۳۰ پر آپ کا ایک شعر ملا ہے۔ جو درج ذیل ہے ؎

بے قراری سی مری آہ وہ آگاہ نہیں
جس کا میں چاہنے والا ہوں اُسے چاہ نہیں

شوکتِ نادری (قلمی) کے صفحہ ۱۰۴ پہ شاغل کا ایک اور شعر ملا ہے۔ شوکتِ نادری رام پور اسٹیٹ لائبریری میں ہے۔ جس کا اقتباس افسر امروہوی نے اپنی کتاب شاگردانِ مصحفی کے سلسلے میں لیا تھا جہاں سے یہ شعر نقل کیا جاتا ہے ؎

یوں ہی ایام جدائی جو رہیں گے شاغل
ہے یقیں میں نہیں یا نالۂ جانکاہ نہیں

"عمدۂ منتخبہ" مرتبہ خواجہ احمد فاروقی کے صفحہ ۳۰۰ پر بھی آپ کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے

"شاغل تخلص اسمش معلوم نیست وعمالاتش مفہوم ساذ طبع زاد اوست۔

جانی نہیں ہے اس سے تری فکر زلف و رُخ
شاغل کو روز و شب ہے ترا ذکر زلف و رُخ

شوکت

محمد زبیر نام نادر دتی نسب شوکت تخلص کرتے ہیں۔ آپ مولوی سجاد حسن

فاروقی کے پوتے اور محمد زکریا کے واحد چشم و چراغ ہیں۔ مولوی محمد زکریا کا انتقال عنفوانِ شباب ہی میں ہو گیا تھا۔ شوکت نے بھی شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ ایک مدت سے اشعار کہتے ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۹۲۷ء ہے۔ تاریخی نام افتخار احمد ہے۔ الہ آباد سے انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۶۲ء میں کراچی سے ایم اے اردو ڈگری حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد ہی ریلوے میں ملازمت کر لی تھی اور اسی سلسلہ سے ۱۹۴۷ء میں پاکستان تشریف لے آئے تھے جب سے کراچی میں مقیم ہیں۔ آپ کی شعر فہمی اور شعر گوئی مسلم الثبوت ہے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اب صرف خصوصی نشستوں میں اپنا کلام سناتے ہیں اور سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔ آپ کو متین مچھلی شہری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ وحید الہ آبادی پر بھی آپ نے ایک نظم مثنوی کی بحر میں لکھی ہے جو زیر تصنیف کتاب "وحید الہ آبادی" میں شامل ہے۔ پرانی کتابیں اور قلمی نسخے جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ چند نادر و نایاب کتابیں آپ کے مختصر سے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ "سہیل یمن" مصنفہ مولوی رفیع الدین دام المطبوعہ نے آپ ہی سے لے کر پڑھی ہے جس کا کوئی اور نسخہ میرے خیال میں پاکستان میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکتا۔ فن عروض پہ آپ کی خاص نظر رہی ہے اور شعر و شاعری سے بے پناہ دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ "سخندانِ فصحٔ کرام" کی تصنیف و تالیف میں آپ نے میری کافی ہمت افزائی کی ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے محمد جنید فاروقی والد کے صحیح جانشین اور مستقبل کے ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ شوکت فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

من ندانم از کجب و تا کجب — می کشد شوقِ فراواں می روم
گاہ مصحف گاہ شیشہ در بغل — گہہ بکفر و گہہ بہ ایمان می روم

شمع روئی گُل ہنسے پروانے جل کے رہ گئے
جس سے جو کچھ ہو سکا اس نے کیا میرے لیئے

مل گیا مجھ کو زندگی کا راز — اے غمِ عشق تیری عمر دراز
ایک ہیں دونوں زاہد معذور — یہ مری معصیت یہ تیری نماز

اب کرم ہے نہ جور کیا کہئے — اپنی قسمت ہے اور کیا کہئے

اتفاق باہمی ہی عشق کی بنیاد ہے
دل تجھے سمجھا رہا ہے دل کو سمجھاتا ہوں میں

جب شبِ فرقت کی تنہائی سے گھبراتا ہوں میں
اے خیالِ یار تجھ سے دل کو بہلاتا ہوں میں

شوکت کو فن تاریخ گوئی میں خاص دسترس حاصل ہے فن تاریخ گوئی کے متعلق

انہوں نے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس کا تاریخی نام "رسالہ عدد نسا"
۱۳۸۴ھ
موسومہ "معاون تواریخ" ہے۔ افسوس کہ چند در چند وجوہات کی بنا پر یہ رسالہ اب تک زیورِ
۱۳۸۴ھ
طباعت سے مزین نہ ہو سکا یہاں ان کے چند مادہ تاریخ درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) "سال وفات مہر نقوی والاجاہ" از کلکِ ملہم محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی عفی عنہ
۱۳۸۹ھ

مہر نقوی شاعر و تاریخ گو | ہو گئے جب راہیٔ ملکِ بقا
۱۳۸۹ھ
فکرِ شوکت کو ہوئی تاریخ کی | "عاقبت باخیر" ہاتف نے کہا
۱۳۸۹ھ

۲۔ ایک بہت ہی عابدہ و زاہدہ عزیزہ کی وفات کا مادہ تاریخ

"لم یخلق مثلہا"
۱۳۸۶ھ

۳۔ جوانمرگ رضاعی بھائی کا مادہ تاریخ۔

فکر کردم بہرِ تاریخِ وفات
گفت ہاتف "مجمع داغِ جگر"
۱۳۸۱ھ

۴۔ اپنے عمِ مکرم مولوی فضل احمد عریقؔ مرحوم کی وفات پر برجستہ دعائیہ تاریخ "اللّٰھم اغفرہ" کہی۔
۱۳۸۷

اور ایک طویل قطعہ تاریخ کہا جس کا مادہ تاریخ حسب ذیل ہے۔

عریقش بود تاریخ ولادت
۱۳۱۱ھ
"عریقِ پاک جاں" تاریخ رحلت
۱۳۸۷ھ

شیون

جواد الحسن نام جمالو عرفیت ہے اور آپ عباس الحسن کے تیسرے صاحبزادے ہیں۔ شیون تخلص کرتے ہیں۔ بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ اور چونکہ اپنے برادر بزرگ محمد باقر عثمانی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ الہ آباد کے ساتھ رہتے تھے۔ اس وجہ سے الہ آباد کے مشاعروں میں شرکت کی کافی دعوتیں ملتی تھیں ساتھ ہی ساتھ آپ کے ولولہ انگیز اشعار دلنشین آواز اور پُر کیف ترنم لوگوں کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھا آپ کو علامہ عاشق حسین سیماب اکبر آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہے میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے چچا بدر الحسن عثمانی کے پاس حیدر آباد تشریف لے گئے جہاں آپ کو علمی مجلسوں کی دعوتیں ملنے لگیں۔ حیدر آباد کے ادبی ماحول نے آپ کی شاعری کو جلا بخشی اور آپ کا ذوق فانی بدایونی تک آپ کو لے گیا ان دنوں فانی حیدر آباد میں تھے اور وہاں کے اکثر شعراء ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ فانی کی صحبت سے بھی آپ نے بہت کچھ علمی فیوض حاصل کیے

تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں مقیم ہیں اب بھی گاہے گاہے جولانی طبع چند اشعار کہنے پر مجبور کر دیتی ہے اگرچہ اب شعر و شاعری سے قدرے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ علمی مذاق اور شعروں کی پرکھ قابل داد ہے۔ آپ کے زمانہ میں الہ آباد میں ماہر الہ آبادی۔ وحید الہ آبادی اور بسمل الہ آبادی کافی شہرت رکھتے تھے۔ بسمل سے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ بسمل الہ آبادی نے کسی مشاعرہ میں آپ سے قبل

پڑھا اور ایک قطعہ اپنے استاد حضرت علامہ نوح ناروی کی شان میں کہا وہ قطعہ یہ ہے ؎

دن رات کو دن رات سمجھتا ہوں میں
ہے راز کی جو بات سمجھتا ہوں میں
ہے نوح کے ٹکڑوں پہ گذارا میرا
بسمل تیری اوقات سمجھتا ہوں میں

جب شیون کو مشاعرہ میں پڑھنے کیلئے بلایا گیا تو آپ نے کہا ابھی ابھی ایک قطعہ ہو گیا ہے اور وہ قطعہ پڑھا۔

اشعار خرافات سمجھتا ہوں میں
ہے راز کی جو بات سمجھتا ہوں میں
ہے نوح کے دم تک تیری شہرت سارے
بسمل تیری اوقات سمجھتا ہوں میں

یہ سن کر بسمل انہیں مارنے کے لئے دوڑا۔ یہ اپنا جوتا چھوڑ کے بھاگ نکلے۔ اسی طرح سے آپ سے اکثر بسمل الہ آبادی کی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ آپ کی شاعری زیادہ تر رومانی عناصر کی حامل ہے اور جذبات و کیفیات سے لبریز۔ ہمعصر شعراء میں شیون کا نام الہ آباد سے حیدرآباد تک مشہور ہے دیوان مرتب نہیں ہو سکا۔ اور نہ اب انہیں اس کا شوق ہے تاہم چند نظمیں اور اشعار بہ ہزار دقت دستیاب ہو سکے ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں۔

ہے وقت نزع لیکن تم نہیں ہو میری بالیں پر
بھٹکتا ہے سرِ منزل پہنچ کر کارواں میرا

دل ضبط کا خوگر ہو ہی چکا
اب ضبط کو برہم کون کرے
گذرے ہوئے رنگیں لمحوں کا
یوں بیٹھ کے ماتم کون کرے
خود میں ہی جب اپنا ہو نہ سکا
اوروں کا بھلا غم کون کرے

ہوائے برق و باراں میں گھرا ہے آشیاں اپنا
حوادث چار تنکوں کے مقابل دیکھتے جاؤ

میں حرم میں محوِ نماز تھا یہ عجیب ذوقِ نیاز تھا
تیرا دھیان او بُتِ ناز تھا کہ جبیں دھری تھی دھری رہی

وفا و ظلم کی کچھ یادگار رہنے دے
مٹانے والے نشانِ مزار رہنے دے
اللہ رے فریب جوانی کی لذتیں!
خود اپنے ہی شباب سے ہم کھیلتے رہے
یعنی شکستِ دل میں ملی لذّتِ حیات
ٹوٹے ہوئے رباب سے ہم کھیلتے رہے

الوداع اے مشعلِ نورِ حقیقت الوداع
الوداع اے مرکزِ حسن و محبت الوداع
الوداع اے تو کہ تھا وجہ قرارِ زندگی
تجھ پہ تھا لاریب ظالم انحصارِ زندگی
الوداع اے تو کہ تیرے قرب سے جیتا تھا میں
تیری نظروں سے شراب زندگی پیتا تھا میں
آہ ظالم ساعتِ دردِ جدائی آگئی
تو چلا اور اپنی دنیا پر تباہی آگئی
ہم رہیں گے صبح سے تا شام تیری یاد میں
حسرتیں کھیلا کریں گی اس دل برباد میں
آہ ہم مرتے رہیں گے تجھ سے ملنے کے لئے
اور دعا کرتے رہیں گے تجھ سے ملنے کے لئے
انگلیوں سے میرے سر کے بال سلجھائے گا کون
انقلاب دوستی کے جال سلجھائے گا کون
تو بھی اتنی خاطر ناشاد کر لینا ضرور
جب ذرا فرصت ملے تو یاد کر لینا ضرور

آپ کی نظم انتظار حسب ذیل ہے۔

"انتظار"

شب آئی ہے شام ہو چکی ہے　　شب بھی تو تمام ہو چکی ہے
آیا نہیں آہ تو تو اب تک　　بتلا کر دوں انتظار کب تک
آگاہ ہوں ہر نشیب سے میں　　واقف ہوں ترے فریب سے میں
کچھ تیرا گلہ نہیں جگر کو　　پر میری نگاہ منتظر کو

ہے حسرت دید یار باقی
اب بھی ہے انتظار باقی

پروانوں کا خوں رنگ لایا　　وہ دیکھ چراغ تھرتھرایا
اک نور رفتہ پر چھا رہا ہے　　مشرق سے یہ کون آ رہا ہے
ہنگامۂ شب کا سرد ہے جوش　　پروانے ہیں چپ چراغ خاموش
یہ درد و اضطراب ہے ہے　　یہ کروٹیں وقت خواب ہے ہے

ہے زیست کی کچھ بہار باقی
اب بھی ہے انتظار باقی

طے ہو گئیں زندگی کی راہیں　　آنکھوں میں ٹھہر گئیں نگاہیں
سب جوش جنون سرد سا ہے　　اب جسم میں خون سرد سا ہے
رونا بھی نہیں ہوں بے کسی پہ　　طاری ہے جنوں زندگی پر
کب تک یہ قدم بڑھائے جاؤں　　کب تک یہ فریب کھائے جاؤں

کب تک رہے انتشار باقی
اب بھی ہے انتظار باقی

مایوس طبیب ہو رہے ہیں　　احباب و عزیز رو رہے ہیں

بالیں پہ مرے اجل کھڑی ہے — ہے درد یہ آخری گھڑی ہے
چمکا ہے مثالِ آبگینہ — پیشانی پہ موت کا پسینہ
امکان جو زندگی کا ہوتا — منھ ڈھانپ کے چارہ گر نہ روتا

سانسوں کا ہے کچھ شمار باقی
آ اب بھی ہے انتظار باقی

صابر

سیّد عزادار حسین بخاری نام، صابر تخلص۔ نثار حسین کے چھوٹے فرزند اور جواد الحسن قائم کے پوتے۔ مڈل تک تعلیم حاصل کی ہے۔ ادبی صحبتوں نے شاعری کی جانب متوجہ کر دیا۔ کوثر جائسی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ رفیقؔ لغوی کو بھی اپنا کلام دکھلا دیا کرتے ہیں۔ غزل کے علاوہ نوحے بھی کہتے ہیں۔ بسلسلہ ملازمت کانپور میں مقیم ہیں سکونت محلہ بخاری تھی۔

آپ کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

وہ کسی کا ہو تبسم کہ بہار مسکرائے
کوئی آستاں ہو صابرؔ تو مذاق سجدہ چکھے

آنکھیں پرنم اور داماں وگریباں تارتار
بے نیازانہ کسی کے آج اٹھ جانے کے بعد

ہمیں زیست کے یہ پہلو بخدا نہ راس آئے
سر رہ گذر کہاں تک کوئی اپنا سر جھکائے

یوں چلے ہیں آج گلشن سے سوئے ویرانہ ہم
اس بھری محفل میں کوئی چارہ ساز دل نہ تھا

صفدر

سیّد صفدر حسین نام صفدر تخلص کرتے تھے۔ آپ کی تاریخ ولادت ۲۵ رمضان ۱۲۷۳ھ بتائی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی عربی و فارسی میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی سے بے پناہ شغف تھا اور اس میں شعر بھی کہتے تھے اردو کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی کا کوئی نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ بڑے خدارسیدہ اور صوفی منش تھے۔ کچھ مدت قصبہ کے اسکول

کی مدرسی ذریعہ معاش رہی مگر عمر کا زیادہ حصہ عبادت و ریاضت میں گذارا۔ خاص طور سے کڑا کے مشہور بزرگ خواجہ کڑک ابدالؒ (جن کا تذکرہ تاریخ کڑا مانک پور کے صفحہ ۱۱۴ پر ہے) کے مزار پر وقت گذارتے تھے گھر سے کھانا جاتا کھا لیتے اور ہفتوں وہیں عبادت میں مستغرق رہتے۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۲۲ء مطابق ۲۰ر جمادی الاول ۱۳۴۰ھ کو انتقال ہوا۔ آپ کی زوجہ بھی آپ کے ساتھ ہی علیل ہوئی تھیں اور انتقال میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ چند گھنٹوں بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا دونوں کے جنازے ساتھ ساتھ اٹھے۔

آپ کے حالات زندگی آپ کے پوتے سید ابرار احمد رضوی۔ کوثر الہ آبادی نے رقم فرمائے ہیں جن سے استفادہ کر کے یہاں چند سطور پیش کی جا رہی ہیں۔ آپ کے لڑکوں میں سید زوار حسین عدیل نے محفل شعر و سخن میں اپنے دور میں کافی نام پیدا کیا ہے۔ عدیل کا تذکرہ صفحہ ۲۴۰ پر ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

دو قدم بس ساتھ چل کر رہ گئے
ہائے پروانے تو جل کر رہ گئے

کہیں کس طرح سے نہیں یاد آئی
کڑے کی ہمیں سر زمیں یاد آئی

ضیاءؔ

قاضی سید چراغ علی کاظمی نام۔ ضیاءؔ تخلص۔ قاضی امانت کے فرزند۔
سلسلۂ نسب امام ہفتم حضرت موسےٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے ان کے مورث
مشہد یعنی خراسان (ملک ایران) سے وارد ہندوستان ہوئے۔ ضیاءؔ عربی و
ری میں منتہی تھے۔ یہ خاندان زمانہ شاہی میں بڑا معزز اور با اقتدار رہا۔
پ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی اور ایک فرزند قاضی سید توقیر
ن تھے۔ صاحبزادی کے تین لڑکیاں صاحب اولاد موجود ہیں توقیر حسین
انتقال ۱۷ مئی ۱۹۶۵ء مطابق ۱۷ محرم ۱۳۸۵ھ بروز پنجشنبہ ہوا۔ وہ چونکہ
ولد تھے لہٰذا ان کے متروکہ پر ان کی تینوں بھانجیاں قابض و دخیل ہوئیں
ضیاءؔ کے مزید حالات دستیاب نہیں ہو سکے صرف رفیع نقوی کی تحریر
سے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ضیاءؔ غزل و قصائد کے علاوہ ہزل بھی کہتے تھے
ضیاءؔ کا انتقال یکم اپریل ۱۹۱۸ء مطابق ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ بروز دو
شنبہ ہوا۔ سکونت محلہ قضیانہ تھی۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔

نکل آئے ہیں آج گردوں پہ تارے
چلو جی چلیں ہم بھی گنگا کنارے

وہ گنگا جہاں حسن فطرت ہے پیارے
ہمیں آج رہ رہ کے پھر ہے پکارے

ظریف

سید خلیل الدین احمد نام۔ اچھو میاں عرفیت۔ ظریف تخلص۔ سید محمد
۱ اعلیٰ کے فرزند۔ کلام ظریفانہ ہوا کرتا تھا۔ نمونۂ کلام میں صرف ایک شعر لکھا
جاتا ہے۔

حقوے محتشم کے بھی ہمشکل ہیں چپل
مادہ جو کسی لی میں تو ہمشیر اسی کی

شعر مذکور کی تشریح یہ ہے کہ سید محمد احمد عرف میاں لال (جو کہ صدیق
حسن آشفتہ کے حقیقی بہنوئی تھے) کے داڑھی مونچھوں میں بال نہ تھے۔ نیز منہ میں
۲ دانت بھی نہ تھے۔ داماد ہونے کے سبب سب لوگ ان سے مذاق کیا کرتے تھے
اسی زمانہ میں ختو ایک نکر قصاب (حپوا) بھی تھا اس کے بھی داڑھی
مونچھ میں بال نہ تھے اسی مناسبت سے انہوں نے یہ شعر کہا تھا۔

عارف

سید عارف حسین نقوی نام عارف تخلص تھا۔ اسرار علی جواد کے ہونہار
۱ فرزند تھے، سلسلۂ نسب، سید جلال بخاری سے ملتا ہے۔ خاندانی شجرہ "تاریخ ٹڈا
مانکپور" کے صفحہ ۱۳۶ پر درج ہے۔ چونکہ آپ کا تعلق اس خاندان بخاری سے تھا
جس میں آپ کے دادا بیدار علی بیدار۔ پردادا حامد علی نثار والد اسرار علی جواد
اور چچا پرورش علی سخی جیسے صاحب علم و فن شعرا گذر چکے تھے اسی لئے فن

شعر گوئی سے آپ کو بھی تعلق خاطر تھا۔ عارف کو بھی شعر کہنے اور داد حاصل کرنے کی خواہش ہوئی اُس وقت فصیح العصر استاد زماں یکتائے روزگار وحیدالدین وحید کا ڈنکا بج رہا تھا۔ آپ نے انہیں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا استاد کی دراسی توجہ نے آپ کی طبع کو روانی اور فکر و فن کو جلا بخشی۔ وحید کے انتقال کے بعد کچھ اور شعراء مثلاً صغیر د ہارد پوری اور تعشق مانکپوری سے بھی اصلاح لینے کی روایت سنی جاتی ہے۔ آپ کے کلام میں روانی اور سادگی کا عنصر غالب ہے غزل گوئی کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور ہم عصر شعراء میں اپنی تاریخ گوئی کی وجہ سے ممتاز تھے۔ اکثر محفلوں اور نجی نشستوں میں آپ سے تاریخ اور خاص طور سے اہم واقعات کی تاریخ کی فرمائش ہوتی تھی۔ ایسا تاریخ گو شاعر کڑا ہیں پھر پیدا نہ ہوسکا۔ صدہا واقعات کو نظم کا جامہ پہنا کر لوگوں کے نوک زباں کر دیا عارف اور صرف عارف ہی کا حق تھا۔ چند مزاروں کے کتبات اور لوگوں کے حافظہ سے استفادہ کر کے کچھ تاریخیں اس نیت سے نقل کی جاتی ہیں کہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں یہ بات ناپید نہ ہو جائیں اور لوگوں کے حافظہ سے محو ہو کر نہ رہ جائیں۔

عارف کی اولاد میں مولوی اعزاز حسین تھے جنہوں نے عالم شباب ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا عارف کے بھائی سید جواد الحسن تاکی (تانی) بھی شعر کہتے تھے جن کا تذکرہ صفحہ ۲۹۴ پہ ہے مگر ان کے خاندان میں عارف کی کوئی بیاض محفوظ نہیں ہے۔

غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

جو اُلفت کا آزاری ہے وہ جان سے اپنی عاری ہے
ہم پر تو ستم غیروں پہ کرم یہ شان جناب باری ہے
دم ناک میں بُندا لاتا ہے یہ کان کا موتی بھاری ہے
چل عارف سوئے کرب و بلا
دل ہند سے اب تو عاری ہے

دل ہمارا حلقۂ گیسوئے پیچاں میں رہا
سلسلہ زنجیر کا یوسف کو زنداں میں رہا
تو جلا اتنا کہ تالے تک پھپھولے ہو گئے
آسماں دیکھا اثر جو آہ سوزاں میں رہا
روز شانہ لاکھ ہو لیکن یہ چھٹنے کا نہیں
دل گرہ بن کر تمہارے موئے پیچاں میں رہا

بہار حسن دکھاتے ہیں کیا شباب کے پھول
تمہارے عارض رنگیں تو ہیں گلاب کے پھول
جو کھول اُس گل رعنا نے زلف دریا میں
تو شاخ موج نے صدقہ کئے حباب کے پھول

تمہیں درد سر کے بہانے سے حاصل — شب وصل صندل لگانے سے حاصل
تمہیں غیر سے مسکرانے سے حاصل — مرے دل پہ بجلی گرانے سے حاصل
تمہیں اٹھنے جب فکر کے سونے والے — کبھو پھر یہ شانہ ہلانے سے حاصل

کہہ دو اب بنت عنب آڑ سے آگے جائے
تاک میں رہتی ہیں زاہد کی نگاہیں اکثر

پئیں گے رندان لطف بنت شراب حسن شباب کب تک
رہے گا مالائے موج دریا پہ دور جام حباب کب تک

تاریخ وفات ذاکر حسین مدفون در کربلا

یہی تو نام بھی ہے ذاکر حسین بھی ہیں
یہ ذاکری کے لئے لکھنؤ سے آئے یہاں
بہار سبزۂ خط بھی نہ دیکھنے پائے
کہ ماہ غم میں گئے سوئے بوستان جناں
ہوئی ہے دیکھئے کیسی وفات کی تاریخ
مہ شباب زمیں میں ہے مثل گنج نہاں

محمدی بیگم قصبہ کڑا کی ایک رئیسہ تھیں ان کی وفات حسرت آیات پر عارف نے تاریخ لکھی تھی۔ اس تاریخ کی خوبی یہ ہے کہ اشعار میں مرحومہ کو تمام اولاد اور ان کے شوہر دیں رہیے بعد دیگرے کے نام اس خوبی اور نزاکت سے نظم کئے گئے ہیں کہ اشعار کی خوبی دوبالا ہو گئی ہے۔

رئیسہ و منتظمہ خوش جمال و نیک خصال
یلیح شکل محسن تھیں مزاج کی و فا
رہیں ہمیشہ وہ افضال حق سے مالا مال
انہیں کے ہاتھ میں بگڑے ہوؤں کا تھا بنا
نثار ان کی سخاوت پہ حاتم طے تھی
کسی کو دے گئیں گوہر کسی کو وہ پنا
کمال جاہ و حشم تھا کریم شاہد ہے
ہر ایک بات یہ اس کے تھا نفظ آمنا
ہوئی جو فوت تو افکار سال میں ان کی
یونہی میں بیٹھی بیٹھے ہوا جو چوکنا
تو بولا غیب سے ہاتف کہ کہہ دے یہ مصرعہ
عزیز چھوڑ کے خلد بریں گئیں جنت

حضرت خواجہ کڑک ابدال مدفون کڑا کے ستان جانب نتار بانو کے مزار پر بھی عارف کی کہی ہوئی ایک تاریخ کندہ ہے۔ جسے یہاں نقل کیا

جاتا ہے۔

ان کا نثار بانو تھا نام نکو جناب
تھیں اہل خانہ سیّد سردار حسین کی
ہے نام میر یاد حسین ان کے باپ کا
کرتے نہ تھے جدا وہ نظر سے انہیں کبھی
بچپن ہی تھا کہ ماں نے کیا خلد کا سفر
کیا چارہ بس مشیتِ پروردگار تھی
افسوس ہے انہوں نے بھی سنِ شباب میں
باغ جہاں سے گلشن جنت کی راہ لی
عارف نے کہہ دیا یہی مصرعہ وفات کا
یہ شمع نور آہ سر شام بجھ گئی

تاریخ تعمیر مکان صغیر النساء بی بی زوجہ سید اعجاز حسین خجندی ولد سید عنایت حسین کرہڈا۔

صغیر النساء بھی اک عابدہ ہیں
انہیں شغل ہے صرف ایمان و دیں کا
مکاں ایسا ہوا لیبا خوب صورت
کہ منظر ہوا دیدۂ حور عیں کا

جو محراب در کی طرف آپ دیکھیں   تو یاد آئے خم ابروئے مہ جبیں کا

لکھی اس کی تاریخ عارف نے یوں

یہی گھر نمونہ ہے خلد بریں کا

تاریخ وفات مولوی سید عبدالوہاب رئیس کرپا

نام نامی آپ کا تھا مولوی عبدالوہاب

تھے بہت باوضع خوش اخلاق خوشدل خوش سیر

آپ تھے ملک دکن میں صیغہ دارِ بندوبست

مل گیا تھا تو بلیت سے وظیفہ بے خطر

آپ کی سن بارہ سو تریسٹھ میں پیدائش ہوئی

تھی قضا وقتِ شب دوشنبہ اور سوم صفر

فکر جب کرنے لگی الیسی ہو تاریخ وفات

دیدۂ غم سے ذرا دیکھیں بھی تو اہل ہنر

لکھ دیا عارف نے کہہ کر معنیٔ ذات احد

چل بسے دارِ بقا کو دارِ فانی چھوڑ کر

تاریخ وفات بی بی نبیر النساء

نبیر النساء بیوی ان کا تھا نام!

فقط تیس ہی سال گذرے جہاں میں

یہ تھیں زوجۂ میر مشتاق حسین

سکونت رہی قرب بحر رواں میں

لہ محلہ دریا کنارے

سہ شنبہ تھا شوال کی تیسری تھی
کہ لائی قضا خانۂ جاوداں میں
ہوئی فکر تاریخ عارفؔ کو جس دم
کہا ہاتف غیب نے اس بیاں میں
تجسس ہی کیا چند الفاظ کافی
لکھو لبس یہی پہنچیں باغ جناں میں

عاشق

مولوی سید عبدالودود نام عاشقؔ تخلص مولوی سید غلام محی الدین نقوی المتخلص بہ ساجد کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ نے بردوان میں جاگیر بطور معافی پائی تھی۔ دینی تعلیم میں آپ کے اجداد کو کمال حاصل تھا اور آپ کے آبا و اجداد کا یہی پیشہ تھا۔ خاندان کے اکثر بزرگ حضرات بڑے صاحب فضل وکمال گذرے ہیں آپ کے والد دارالحکومت کلکتہ کے مدرسہ میں مدرس تھے۔ عاشقؔ کی ولادت قصبہ چوگھڑ بہ ضلع بردوان میں ہوئی، یہیں مکتبی تعلیم پائی۔ فارسی وعربی میں مہارت تامہ رکھتے تھے آپ کے اساتذہ میں مولوی محمد امین اللہ، مولوی سراج الدین علی خاں اور مولوی

لہ تذکرہ گلزار اعظم از تالیفات جناب امیر الہند والا جاہ نواب محمد غوث خاں بہادر متخلص اعظم بخط عبدالصمد در مطبع سرکاری بقالب طبع در آمد ۱۲۷۲ھ

علام سبحان خاں ایسے ذی علم حضرات رہ چکے ہیں۔ سنہ ۱۲۲۳ھ میں آپ مدراس تشریف لے گئے اور ضلع کنعور کے قاضی مقرر ہوئے اس کے بعد ترچناپلی تشریف لے گئے اور وہاں مفتی کے عہدہ پر پچیس سال رہے پھر چنگل پیٹ کی صدارت مل گئی اعضاء جسمانی کمزور ہوگئے اور پنشن حاصل کر لی۔ دیوان مرتب تھا عربی کی متعدد کتابوں پر تعلیقات و حواشی تحریر فرمائے تھے۔ ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۸ھ کو مدراس میں رحلت کی اور شاہراہ مبلا پور متصل مقبرہ دلبر جنگ بہادر مدفون ہوئے اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مگر راقم الحروف کو صرف فارسی کا نمونۂ کلام دستیاب ہو سکا ہے۔

بر خاک چو نقش پا فتادم
از من نرسد غبار کس را

از ماس مصحف روی تو گنہ نوشتہ اند
دست از جان شستہ در عشق وضو داریم ما

چین چین ما کہ دارم بر جبین وقت کہن سالی
بصد لب میکنم تفسیر رنج ضعف پیری با

چہ فائدہ کہ ہمدم دو روز پردازم
چو رخت خویش بہ بندم از این جہان تنہا

مرا عاشق بہ ایں ضعف بصارت مصرعۂ شوکت
چو میل سرمہ روشن مے کند چشم تماشا را

ندصبر ایں دل ناتواں   کارہا سخت جاہل افتاد است

ہنوز جنوں خواہد او بدن پوشید   سری کشد بعدم جامۂ کفن پوشید
بہ ایں فکر ز شوخی ہنوز عریاں است   ہزار بار اگر خلعت سخن پوشید

ازبس ز جمع مال جہاں من غنی بزم !
دست روم ز رعشۂ ولیلم براں بود

بار دل را برد اشکم جوہر نور در چشم
نقد را دزدم ربود و جنس را سیلاب برد

وزیں چمن کہ فتادم ز ہمدماں تنہا
چہ خط کشم من ازیں بیر بودن تنہا

تذکرہ صبح وطن مؤلفہ نواب والا جاہ امیر الہند اعظم الامراء مختار الملک سراج الدولہ
... خان بہادر بہادر جنگ متخلص بہ اعظم صفحہ ۱۳۱ سنہ ۱۲۵۷ھ

تشنۂ گفتار من عاشق ببیں یک عالم است
در دیار شاعری ما آبرو داریم ما !

دل به ابروی قاتل افتاده است
بے گناہم چہ بسمل افتاده است

از نگاهم چو یار میگذرد
دلم از اختیار میگذرد
در دلم نیشِ غم چہ میشمری
روز و شب صد ہزار میگذرد
می شمارد چو سبحہ را زاہد
بر لبم یار یار میگذرد

دلم ز گرمی حرص شراب می سوزد
بمنزلی کہ ز آتش کباب می سوزد

در سینۂ من داغ ہزار است بہ بنید
در گلشن من این چہ بہار است بہ بنید

سخن را آب و تاب از اشک دلسوزی چناں دادم
بگوشش ہر کہ می افتد کم از گوہر نمی داند

آفت از دیدہ ام کہ مپرس   رنج از دی کشیدہ ام کہ مپرس

ہمچو اطفال شوخ از مکتب   از دو عالم دویدہ ام کہ مپرس

بہ تمنائے بوسۂ لعلش   لب بدنداں گزیدہ ام کہ مپرس

بہر دفع گرمی غربت نزول سرو آہ بس
مونس تنہائی ما بے کساں اللہ بس

ز آتش عشق سوختم دل را   من بعالم شدم کباب فروش

منتظر را یک نظر انعام دہ   خشک مغزم روغن بادام دہ

اے نخل مراد آشنائی   از باغ دلم چرا جدائی

درعالم کن من و تو واحد   اینجا کہ دوئی چہ بے وفائی

بر زخم دلِ مریض عاشق　　　اے یار تو مرہمِ شفائی

عاشق[1] شدہ مجروح ز سر پنجۂ خوباں
ایں شہر دلا زا چہ شکارست بہ بنید
بہر یہ پا ساختی روزِ قیامت بسرم
آفتاب روئے یار و قامتِ چالاک بس

درک دہنت محال عقلی　　　در وصف لبت کجا رسائی

نیست در بازارِ عشقش غیر سودائے جنوں
میخرم ایں مال عاشق میبدہم فرزانگی

عابد

مولوی زین العابدین نام عابد تخلص مولوی امراللہ کے فرزند ارجمند تھے آپ مولانا وحید کے برادر بزرگ اور بڑے متقی پرہیزگار، عالم اور عبادت گذار شخص تھے۔ کڑا میں آپ کو لوگ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے

---

[1] تاریخ الاسکار من تالیف محمد قدرت اللہ خاں گوپاموی متخلص بہ قدرت۔ تاریخ ۲۱ رجمادی الثانی سنہ ۱۲۵۵ھ مطابق ۲۸ رجولائی سنہ ۱۸۴۳ء۔

تھے۔ عربی و فارسی کی تعلیم کی تکمیل گھر پر ہی کی اور خاطر خواہ دستگاہ حاصل کی۔ آپ کے علم و فضل کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ آپ سے بہت سے صاحب علم و ہنر اکتساب فیض کیا کرتے تھے۔ اسد اللہ الہ آبادی جن کا تذکرہ صوفیائے ہند میں آیا ہے آپ ہی کے تربیت یافتہ اور شاگرد تھے۔

شعر و شاعری سے دلچسپی تھی اور اکثر اوقات دوست احباب کے اصرار پر اپنے لکھے ہوئے چند اشعار سنا دیا کرتے تھے۔ کوئی دیوان مرتب نہیں کیا اور نہ اپنے برادر خورد کی مانند شاگردی اور استادی کے سلسلے میں منسلک ہوئے۔ شوکت نادری میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں پایا جاتا ہے

"شیخ زین العابدین عابد نام پسر مولوی امیر اللہ ساکن کڑہ است برائے طالب علمی در ہیں شہر دارد و شرح جامی بخدمت العلماء افضل الفضلاء مولوی سید زین العابدین صاحب درس می گیرد گاہے فکر شعری کند نقضے از کلامش ایں است۔"

در ہجر تو لاغر شدم چوں رستہ گوہر شدم
از بوئے تو کمتر شدم اے نازنیں اے مہ جبیں

ابتدا میں مولوی زین العابدین صاحب ضلع غازی پور میں منصف تھے انصاف، حسن خلق، نیک نیتی اور ہمدردانہ صفات کی اپنی مثال آپ تھے آپ نے سید عبد القادر مدراسی ثم المکی سے بیعت کر لی۔ حکیم سید عبد القادر ایک خدا رسیدہ اور درویش صفت انسان تھے جن کی طبیعت علائق دنیا سے بے زار تھی۔ سید عبد القادر اور زین العابدین کی ملاقات کا واقعہ بھی

عجیب وغریب ہے۔ ایک بار عابد بھوپال کی ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور فارسی میں کسی تصوف کی کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے کہ کوئی ایسا دقیق مقام آیا کہ عابد معروف بہ زین میاں اُسے بار بار پڑھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے مگر سمجھ میں نہ آیا۔ اتفاق سے ایک شخص کپڑا بیچتا ہوا ادھر گذرا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مسافر کسی اُلجھن میں گرفتار ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ آخر کار اس شخص سے نہ رہا گیا۔ اور دریافت کیا کہ اے بھائی مسافر تمہیں کیا دشواری ہے۔ زین میاں نے جواب دیا کہ فارسی کی ایک کتاب ہے جس کا مطالعہ کر رہا ہوں اور ایک مسئلہ ایسا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا فرمایا کہ اچھا پڑھو تو سہی زین میاں نے کہا تم کیا سمجھو گے آخر کار اس شخص نے پھر کہا اور زین میاں نے بادل ناخواستہ پڑھ دیا۔ اس شخص نے کہا اس میں کیا ہے اور پھر اس مسئلہ کی کافی وضاحت اور شرح بیان کر دی

اس پر زین میاں کی آنکھیں کھل گئیں اور کہنے لگے کہ آپ کوئی ولی اللہ ہیں۔ اور آپ ہی کی تو مجھے تلاش ہے انہوں نے بہت حیلے بہانے کئے مگر زین میاں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور انہیں سے بیعت ہو گئے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص عبدالقادر مدراسی ہیں بھوپال میں رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے تعلق ہے۔ زین میاں نے ان سے درخواست کی کہ حضرت آپ کڑا تشریف لے چلیے۔ زین میاں کے پرخلوص اور مکرر اصرار پر مولانا کو کڑا آنا پڑا۔ کڑا تشریف لانے کے بعد خاندان مولویانہ اور قصبہ

لے دیگر خاندانوں کے بے شمار حضرات آپ سے بیعت ہوئے۔
عابد کی طبیعت بھی علائق دنیا سے بیزار ہو گئی اور آخر مصنفی سے
مستعفی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گذارنے لگے۔ اس زمانے کے
بہت سے قصے اعزا اور احباب میں آپ کے متعلق ملتے ہیں بزرگوں سے
کچھ واقعات سنے گئے ہیں جو یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔
راقم الحروف کے نانا شیخ ریاض الحسن عثمانی ولد اظہر حسن عثمانی فرماتے
تھے کہ ایک بار امیر حسین صاحب عثمانی اور کڑا کے کچھ اور حضرات جو اس
وقت سن شعور کو پہنچ رہے تھے شہر کڑا کے مشہور و معروف "میلہ غازی میاں"
جسے "صحبت" بھی کہتے تھے جا رہے تھے۔ ریاض الحسن بھی بضد ہوئے اور غازی
میاں کے میلے جانے کے لئے اپنے والد اظہر حسن عرف الٰہی بخش صاحب سے
منتیں کرنے لگے اس وقت اتفاق سے ان کے یہاں محلہ بازار کی حویلی میں
زین العابدین تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے بچے کی ضد دیکھ کر کہہ دیا کہ
اچھا تم نہ جاؤ ان لوگوں کو جانے دو میں تمہیں میلہ دکھا دوں گا تم مت رو
غرضکہ ریاض الحسن مان گئے اور دوسرے حضرات "صحبت" دیکھنے چلے گئے۔
مولوی زین العابدین نے سوچا کہ چلو بات آئی گئی ہو گئی مگر تھوڑی دیر بعد
ریاض الحسن نے کہا کہ چچا آپ نے کہا تھا کہ صحبت دکھائیں گے۔ اب ہمیں
صحبت دکھائیے اور لے چلئے اور اپنا وعدہ پورا کیجئے۔ اس پر زین العابدین
صاحب نے پہلے تو انہیں ٹالا لا بعدہٗ ریاض الحسن نے جب بہت اصرار کیا
اور ضد کرنے لگے تو زین العابدین نے ان کا سر لے کر اپنی بغل میں دبا لیا۔

بس کیا تھا ان کی نظروں کے سامنے دریا کنارے کا وسیع میدان تھا جہاں
صحبت لگتی تھی۔ کباب کی دکانیں۔ چٹ پٹوں کے خونچے فیریی کی پرسیاں
خربنی، فالسہ۔ صراحیوں کے ڈھیر۔ کسگر کے برتن۔ کھلونوں کی دکانیں، غبارول
کے جھنڈ۔ ہری ہری ککڑیاں سب ہی کچھ نظر آ رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک سفید
گھوڑا کسی کا بدک گیا اور چھوٹ کر میلے میں ادھر اُدھر کودنے اُچھلنے لگا۔
میلہ میں افراتفری پھیل گئی اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ امیر حسین عثمانی وغیرہ جو
صحبت میں گئے تھے وہ بھی نظر آگئے اور اس بھاگم دوڑ میں اپنی جان
بچانے کی غرض سے دوڑ کر قریب کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئے تھوڑی دیر
میں گھوڑا پکڑا گیا اور لوگوں کو اطمینان حاصل ہوا۔ کچھ دیر بعد زین العابدین
صاحب نے ان کا سر اپنی بغل سے الگ کر دیا اور اب یہ پھر وہیں کے
وہیں محلہ بازار کی حویلی کے مکان میں موجود تھے انہیں بڑا اچنبھا ہوا۔
جب امیر حسین وغیرہ واپس تشریف لائے نور الحسن سے فرمایا کہ ہم
نے یہیں خوب صحبت دیکھی اور بڑا مزہ آیا۔ ان لوگوں نے دریافت کیا اچھا
بتاؤ کیا کیا دیکھا انہوں نے پورا واقعہ من وعن بیان کر دیا اس پر سب
کو بہت استعجاب ہوا اور زین العابدین صاحب کی بزرگی کا اندازہ ہوا
آپ کی بزرگی کا ایک اور قصہ زبان زد خاص و عام ہے ایک
بار ایسا ہوا کہ محلہ مولویانہ کی چھت پر آپ کے لڑکے مولوی غلام نور پتنگ
اڑا رہے تھے اور ایک دوسرا لڑکا ڈور کی چرخی لئے ہوئے تھا کہ اتنے
میں ایک اور لڑکا آ گیا اور اس نے غلام نور کی پتنگ جو پیچ لڑ رہی تھی

رک دی اور ڈور الجھا دی آخر کار غلام نوز کی پتنگ کٹ گئی غلام نوز
صہ آگیا اور اس لڑکے کو جس نے پیچ الجھا دی تھی ایک تھپڑ رسید
دیا مفوڑ لمحے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ابھی ابھی تو کوٹھے پر تھے اور اب اپنے
ان کے پچھواڑے جہاں چمپر دتی تھی وہاں کھڑے ہیں ان کو بڑی دہشت ہوئی
ر پورا واقعہ اپنے والد بزرگوار زین العابدین سے کہہ سنایا۔ مولوی صاحب
ب عامل و عالم باعمل تھے۔ ایک وظیفہ پڑھا جس سے ایک جن حاضر ہوا۔
س نے کہا تمہارے بچے نے میرے بچے کو ایک تھپڑ مارا تھا اس لئے میں
ما ایسا کیا مولوی زین العابدین نے اُسے ڈانٹا اور حکم دیا کہ تو آج ہی یہاں
ے چلا جا۔ اُس نے جانے کا وعدہ کر لیا اور وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا۔

عابد بڑے صاحب حال بزرگ تھے۔ اکثر اوقات معمولی باتوں پر
بد آجاتا تھا ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کے دیہات کا پاسی مکان پر
یا اور دستک دی۔ مولانا نے دریافت کیا کہ کون ہے جواب ملا "میاں کا پاسی"
یا سننا تھا کہ مولانا کو حال آگیا۔ دوڑ کر باہر تشریف لائے اور اس کا جوتا
ٹھا کر سر پر رکھ لیا اور یہی رٹنے لگے "میاں کا پاسی" "میاں کا پاسی" یعنی
یاں کے پاس کا رہنے والا۔ میاں دراصل اشارہ ہے اللہ میاں کی طرف
یہ سن کر مولانا پر کافی دیر تک حال طاری رہا۔

آپ کے انتقال کا بھی واقعہ اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ کہا جاتا
ہے کہ برسات کا موسم تھا اور سیتلا دیوی کا میلہ ہو رہا تھا جو کڑے میں بڑی
صوم دھام سے منایا جاتا ہے اور دور دور سے پجاری پوجا کی غرض سے

گاتے بجاتے اور بھجن پڑھتے آتے ہیں۔ اس میلے میں لوگ اس بار بھی گاتے ہوئے آ رہے تھے اور مولانا اپنے مکان محلہ مولویانہ میں بیٹھے وضو کر رہے تھے اس وقت ایک گروہ پجاریوں کا گذرا جس میں چند عورتیں مندرجہ ذیل دوہا گاتے ہوئے گذر رہی تھیں۔

جب درشن کو جی چاہئے | تو درپن مانجت رہئے
جب درپن لاگی کائی | تو درس کہاں سے آئی

مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو جلوۂ محبوب کی آرزو ہے تو اپنے دل کے آئینہ کو صاف ستھرا رکھئے۔ اگر دل کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا۔ تو جلوہ نظر نہیں آئے گا۔

یہ سننا تھا کہ زین العابدین صاحب کو وجد آ گیا اور بے اختیار پکار اٹھے۔

جب درشن کو جی چاہئے | تو درپن مانجت رہئے
جب درپن لاگی کائی | تو درس کہاں سے آئی

اور یہی کہتے کہتے ہاتھ سے لوٹا گر گیا اور بے ہوش ہو گئے آخرکار اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی وفات پر قطعۂ تاریخ محمد علیم الہ آبادی نے لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔

اولیں روز از ربیع نخست | چوں علیم از قضا رسیدش پیک
مولوی زین العابدین وردم | گفت با داعیٔ اجل لبیک
جن و انس و ملک چرند پرند | گفت ہر یک سنش سلام علیک

۱۳۰۵ھ

زین العابدین کی تجہیز و تکفین ۲ بائی قبرستان واقع اسمٰعیل پور میں ہوئی
زین العابدین کا غم کڑا اور الہ آباد میں بڑی شدومدّ سے منایا گیا۔

عاصی

عبدالسمیع نام۔ کاظمی نسب۔ عاصیؔ تخلص کرتے تھے آپ کا نام محبانِ کڑا کی مختصر سی مختصر فہرست میں بھی آنا لازمی ہے۔ مولد و مسکن محلہ قضیانہ تھا۔ تذکرہ تاریخ کڑا مانک پور کے صفحہ ۱۵۰ پر درج ہے۔ تاریخ صد سالہ کڑا (منظوم) میں بھی آپ کا تذکرہ صفحہ ۹۰ پر پایا جاتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی عبدالرحیم بنارس میں امین عدالت دیوانی تھے۔ عاصیؔ صاحب بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بنارس میونسپلٹی میں واٹر ورکس کے شعبہ کے نگراں مقرر ہوئے اور کچھ مدت اپنی خدمات بحسن و خوبی انجام دینے کے بعد مستعفی ہو کر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ عالیہ حیدرآباد دکن میں صدر مدرس ہو گئے۔ بعد میں آرٹس نظام کالج حیدرآباد میں کالج کے کلاس لیتے گئے۔ آپ نے اپنی تیس سال کی ملازمت انہیں مدارس میں گذاری اور پنشن حاصل کرکے کڑا تشریف لے گئے نوّے سال کی عمر میں ۲۶ رمئی ۱۹۵۴ء مطابق ۲۲ ررمضان ۱۳۷۳ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

آپ کو عربی، فارسی، انگریزی میں کافی مہارت حاصل تھی نہایت سخن فہم سخن شناس۔ نکتہ رس اور فہیم تھے۔ بڑے صوفی منش اور سنجیدہ طبیعت رکھتے

تھے۔ آپ کو وطن اور اہل وطن کا بڑا درد تھا۔ کڑا میں سن ۱۹۴۰ء میں "یاد وطن" کے عنوان سے جو جلسہ کیا گیا تھا عبد السمیع کاظمی اس کے سرگرم رکن تھے۔ عبید اللہ کاظمی اختر اور عبد المجید کاظمی دو صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ اختر کا تذکرہ صفحہ ۳۴۴ پر ہے موصوف نے اس کتاب کی ترتیب میں کافی امداد کی ہے۔

آپ کا نمونۂ کلام یہ ہے:۔

دل ناداں کی بات مانو گے — وہ بلاتا ہے تم کو آؤ گے

میں نے جب ان سے عرض شوق کیا
مسکرا کر کہا نہیں نہیں صاحب

بخش دے یا رب مرے سارے گناہ
اب تجھی سے ہے مجھے بس آسرا

میرے وطن کا یا رب ہو بول بال اونچا
تا حشر ہو کرے کا یا رب نہ بال بیکا

عدیلؔ

سید زوّار حسین نام۔ رضوی نسب اور عدیلؔ تخلص کرتے تھے صفدر حسین خواجہ کرکی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ولادت ۱۳۰۵ھ بتائی جاتی ہے۔ تاریخی نام جوّاد اصغر تھا۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ شہر سبزوار سے ہندوستان وارد ہوئے تھے آپ حضرت خواجہ کرک مجذوب کے بھائی سید محمدؒ کی اولاد سے تھے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ اردو میں شعر بہت اچھے صاف و سادہ کہتے تھے۔ آپ کی غزلیات کا قلمی مجموعہ آپ کے صاحبزادے سید جعفر حسین کے پاس موجود ہے۔ کلام میں سادگی، محاورے کا بے ساختہ پن اور داغؔ کے تتبع کا رنگ جھلکتا ہے۔ داغ کی بہت سی غزلوں پر انہوں نے بڑی کامیاب غزلیں کہہ کر اردو ادب میں بڑا قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

کچھ مدت نہر کے محکمے میں ملازم رہے۔ ایام شباب میں پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ بنوٹ سے بھی واقف تھے۔ تیراکی بھی اچھی جانتے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ قصبہ میں ہی گذارا۔ یہاں کی علمی و ادبی مجلسوں کے روح رواں تھے اور مجلسوں میں آپ کے دم سے بڑی شگفتگی رہتی تھی۔ متینؔ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ کتب بینی کا شوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ جہاں کہیں بھی نئی کتاب پاتے بغیر مطالعہ چین نہ لیتے تھے۔ متینؔ۔ مجید احمد قیسؔ۔ فضل احمد عزیزؔ افتخار حسین افتخارؔ۔ اکمال الدین اکمالؔ۔ کبیر الدین ظہیرؔ وغیرہ کی صحبتوں میں

آپ کا اکثر وقت گذرتا۔ شعر گوئی کا یہ طریقہ تھا کہ عموماً رات کو بستر پر لیٹ کر فکرِ سخن کرتے تھے اور اندھیرے میں دیوار پر پنسل سے لکھتے جاتے تھے۔ صبح اُٹھ کر کاغذ پر نقل کر لیتے تھے اور دیوار کی لپائی کرا دیتے تھے۔

آپ کے بڑے فرزند باقر حسین دہلی میں ملازم تھے، ستمبر ۱۹۴۷ء کو فرقہ وارانہ فساد میں دہلی میں شہید کر دیئے گئے۔ بیٹے کی شہادت کا بہت شدید اثر عدیل پر ہوا اور بالکل خاموش ہو گئے۔ تندرستی خراب ہو گئی۔ اور اس غم نے گھن کی مانند انہیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا اور یہی غم لیئے ہوئے بالآخر ۱ر اپریل ۱۹۴۹ء مطابق ۱۱ر جمادی الثانی ۱۳۶۸ھ کو بروز یک شنبہ راہیِ ملکِ عدم ہو کر کڑا کی علمی و ادبی صحبتیں سونی کر گئے۔ کڑا کی ویرانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ادیبوں کے دل سنسان اور غم زدہ ہو کر پکار اُٹھے کہ کڑا ویران ہو گیا۔ سیّد محمد طاہر (برادر سیّد محمد رفیع نقوی) نے تاریخ وفات لکھی۔

کس کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں کون دنیا سے اٹھا
کس کے غم میں آج گریاں ہر جوان و پیر ہے
جستجو کرتا ہے کیوں اس کی جہاں میں اب یہ کہہ
گلشنِ فردوس میں نوّاب کی جاگیر ہے

۱۳۶۸ھ

ایک اور تاریخ وفات سید حیدر حسین حیدرؔ نے بھی کہی ہے، جو درج ذیل ہے:-

رحمتِ حق حُبِّ علیؑ سے کے ساتھ
خلدِ بریں میں گئے ذوار حسین

۱۳۶۸ھ

اب عدیلؔ کے دو لڑکے جعفر حسین اور کاظم حسین باقی ہیں جعفر حسین گورنمنٹ پریس الہ آباد میں اور کاظم حسین انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ کانپور میں ملازم ہیں۔

ایک بار آل انڈیا میتھاریکل سوسائٹی کی کانفرنس کا اجلاس کڑا میں ہوا تھا اس موقعہ پر موصوف نے ایک نظم پڑھی تھی جس کے صرف دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

مساجد تو کم بیشتر مقبرے
نواحِ کڑا میں ہیں اب تک سنے
گزوں جن کی بنیادیں بھی کھل گئیں
مگر مقبرے جہاں پر دہیں ہیں کھڑے

خواجہ کڑکؒ کی درگاہ سے گاگر اٹھ کر دریائے گنگا تک جاتی ہے جو وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں سے گاگر بھر کر پھر مزار تک گاگر لے جانے میں قوال گاتے ہوئے گذرتے ہیں اس موقعہ کے لئے عدیلؔ نے ایک نظم بعنوان گاگر لکھی ہے جو مجھے سید ابرار حیدر کوثرؔ الہ آبادی نے روانہ کی ہے۔ گاگر یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"گاگر"

جام جم ہے کہ ہے یہ تاج سکندر گاگر
پنجتن پاک کا سایہ ہے کہ سر پہ گاگر
ہر گھڑی ہر زماں رٹتا ہوں میں گاگر گاگر
دل میں گاگر ہے مرے میری زباں پہ گاگر
بھر دیا دانۂ الٰہی سے علیؓ نے اس کو
ہو گئی اب تو حقیقت میں سمندر گاگر
حوریں جنت میں پکاریں کہ مبارک ہو انہیں
خواجہؒ کرٹی جو چلے سر پہ اٹھا کر گاگر
اس طرح مالی نے پھولوں سے سجایا ہے اسے
تربت خواجہ کرٹک پہ ہے گل تر گاگر
گر محبت ہو حقیقی تو حقیقت میں عدیلؔ
بھر کے دیں ساقیؑ کوثر لب کوثر گاگر

عزیز حسن

عزیز حسن نام عزیزؔ تخلص۔ فاروقی النسب تھے آپ کے والد ماجد محمد اسمٰعیل عرف میاں جان میاں رشید منٹی میں جہاں ان کی زمینداری تھی اقامت

لہ یہ ایک محلہ ہے اور اس کے اہالیان بھی خواجہ کرٹی کہلاتے ہیں۔

گزریں تھے۔ آپ کے دادا لطف اللہ میاں اطراف واکناف میں اپنی شرافت کی وجہ سے مشہور تھے لطف اللہ میاں کی قبر رشید مئی میں اکھاڑہ کے میدان میں ہے۔

اہل علم آپ کی علمی لیاقت و قابلیت کے معترف تھے عربی و فارسی میں درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد علی گڑھ میں زیر تعلیم رہے اور وہیں کے انڈر گریجویٹ تھے۔ ادبی و علمی ماحول نے ان کو شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے دے رکھا تھا۔ اکثر اوقات گڑاسکے مشاعروں میں شرکت کر کے اچھے نفیس اشعار سے حاضرین کو محظوظ کرتے رہے۔ جلیل مانکپوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اپنے گاؤں رشید مئی سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ آخر ایام زندگی اگرچہ آپ نے حیدرآباد دکن میں گذارے مگر رشید مئی اور یہاں کے لوگوں کے متعلق اکثر اوقات جب کبھی تذکرہ ہوتا تو گلوگیر ہو جاتے اور جب راقم سطور کے ماموں بدر الحسن صاحب عثمانی جو آپ کے داماد تھے رشید مئی سے واپس حیدرآباد تشریف لے جاتے تو تفصیلی طور پر ہر چھوٹی چھوٹی بات تک کے حالات دریافت کرتے۔

تصوف سے بڑا شغف تھا سلسلہ نقشبندی میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج کے مرید تھے آپ کے دو صاحبزادے احسن اور احسان اب حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں۔ کلام حاصل کرنے میں راقم الحروف کو حسن کدو کاوش کا سامنا ہوا اور جو ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑے ان کے تفصیلی تذکرہ کا وقت نہیں البتہ اتنا کہنا ضروری ہے کہ ایک نوٹس اور نیکچا حفظ لکھا گیا تو ان کے صاحبزادگان کو سخت اذیت پہنچی اور بدر الحسن صاحب

عثمانی بعد فریضہ حج بیت اللہ سے واپس حیدرآباد تشریف لے گئے تو ان حضرات سے میرے ترش اور سخت خط کی شکایت کی۔ القصہ بعد ہزار دقت مہ بدرالحسن صاحب عثمانی کی معرفت موصوف کا کچھ نمونۂ کلام دستیاب ہوا جو ہدیۂ قارئین ہے۔

جواب عرض مطلب کی نہ صورت رہ گئی باقی
انہوں نے طاق نسیاں پر ہماری داستاں رکھ دی

اُڑی پھرتی ہے کیوں بلبل صبا یہ ماجرا کیا ہے
یہ کس وحشت زدہ کی خاک زیر آشیاں رکھ دی

ثمر بھی گل بھی برگ سبز بھی جو کچھ میسر تھا
چمن کی ساری دولت لاکے پیش باغباں رکھ دی

نئے نقش قدم سے جا بجا صدہا پری جانے
اسی پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی تصویر کو تم نے جہاں لکھدی

سر شوریدہ اپنا اور ذوق آستاں بوسی
یہ عالم تھا کہ پیشانی یہاں رکھدی وہاں رکھدی

بتائے کون کس کو ہوش ہستی نیستی کیسی
کہ ہم نے طاق نسیاں پہ یہ فرضی داستاں لکھ دی

تیری جادو نگاہی نے یہ کی ہے شعبدہ بازی
جگر میں درد اشک آنکھوں میں اور لب پہ فغاں لکھدی

بتانے تم کو محو دید کیا اپنی حقیقت کو
نہیں معلوم مدہوشی میں وہ ہستی کہاں رکھ دی
برنگ عکس آئینہ وہی صورت ہوئی پیدا
نگاہ لطف نے تیرے مری ہستی جہاں رکھ دی
ستارے آسماں سے جھانکتے ہیں کس کو جھک جھک کر
تری تصویر کس نے آج زیر آسماں رکھ دی
قدم پر سر کو رکھنا تھا زمیں پر سجدہ کر ڈالا
یہ پیشانی کہاں رکھنے کی تھی ہم نے کہاں رکھ دی

لگا درد جگر چھپ چھپ کے دینے کام نشتر کا
بہا خون جگر ہو کر کے آنسو دیدۂ تر کا
عبث الزام کشتوں پر ہے داغ خون احمر کا
ہمارے خوں نے دھو ڈالا غبار آج اسکے خنجر کا
ذرا آ کر کے دیکھو تو تماشہ دیدۂ تر کا
نہ دیکھا ہو جو کشتی سے کبھی بہنا سمندر کا
لگاؤ شوق سے تم وار پہ وار اپنے خنجر کا
دہان زخم کو لطف آئے ہے قند مکرر کا
ہوا محو تصور یوں بنا تصویر حیرانی
کھلی ہے آنکھ اختر یوں بنا ہے جسم پتھر کا

میرے نالوں نے پہنچائی تعشق کی خبر ان تک
نکالا کام آہوں نے مرے بالِ کبوتر کا
کیا گم اپنی ہستی کو ترے ظلماتِ گیسو میں
نہیں بے جا اگر دعوےٰ کروں تختِ سکندر کا
تجسس میں کسی کے روح پہنچی تا بہ علیین
ذرا دیکھے کوئی اڑنا مرے اس مرغِ بے پر کا
حسینانِ جہاں میں ہی کسی کی ہے جھلک آتی
عیاں ذرہ سے ہوتا ہے سراسر نور خاور کا
یہ مقصد تھا کہ ماتم کشتۂ گل کا کرے بلبل
چڑھانا تھا عبث کیا قبر پہ پھولوں کی چادر کا
چلے تھے تشنۂ دیدار کچھ کہنے کو مقتل میں
یہ کیا سمجھے تھے ہووے گا گلوگیر آب خنجر کا
عزیز اک اور ہی بت کا دکھائیں گے تمہیں جلوہ
ذرا آئے تو قسمت سے ہمارے روز محشر کا

دیر میں کعبہ میں یا جا کے کلیسا دیکھیں
سخت حیراں ہیں کہاں پر تجھے جویا دیکھیں
رعب حسن آئے نہ ملتے تو تجھے پھر کہنا
تیری محفل میں ہلے تو لب گویا دیکھیں
روز کہتا ہے جنوں سر بہ گریباں کیا ہو
آؤ بھی چل کے ذرا دامنِ صحرا دیکھیں
دل جو ہے خانۂ اللہ وہ کرلے ہے خراب
عشق کی آپ ذرا حرکتِ بیجا دیکھیں

تم تو جانبازی عشاق بہت دیکھ چکے / ہم بھی اب آپ کا اعجاز مسیحا دیکھیں
آج ہم مر کے ترے عشق سے باز آتے ہیں / اور پھر کس کے بندھے سر پہ یہ سہرا دیکھیں
نام میرا ہی نکل آئے گا عشاقوں میں / اپنی زلفوں کا اگر آپ سیاہا دیکھیں
پتلیاں یہ ہیں کہ ہے عکس کسی کے قد کا / کیا چھپائے ہے مری آنکھ کا پردا دیکھیں
لے کے دل جاتے ہیں بازار حسیناں میں عزیز
آج بک جائے کہ رہ جائے یہ سودا دیکھیں

پھر بھلا کیونکر نہ مرغ دل مرا نخچیر ہو / بر پہ تیہاز گران کے نگہ کا تیر ہو
اس لیے جاتے نہیں گور غریباں کی طرف / خاک عشاقاں نہ شاید ان کے دامن گیر ہو
آہ ہے نالہ ہے گریہ ہے فغاں ہے شور ہے / اور کیا ان کے جگر کرنے کی اب تدبیر ہو
داغ کو دکھا ہے جس نے مار گیسو کو عزیز
کہہ دو جو خواب پریشاں کی مری تعبیر ہو

دیکھی ہے شکل خواب میں کس لالہ فام کی / آنکھوں کی نیند کس نے اڑا لی حرام کی
دن تو ترے فراق کا گزرا بصد الم / سر پہ اب اور ایک بلا آئی شام کی
پردے یہاں تو پڑتے ہیں آنکھوں پہ سرخ میں / چلمن اٹھے گی دیکھیے کب ان کے بام کی
ساقی کا ہاتھ بھی نہ بڑھا تھا کہ چل بسے / حسرت سی دل حزیں میں رہی ایک جام کی
کیسے کہیں گے راز کی باتیں بھلا عزیز
پردا کیسے ہے خستہ دلوں کے کلام کی

ہو گلہ ضعف دست پائی کا — یا کہ آہوں کی نارسائی کا
دل دھڑکتا ہے ہوش اُڑتے ہیں — نام مت لیجئے جدائی کا
لیجئے خنجر گلا بھی حاضر ہے — حال پر دیکھئے کلائی کا
آئینہ دیکھ کر ہوئے حیراں — جن کو دعوے تھا ایکتائی کا
اشک بے ساختہ نکل آئے — ذکر جب آگیا جدائی کا
آج وہ ہیں کہاں حسن جہاں — جن کو عزہ تھا دلربائی کا

ضعف نے یوں کیا عزیزؔ نحیف
بن گیا نقش چارپائی کا

غزلیات فارسی :-

مے دوائی لسکہ شد با نور کاب اندر کاب — دررہ دعدہ ہمی بینیم سراب اندر سراب
شوق دیدار تو خواہاں بے تعرض بنگرم — پردہ ہائے چشم مارا شد حجاب اندر حجاب
اشک سوز الم بچشم آفرین تیخالہ کرد — العجب اینک کہ پیدا شد حباب اندر حباب
روئے او بنگر کہ از باغ صبا یک گل شگفت — عرق رولیش بیں کہ پیدا شد گلاب اندر گلاب
چہرہ وا کردی جمالت مانع دیدار شد — وائے بر من کیں صلابت شد نقاب اندر نقاب

در شب ہجراں بیاد زلف واللہ سربسر
از تو می بیند عزیزؔ اینک عذاب اندر عذاب

عریانم و مستورم چون خود به سحاب اندر
معدوم چون عکس به آب اندر

دستار گہے بندم زنار گہے دارم
تبدیل کنم ہیئت چون دو بخضاب اندر

از سوز درون من گویم کہ عزیز اینک
می سوزم دی لویم مرغم به کباب اندر

سختی انتظار در ہجران | روز من ماہ و ماہ سال نمود
قصۂ سخت جانی، عشاق | تیغ آن شوخ انفعال نمود

سالے دیدہ ام بہ مستی عشق
جام جم کاسہ سفال نمود

قصیدہ در نعت سرکار دو عالم

نہ تنہا ابروت زد در دل مجروح نشترہا
نگہ ہم مشتعل کردہ دادن سینہ مجمرہا

پے قتل ہمہ عشاق ابرو ہمچو خنجرہا
برائے تشنہ کاماں بردوچشماں است گوہرہا

غلط گفتم چہ نسبت باشد از چشم تو کوثر را
درست این است گویم کز وحدت دو ساغرہا

مداں بے وجہ چشماں لابہ مارلئے خط فذ ہا
خط منشور توحد است دار وصاد بہ سر ہا

زتاب چہرۂ نورانی تو در شب اسریٰ
بہ حیرت ماند د ابر چرخ اعز چشم اختر ہا

چساں گویم رخ پر نور تو مہتاب با فا در
بہ پیش نور حق باشد چہ نور مہ و خاور ہا

ببیں چشم بلور بنت نمود آوارہ آہو را
ببیں زلف سیاہ تو بہ پیچ انگندا ژدر ہا

چو تاب گوہر دنداں تو در اشتعال آر
کرم مطلق ار لغزت بر آب انداخت گوہر ہا

ازاں چنیں کہ رفتی بر فلک از آں زماں ہر شب
فلک در انتظار ت دائما بد چشم اختر ہا

اگر ہستی من چہ غم لعد است بہر ما
چرا تر نزدیک محشر ملی ترسم محشر ہا

چناں از داغہائے سینہ کردم گلشنے پیدا
کہ ہر گل از گل داغم شدہ رشک صنوبر ہا

شمیم گیسوس در غنچہ دل کردہ ام پنہاں
صبا معذور دار اکنوں ز بوئے مشک دعنبر ہا

چہ بگوی عزیزا کنوں کہ ممکن مدح او باشد
تکمیل منت پیمودن بود آب سمندرہا

خدایا تا نہاں است آب حیواں در رہ ظلمت
عزیز چرخ النساں آمد دریہ افلاک اختر ہا

جہالت در دلم یا داد من او بحر عشقت عرق
چناں بال صدف دار در درون بحر گوہر ہا

عزیز

شیخ عزیز حسن نام عزیزؔ تخلص کرتے تھے۔ مولد و مسکن محلہ چوک ہے شعر و شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ آپ کے بچپن میں کڑہ اشعر و سخن کی آماجگاہ تھا۔ مصرع طرح دیئے جاتے اور لوگ طبع آزمائی فرماتے۔ عزیزؔ بھی ایک پُرگو شاعر تھے نئی زمینیں پامال کرتے۔ آپ کے والد محمد حسن نے آپ کو عربی فارسی کی تعلیم دلوائی تھی اور چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا دنیائے علم و فن میں نام پیدا کرے۔ محمد حسن کا ننہال علوی خاندان میں تھا۔ جہاں شیخ بشیر علی بشیر اور شیخ اصغر علی جیسے ذی علم حضرات تھے جن کے علم و فضل کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مولوی بشیر علی کا نام اہل علم حضرات کے لئے کوئی نیا نہیں ہے ان کا مختلف کتب میں تذکرہ پایا جاتا ہے اختر حسن نے ایک تذکرہ یعنی نسب نامہ صدیقی مرتب کیا ہے جس کے صفحہ ۶ پر آپ کا نسب نامہ دیا ہوا ہے

عزیزؔ کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکے شیخ حبیب حسن تھے ایک لڑکی کی شادی ضیاء الدین احمد فخرؔ سے ہوئی تھی جن کا تذکرہ صفحہ ۱۷۹ میں ہے۔ فخرؔ کے

لڑکے ناصر الدین نے آپ کا نمونہ کلام روانہ کیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے
ناصر الدین کا ذکر بھی ص۳۹۲ پر موجود ہے۔ عزیز کا سن وفات نہیں معلوم ہو سکا البتہ
لوگوں سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۲۰ء سے قبل وفات پائی۔ آپ کا
قلمی دیوان "دیوان عزیز" کے نام سے راقم الحروف کو "شیخ محمد" صاحب آڈیٹ
آفیسر پاکستان سے دستیاب ہوا جس میں آپ کی بے شمار غزلیں اور قصائد
پائے جاتے ہیں وہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

آپ کا نمونہ کلام یہ ہے۔

مسکن نہیں کچھ کعبہ و بتخانہ کسی کا — ہر گھر میں ہے اک جلوۂ جانانہ کسی کا
ٹوٹا نہیں تیشہ ترے ہاتھوں سے ہے گر کر — دل چور ہے لے نعرۂ مستانہ کسی کا
کچھ قتل کا اپنے مجھے افسوس نہیں ہے — یہ ڈر ہے کہ دکھنے نہ لگے شانہ کسی کا
وہ بھول سا اپنا رُخ رنگیں جو دکھا دیں — اس طرح نہ تڑپے کبھی دیوانہ کسی کا

صحرا میں عزیز اس کی بسر ہوتی ہے اوقات
ہوتا ہے کبھی کوئی جو دیوانہ کسی کا

کون کہتا ہے دُرخ یار پہ یہ دل آیا — ایک نالہ تھا جو گرد مہ کامل آیا
گرد اٹھی کہ وہ لیلیٰ کی سواری آئی — ہر گھڑی نظر قیس سے محمل آیا
نہ ملا پھر نہ ملا دل ترا مجھ سے ظالم — جا کے نالہ مرا تا عرش سے بھی مل آیا

جب تک جمال یار کا آنکھوں میں نور تھا — ذرے پہ بھی نظر جو پڑی کوہ طور تھا

ہم دیکھتے ہیں جلوۂ برقِ جمالِ دوست — غش کھانے کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا
تیرے ہی عفوِ رحم نے ترغیب دی مجھے — یعنی اگر قصور کیا کیا قصور تھا
افسوس ہے وہ دوست عدو ہو گیا مرا — حسن پہ ہمیشہ ناز تھا حسن پہ غرور تھا
بلبل میں گل میں شمع میں پروانہ میں عزیزؔ
دیکھا جو غور سے تو اسی کا ظہور تھا

خود داغِ کنار ہے کس کا — گل چراغِ مزار ہے کس کا
دامن ناز سے جو لپٹا ہے — ہائے مشتِ غبار ہے کس کا
حال طبیب ہو گے رہ گئے ہیں کیوں — نزع میں انتظار ہے کس کا
درد نے کس کی اٹھ کے کی تعظیم — رم میں یہ وقار ہے کس کا
جل بسے سینکڑوں جہاں سے عزیزؔ
اب نہیں انتظار ہے کس کا

صرفِ حال کی قاصدے کچھ رسائی کیا — عزیزؔ آپ نے دل کی مراد پائی کیا
بتائیے جاؤ مجھے شوق سے برائی کیا — نہیں کہو کہ نہیں کہنی ہے خدائی کیا
کسی کا آکے مری لاش پہ یہ کہنا ہائے — تجھے فراق میں کیسی نیند آئی کیا
تمام عمر گذاری ہے مئے پرستی میں — کرے گا کوئی ہماری سی پارسائی کیا
تمام شعر عزیزؔ اس لے جب سا تو کہا
ہمیں بھی آپنے کی طبع آزمائی کیا

جو شخص تیرے عشق میں اندوہگیں نہیں
دونوں جہاں میں اسکا ٹھکانہ کہیں نہیں

لو رات بھر میں آج یہ قصہ ہی ختم ہے
درد جگر نہیں کہ سحر تک ہمیں نہیں

ہو گئے وصال یار کے اب کس کے منتظر
افسوس حسرتیں بھی تو دل میں ہیں نہیں

اس در سے پھر تجھے تو نہ اٹھنا تھا عمر بھر
اب اے عزیز تیرا ٹھکانہ کہیں نہیں

ہماری آہ میں ہے اس قدر اثر دیکھو
چلے وہ آتے ہیں تھامے ہوئے جگر دیکھو

شب فراق کی ہوتی ہے کب سحر دیکھو
سو رات ہوتی ہے کس طرح سے بسر دیکھو

نہ گالیاں دو سر بزم بیٹھ کر دیکھو
ہمارے بھی ہے زباں ہم بھی ہیں بشر دیکھو

تمہاری نظروں کی ہم نے بھی دیکھ لی تاثیر
ہماری آہ کا تم بھی ذرا اثر دیکھو

حرم کو جاتے تھے از بتکدے میں آ نکلے
کدھر کا قصد تھا اور آ گئے کدھر دیکھو

اُمید رحم کی اس سنگ سے گو نہیں ہے عزیز
پر اب کی اور بیاں اپنا حال کر دیکھو

کہتا ہے کوئی بت کوئی کہتا ہے خدا ہو
اب پردہ اٹھا دو تمہیں دیکھیں بھی تو کیا ہو

اس پردہ نشینی میں تو ہو فتنۂ عالم
گر سامنے آجاؤ تو کیا جانئے کیا ہو

کس یاس سے پلٹی ہوئی آتی ہے فلک سے
تیری ہی کہیں اے دل مضطر نہ دعا ہو

جو تم سے کوئی مانگے اسے دیدو اگر تم
ست کاہے کو کہلاؤ سبھی سمجھیں خدا ہو

رحمت نے تو اکرام کا اقرار کیا ہے
یہ اپنی خطا ہے نہ اگر کوئی خطا ہو،

رو دیتے ہیں وہ سن کے مرا حالِ مصیبت
ہاں دیکھ کہیں اب نہ کوئی آہ رسا ہو

مقبول عزیزؔ اب تو ہو صدقہ میں تمہارے
تم خاصِ خداوند ہو محبوبِ خدا ہو،

مجرم ہوں اگر میں تو سزا کیوں نہیں دیتے　　اس روز کے جھگڑے کو مٹا کیوں نہیں دیتے

باقی ہو کوئی اور ستم تمارہ تو کہہ دو،
آخر مجھے مرنے کی رضا کیوں نہیں دیتے

مارا ہے مجھے تم نے تو اب دفن بھی کر دو
مٹی کو ٹھکانے سے لگا کیوں نہیں دیتے

کس تار سے کہتے ہیں وہ دل کے سہارا
اب تم ہمیں اس دل سے دعا کیوں نہیں دیتے

مجمع ہے عزیز اس شہِ خوبی کے جو در پر
تم جا کے فقیرانہ صدا کیوں نہیں دیتے

ساقی ہے مے ہے ابر ہے فصلِ بہار ہے
بادہ کشوں پہ رحمتِ پروردگار ہے

اگلے برس بھی پھر یہی فصلِ بہار ہے
توبہ ہماری توبہ کا کیا اعتبار ہے

یادِ بتاں میں دل جو مرا بے قرار ہے
اس میں بھی کچھ مشیتِ پروردگار ہے

یارب یہ کون چٹکیاں لیتا ہے بار بار
پہلو میں یار ہے کہ دلِ بیقرار ہے

نکلا جو میکدے سے تو بوتل بغل میں تھی
سمجھے تھے ہم عزیز کو پرہیزگار ہے

جس نے کہ رسولِ دوسرا کو دیکھا
اک دُرِ یتیم بے بہا کو دیکھا

جب دیدۂ حق بیں سے نظر کی ہے عزیز
اس صورتِ زیبا میں خدا کو دیکھا

پہنچے جو سراپردۂ خلوت میں حضور
کچھ دیر رہے شانِ رسالت میں حضور

پھر کچھ نہ رہا بجز خدا کے باقی
ایسے ہوئے محو رنگِ وحدت میں حضور

پل بھر میں مکاں سے لامکاں تک پہنچے
اللہ اللہ وہ کہاں تک پہنچے

جبریل کو قدرت نہ رہی بڑھنے کی
پہنچا نہ جہاں کوئی وہاں تک پہنچے

علی

مشہور ہے کہ شاہ صاحب سرزمین ایران سے دہلی تشریف لائے ۔ شہزادہ داراشکوہ نے اپنی مصاحبت میں رکھا اور جب عالمگیر سے شکست کھا کر

داراشکوہ دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوا تو شاہ صاحب بھی لاہور تشریف لے آئے اور شیخ حسین شاہ ڈھڈا لاہوری کے مرید اور پھر خلیفہ ہوئے۔ پہلے آپ کا نام علی تھا داراشکوہ کے حضور میں پہنچنے پر "دیوان" کا اضافہ ہوا اور درجہ فقر میں پہنچ کر آپ کے نام میں "گدا" کے جز کا بھی اضافہ ہو گیا آپ کو سیاحی کا شوق تھا اور اسی شوق میں کڑا پہنچے یا ئیے گنگا کے کنارے اکبر پور میں ایک بلند ٹیلہ پر آپ نے اپنا مسکن بنایا جو اب "تکیہ گدا علی شاہ کہلاتا ہے۔ یہ مقام نہایت پر فضا ہے اور صوفیا درویشوں کے لئے بہت اچھی جگہ تصور کی جاتی ہے۔ یہاں قصبہ کے ہنگامے اور لوگوں کی چہل پہل نہیں ہے مگر قدرتِ خداوندی کے بیشمار مظہر پائے جاتے ہیں۔ لوگوں کا وہاں سے آنے کو دل نہیں چاہتا۔

آپ کے انتقال کا واقعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اتفاقاً ایک بار آپ کا پاؤں پھسل گیا اور آپ ٹیلے سے نشیب کی طرف گر گئے۔ جس سے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی آپ نے فرمایا کہ شاید مرضی مولا یہی ہے کہ میں یہیں رہوں۔ آپ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکے اور اپنی روح کو خدائے قدوس کے حوالے کر کے یہاں کی خاک میں پیوند ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ شہزادگان ایران میں سے تھے۔ "واللہ اعلم بالصواب" آپ کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ ایک روایت ہے کہ آپ خواجہ کڑک کے زمانہ میں کڑا تشریف لائے تھے۔

آپ کو فارسی کا اچھا خاصہ علم تھا آپ کا "الحروفی" ایک دیوان فارسی میں اب تک موجود ہے۔ دیوان اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں مشہور غزلیں پائی جاتی ہیں۔

افسوس ہے کہ مرحوم کا دیوان آج تک طبع نہ ہو سکا۔
آپ کے کوئی اولاد نہ تھی اس وجہ سے سلسلہ نسب کچھ آگے نہ چل سکا
آپ کی دوسری تصانیف کا بھی کچھ علم نہ ہو سکا مذکورہ بالا دیوان کی غزلوں میں سے اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے چند اشعار اردو میں بھی کہے ہیں مگر راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہو سکے۔

نمونہ کلام فارسی یہ ہے۔

دم تسلیم می باید براہ عشق اوّلہا
کہ تا آساں تواں رفتن دریں وادی بمنزلہا

ہوئے دوست گردای رضائے دشت کن رہبر
کہ اندر در سفر مانُد برادر راہ مشکل ہا

علی مارا اگر جوید دم غافل مشوار ما
مرا از ناتواں دیدن بمنزلِ خانۂ دلہا

با راز خدا محرم اسرار تواں بود	با نور خدا شاہد انوار تواں بود
با نور ہدایت برہ کعبہ تواں رفت	با احمد سالار دریں کار تواں بود

چشم مست و دیدہ مست و غمزۂ غماز مست
عقل مست و فکر مست و صورت جانانہ مست

باغ مست و راغ مست و ہم ہر گلزار مست
مست قمری مست طوطی بلبل افغانہ مست

بیا بیا بدل و دیدہ شادمانی کن　　لجلوہ ناز در میں خانہ دلستانی کن

عماد

سید عماد الدین نام عماد تخلص کرتے تھے آپ کے والد بزرگوار سید شاہ کبیر الدین احمد ظہیر اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے جن سے کرڈے کے اکثر شعرا نے استفادہ کیا ہے ظہیر کو اپنے فرزند کی شاعری کا حال بھی معلوم تھا مگر وہ اسے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ نوجوان شعرا کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو عماد کا نام نامی سرِ فہرست ہوگا۔ آپ مترنم لہجہ میں غزل پڑھتے تھے۔ اور کڑا میں اپنی خوش الحانی اور خوش گوئی کی بنا پر ممتاز تھے۔ آپ کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور علامہ نوح ناروی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شعر و شاعری میں کمال مہارت تھی آپ کی شاعری کے تذکرے اب بھی فیض احمد فیضی اور آفتاب احمد گوہر وغیرہ کئے کرتے ہیں۔ بڑے نیک شریف اور منکسر سے انسان تھے مگر اشعار میں بلا کی جان تھی۔ کڑا میں اکثر حضرات آپ کے اشعار پر داد و تحسین کے کلمات سے اب

تک یاد کرتے ہیں۔ تاریخ ولادت ۱۹۰۶ء بتائی جاتی ہے۔ مرتے مرتے اپنے وطن کی عزیز خاک سے وابستہ رہے اور وہیں پیوند زمین ہوئے کٹرا کی سرزمین۔ جہاں اور بہت سے نوا سنجانِ گلشن خوش گویان وطن اور عزیزان فن کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے اس لعل بے بہا کو بھی بطور امانت محفوظ کئے ہوئے ہے۔

آپ کا خاندان اگرچہ متمول تھا یعنی خود کبیر الدین ظہیر زمیندار تھے اور عماد کے ماموں سید نبی اللہ مشہور و معروف بیرسٹر تھے مگر زمینداری کے خاتمے نے عماد کو مالی دشواریوں میں گرفتار کر دیا اور مفلوک الحال ہو گئے جس سے ان کی شاعری میں غم کے پہلو زیادہ اجاگر ہوئے ۱۹۶۱ء میں وہ اس دنیائے ہست و بود کی گردشوں سے نجات پا گئے

نمونہ کلام یہ ہے۔

بیان کرتا ہوں فضلِ شانِ محمد — سنیں غور سے عاشقانِ محمد
ہوسے دل بہلنے کی صورت یہی ہے — سنائے کوئی داستانِ محمد
چمک جائے قسمت کا اپنی ستارہ — میسر ہو گر آستانِ محمد
ہے قرآں کی نسبت یہ اپنا عقیدہ — کلامِ خدا ہے زبانِ محمد
بشر کیا فرشتے بھی سننے کو آئیں — اگر چھیڑ دو لحن داستانِ محمد
گئے پہنے نعلین عرش بریں پر — تھی یہ ایک ادنیٰ سی شانِ محمد
حبیب خدا اور ختم رسل ہیں — بتاؤ یہ کیا کم ہے شانِ محمد
مصیبت کو بھی جو سمجھتے ہیں راحت — حقیقت میں ہیں پیروانِ محمد

عماد حزیں اہل مکہ سے پوچھو
کدھر کو گیا کاروان محمد

آرام کچھ ملا نہ جہانِ خراب میں — منہ سے نکل گیا یہ مرے اضطراب میں
چہرے سے تم اٹھاؤ تو اپنے نقاب کو — ممکن نہیں کہ چاند نہ آئے سحاب میں
باقی ہے کوئی تار گریباں میں یا نہیں — اتنا بھی میں نہ دیکھ سکا اضطراب میں
دعویٰ عشق اور گلہ اضطراب کا — اس نے لکھا ہے میرے خط کے جواب میں
دنیا کا کچھ خیال نہ عقبیٰ کی فکر ہے — اے عشق تو نے ڈال دیا کس عذاب میں
تکلیف کونسی تجھے پہنچی ہے اے عماد — آنسو بھرے ہیں جو تری چشمِ پُر آب میں

کام آئے یہ ممکن نہیں تدبیر کسی کی — جب روٹھ گئی ہو کبھی تقدیر کسی کی
کیا ہوں کچھ الجھا کہ چھڑائے نہیں چھٹتا — دیکھی ہے کہیں زلفِ گرہ گیر کسی کی
میں گردشِ ایام سے آوارہ وطن ہوں — بگڑے نہ الٰہی کبھی تقدیر کسی کی
کیا دل پہ گزر جاتی ہے کچھ اس کو نہ پوچھو — جب بن کے بگڑ جاتی ہے تقدیر کسی کی
کیا دل پہ گزرتی ہے بتاؤ تو عماد اب
غائب تری بالیں سے ہے تصویر کسی کی

دمِ آخر جو آئے ہو تو سن لو داستاں میری
کہ تھوڑی دیر میں اب بند ہوتی ہے زباں میری

جو ہیں جانبازِ الفت وہ نہیں مرنے سے ڈرتے ہیں
دمِ آخر یہ مجھ سے کہہ رہی ہیں ہچکیاں میری
میری قسمت میں قسامِ ازل نے لکھ دیا رونا
یہی ہے سرگزشتِ زندگی عمرِ رواں میری
بڑھاتا ہوں قدم آگے تو پیچھے ہٹتے جاتے ہیں
ذرا مایوسیاں دیکھے غبارِ کارواں میری
پلٹ کر پھر نہ آئی دیکھنے کے واسطے مجھ کو
خفا ہو کر گئی کچھ اس طرح عمرِ رواں میری
عمادؔ اب وقت شاید آگیا ہے میرے مرنے کا
بہت رک رک کے چلتی ہے جو نبضِ ناتواں میری

راہ میں یہ گفتگو کرتے ہیں اپنے دل سے ہم
اب تو عاجز آگئے ہیں دوریٔ منزل سے ہم

خدایا مجھ سے حساب و کتاب رہنے دے — قصور وار ہوں بیشک عذاب رہنے دے
ہمارے نامۂ اعمال میں دھرا کیا ہے — کریم تو ہے حساب و کتاب رہنے دے
نہ ہوگا کچھ بھی اثر وعظ کا ترے واعظ — نہ چھیڑ مجھ کو عذاب و ثواب رہنے دے
عمادؔ ٹھوکریں کھاؤں گا تہِ زمانہ کی
جو چین سے دلِ خانہ خراب رہنے دے

غرِیق

فضل احمد نام۔ غرِیقؔ تخلص۔ مولوی سجاد حسن سجّادؔ کے فرزند اور مولوی رفیع الدین کے پوتے ہیں۔ مولوی رفیع الدین لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور وہاں کے نامور وکلا میں تھے۔ آپ کے جدّامجد حضرت شاہ محمد اسمٰعیل، فاروقی النسب تھے جو بزمانِ ہمایوں بادشاہ کڑا تشریف لے آئے تھے۔ شاہ اسمٰعیل فاروقی کے کچھ اخلاف علاؤ الدین پور شکرکی اور موضع رشید مئی مستقل ہوگئے تھے اور کچھ کڑا ہی میں مقیم رہے۔ غرِیقؔ اس کڑا کی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا تفصیلی شجرۂ نسب "تاریخ کڑا مانکپور" کے صفحہ ۱۲۸ اور شجرۂ عثمانی کے صفحہ ۵۱۳ پر درج ہے۔

مولوی رفیع الدین نے لکھنؤ میں کافی دولت کمائی جس سے انہوں نے اپنے وطن مالوف میں کافی جائداد خرید کی تھی۔ مولوی رفیع الدین کا تذکرہ صفحہ ۱۵۳ پر موجود ہے۔

مولوی فضل احمد غرِیقؔ کا تاریخی نام میر غنی ہے مگر آپ نے اپنا تاریخی نام غریق رکھا جس سے سال ولادت ۱۳۱۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ فضل احمد نے اپنے اس تاریخی نام کو ہی اپنا تخلص قرار دیا۔

فضل احمد غرِیقؔ کی شادی اولاد حسن عثمانی کی لڑکی اصغرالنسا سے ہوئی جو علامہ وحید الدین وحیدؔ کی نواسی تھیں۔ اصغرالنسا کے بطن سے ایک لڑکی خلیل فاطمہ اور ایک لڑکے فیض احمد فاروقی تولد ہوئے

فیض احمد فیضی کا تذکرہ صفحہ ۲۹۲ پر موجود ہے۔

غلق نے ابتدائی تعلیم ریاست رلیاں، فتحپور اور کانپور میں پائی۔ انگریزی تعلیم بھی آپ نے دسویں درجہ تک حاصل کی مگر امتحان کی بندشوں سے آزاد رہے۔ زمینداری کافی تھی اس وجہ سے کبھی ملازمت نہ کی۔

آپ نے محلہ مولویانہ کی اس ادبی اور شعری فضا میں آنکھیں کھولیں جہاں وحید کے نغمے گونج رہے تھے۔ وحید کی غزلیں لوگ پڑھتے یاد کرتے اور ان کی المناک موت پر آنسو بہاتے تھے۔ اس فضا میں پرورش پانے والا انسان شاعر نہ ہوگا تو کیا پھر کوئی فسقی یا لیڈر ہوگا۔ غلق نے اوائل عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا اور اپنی طبع رواں اور جودت فکر کو مشعل راہ تصور کیا اسی لئے سلسلۂ شاگردی اور استادی سے بے نیاز رہے۔ اگرچہ صنف غزل میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی مگر نازگوئی سے اتنی رغبت ہوئی کہ دوسری تمام اصناف سخن سے دلچسپی باقی نہ رہی۔ اور اسی میں مہارت حاصل کی۔ اردو فارسی ادب ہمیشہ مطالعہ میں رہے خاص طور سے وحید میاں کا کتب خانہ جو آپ کے قبضہ میں تھا اس سے کافی استفادہ کیا۔ آپ کی غزل کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

غیروں سے روز ملتے ہیں خلوت میں بزم میں
صرف ہم کو حکم ہے کہ تم آؤ پکار کے

دوزخ کی آگ میں تجھے جلتا ہوا غلق   دیکھا۔ جائے گا تیرے الکت سے لیکنا

نہیں کچھ واسطہ پھر بھی یہ پاس وضعداری ہے
جو مل جاتا ہے کوئی حال انکا پوچھ لیتے ہیں

چار دن بھی جو میں رہ جاؤں قفس میں ہمدم
ہوں وہ طائر کہ میں صیاد کو اپنا کرلوں

آپ بڑی سیمابی کیفیت کے حامل ہیں۔ مزاج میں مستقل مزاجی نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جیسے ہر شاعر میں حسن پرستی کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے اسی طرح غلق بھی حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ سراج الاسلام صوبہ بنگال کے ایک طالب علم مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں درس وحدیث و قرآن کے سلسلہ سے تشریف رکھتے تھے بیہر گلی الہ باد کی مسجد میں پیش امام کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ غلق اپنے بھانجے محمد باقر عثمانی کے یہاں محلہ بیہر گلی میں رہا کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کی درمیانی مدت میں اہلیہ اور فرزند سعید احمد سیفی کراچی چلے آئے تھے ان دنوں میں سراج الاسلام کے ساتھ آپ کے بہت گہرے مراسم ہو گئے تھے غلق سراج الاسلام سے ملنے کے لئے اکثر اوقات مدرسہ سبحانیہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ وہاں کے طلباء ان کی سیمابی کیفیت سے واقف ہو گئے اور اسی

سبت سے انہیں غائبانہ طور پر بے قرار کے خطاب سے یاد کرتے
یق کو ایک دن اپنا خطاب مل گیا۔ برجستہ یہ قطعہ قلمبند کیا اور ان لوگوں
سنا دیا

میں گل کو جا کے پیار کروں کیا غرض مجھے
ہاتھوں کو نذر خار کروں کیا غرض مجھے
دامن کو تار تار کروں کیا غرض مجھے
کیوں دل کو بے قرار کروں کیا غرض مجھے
پھولوں کی بو تو آئے گی خود ہی دماغ میں
ہر گل کو قدر داں کی تمنا ہے باغ میں

عزیز کی تاریخ گوئی کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

تاریخِ وفاتِ اہلیہ خود

بستہ تعلق من ہمراز من — بر منِ بے دل در حسرت کشود
ر جدائی داشت مارا مدتے — تفرقہ اندازیٔ چرخ کبود
ی ندامت ہست سوہاں رُوح را — رحم بر حالِ من اے رب ودود
سر بہ جیب فکر بُردم بہر سال — عقدۂ دشوار بد لیکن کشود
ہاتف از چرخِ چہارم اے عزیز
بس ہمیں گفتا فروغ خانہ بود
۱۹۵۴ء

قطعہ تاریخ وفات قائد اعظم محمد علی جناح ۔

قائد اعظم گئے سوئے جناں — داغ فرقت ہم کو ملنا تھا ملا
رنج و غم نے جب کیا دل میں ورود — صبر نے دستِ تسلی رکھ دیا
اور کہا مرضیٔ خالق تھی یہی، — بندگی ہے تو نہ کر چون وچرا
یاد آتے ہیں تیرے عزم صمیم — اس بڑھاپے میں جوانی کر گیا
جس کو کہتے تھے عدو امرِ محال — حال کر کے تو اسے دکھلا گیا
ایسی ہمت اور استقلال پر — آفریں صد آفریں صد مرحبا
آپ تھا اپنی مثال اس دور میں — اب کہاں ایسا سیاسی رہنما
مصرعہ تاریخ کی جب فکر کی — یوں ہوئی گویا مری طبع رسا
توڑ کر دشمن کا سر لکھدے علی — جلد دو پاکستان دونوں لے لیا

۱۳۷۱ – ۴ = ۱۳۶۷ھ

قطعہ تاریخ شہادت لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان ۔

چوں لیاقت رفتِ زیں دار فنا — مجلسِ عیش درہم شد بلا خراب
سال رحلت گفت ہاتف بر ملال — روح پاکش شد بہ جنت کامیاب

۱۳۷۰ھ

تاریخ وفات اظہر حسن عرف جی میاں رئیس کڑا، ہوم سیکریٹری حیدرآباد دکنؒ ۔

غم رحلتِ عم من جی میاں — دلم را بہ یک گونہ کردہ فگار
پئے سال ترحیل کردم چو فکر — زعیمم شدہ ایں چنیں آشکار

سر اٹھا بر کندہ گوائے غریق ۔۔۔ نذ الملحن شد بہ دار الفقرا ر

۳ ۔۔۔ ۱۳۸۴ھ

تاریخ وفات جمال احمد ولد کمال الدین رئیس کڑا ۔

آں جمال احمد ستودہ صفات ۔۔۔ داشت در دسے بحول بلائے وطن

ریختم آب دیدہ و گفتم ۔۔۔ شد ۔ خلد برین فلاسے وطن

۳ ۔۔۔ ۱۳۵۹ھ

تاریخ وفات سلیقہ بانو، والدہ محمد سبحان بازار حویلی کڑا ۔

یہ خبر سن کے بہت رنج ہوا کو مرے ۔۔۔ دار فانی سے گئیں آہ سلیقہ بی بی

میں نے پوچھا سن رحلت تو کہا ہاتف نے ۔۔۔ حیف دنیا سے سدھاری وہ بھلی

۱۳۸۲ھ

وفات ابوالکلام کی تاریخ مومن کے مصرعہ ذیل سے تھوڑی سی ترمیم سے نکالی ۔

"مومن خدا کو بھول گیا اضطراب میں"

قطعہ تاریخ انتقال گاندھی ۔

اٹھ گئے ہم میں سے گاندھی ہائے ایسے وقت میں

زندگی کی ان کے جب ہم کو ضرورت سخت تھی

ریڈیو نے جب سنائی موت کی ان کے خبر

کیا کہیں کتنی ہوئی دل کو ہمارے بے کلی

باعث صد فخر تھی ہندوستاں میں جس کی ذات

جان سے لی اک غلط فہمی میں ایسے شخص کی
اس میں بھی مضمر بقائے سلطنت کا راز تھا
جس کو انھوں نے ٹھہرایا تھا مسلم دوستی
کچھ نہ سوجھے آنکھ سے لوگوں کے وہ کارِ عظیم
کر گئے جس کو کہ گاندھی جی بعالی ہمتی
ایک نا تھو ہی نہیں کتنے تھے سازش میں شریک
ایسے محسن کش پہ لعنت ہو تمام آفاق کی
جسم خاکی ان کا جس دم نذرِ آتش کر دیا
ہر زبانِ شعلہ سے نکلی صدائے شانتی
دل میں جب آیا کہ لکھدوں میں بھی تاریخ وفات
بہ سرِ دشش غیب کی آواز کانوں سے سنی
پھوڑ کر نا تھو کی آنکھیں لکھدے فصلی سال فوت
چل بسا صد حیف گاندھی زندہ دار آشتی

۱۳۶۰ — ۵ = ۱۳۵۵ فصلی

جب گاندھی کی تاریخ وفات پر نظر جاتی ہے تو عزلتؔ کی قادر الکلامی کا سکہ ماننا پڑتا ہے۔ عزلتؔ ہندوستان میں رہ کر بھی ایسی نکتہ بازی کر جاتے ہیں کہ اہل نظر اور اہل علم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ "اس میں بھی مضمر بقائے سلطنت" کا جملہ گاندھی کی مسلم دوستی پر ایک زبردست ضرب ہے جسے اہل دانش بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اور گاندھی کو کہا بھی تو "باعث صد فخر" ہندوستان کے لئے کہا ہے تمام دنیا کے لئے نہیں جیسا کہ اہل ہند کا خیال ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزنوی اپنے خیالات کا آزادی سے اظہار ضروری خیال کرتے ہیں "ناتھو کی آنکھ" پھوڑنے کا ارادہ اور پھر اس سے فائدہ اٹھا کر تاریخ نکالنی ان کی مشاقی اور استادی کو ثابت کرنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم دوستی کا جذبہ شدت پکڑتا ہے اور وہ اس پر تل جاتے ہیں کہ گاندھی کی مسلم دوستی کے پرخچے اڑائے جائیں تو یہ قطعہ لکھ کر دم لیتے ہیں۔

فلک گفت احسن "ملک گفت زہ"　　گرا کھا کے گولی جو بڈھا گریز
ندا دی وہیں ہاتف غیب نے　　کہ دہشت کا سر توڑ کر اے عزیز
اگر سال فضلی کی ہے جستجو　　لکھو "مر گیا آج کم بخت ہیز"

۱۳۵۹ - ۴ = ۱۳۵۵ فضل

دہشت کا سر توڑ کر ایک ایسا ذومعنی جملہ ہے جس سے ان کی بے باکی اور بے دریغ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل جو اپنی مسلم کشی اور ایذا دہی کی وجہ سے ہندوستان میں مشہور تھے، ان کے انتقال پر کیسی بے ساختہ اور دل جلی بات کہدی ہے جو صرف غزنوی کا حق ہے۔

شدہ فی النار چو خبیث کہن　　آلہ الشر مژدہ ہر سو برد
سال فضلی چو جستجو کردم　　گفت ہاتف بگو خبیث بمرد

۱۳۵۸ فضلی

دوست احباب اور اعزا تک کو غزلوں نے اپنے قلم کی بے باکی سے بچنے نہیں دیا۔ حمید احمد قیس جن کا ذکر صفحہ ۳۰۰ پر ہے ان کے عزیز اور اچھے دوستوں میں تھے مرحوم ان کے قطعہ تاریخ وفات میں بھی دبے دبے الفاظ میں وہ بات کہہ گئے ہیں جو ان کے دل کی آواز تھی۔ اس قطعہ تاریخ میں اس کا اشارہ بڑا بلیغ ہے کہ "گو لغزشیں ہزار دل ہوں"۔ لیکن غفار پھر بھی بخش دیتا ہے۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔

دنیا سے کوچ کر گئے بھائی مجیب حیف — دل میں (?) کر گئے ہیں باقی تھی کچھ انکی ذات سے
گو لغزشیں ہزار ہوں اپنا ہے اعتقاد — غفار اس کی شان ہے چاہے تو بخش دے
مجروح دل کو فکر پڑی سال فوت تھی — ناگاہ آئی کان میں آواز غیب سے

ہے بیگماں یہ مصرع تاریخ حسب حال
اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

۱۴۸۲ – ۱۱۱ = ۱۳۷۱ھ (?)

اسی طرح فیاض الحسن کی تاریخ میں بھی انہوں نے ان کی لغزشوں کی طرف اشارے کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ انہیں درگزر کرے۔

تاریخ وفات مولوی فیاض الحسن ولد شیخ ریاض الحسن عثمانی۔

رست از دار فنا سوئے عدم — شیخ فیاض الحسن مرد حلیم
خوش مزاج و پاک طینت با صفا — رحلت او کرد دلہا را الیم
جملہ لغزشہائے او را عفو کن — بس ہمیں خواہم ز لطف رب رحیم
سال ترحیلش چو کردم جستجو — رہنمو شد مرمرا طبع سلیم

ازسرِ افسوس گفتم سالِ فوت   شد ز دنیا صاحبِ خلقِ قدیم

۱۳۶۱ - ۱۱ = ۱۳۷۲ھ

راقم الحروف کے حقیقی بھائی شیخ محمد عاقل عثمانی نے اپنے دروازے کے قریب رشید منزل ایک پختہ کنواں تیار کرایا اور پوچھا محترم سے اس کی تاریخ کہنے کے لئے عرض کیا خلیق نے برجستہ ایک قطعہ لکھ کر اسی وقت دیدیا۔ جو رشید منزل کے کنواں پر اس وقت کندہ کیا ہوا لگا ہوا ہے۔ مگر یہاں بھی خلیق کا بے دریغ قلم نکتہ پیدا کرنے سے باز نہیں رہا اور محمد عاقل عثمانی تو خوش وقت کہہ کر ان کے ذوق اور شوق کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے۔

شدہ تعمیر چاہ بہر عوام   از مساعی عاقل خوش وقت

از سرِ سحر سالِ تعمیرش   ہاتفم گفت - کوثرِ رحمت

۲   ۱۳۷۴ - ۲ = ۱۳۷۲ھ

راقم الحروف سے صاحبِ موصوف نے "تاکیداً" فرمایا ہے کہ ان کا تذکرہ "سخنورانِ قصبہ کرانہ" میں نہ لایا جائے مگر "سخنورانِ قصبہ کرانہ" کی تصنیف اس وقت تک نامکمل تشنہ اور سعیٔ لاحاصل سمجھی جائے گی جب تک عہدِ حاضر کے ایسے قادر الکلام شاعر کا تذکرہ اس میں شامل ہو

اشعار پڑھنے کا انداز آپ کا قدیم طرز کا ہے یعنی تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ حالانکہ زبان میں لکنت پائی جاتی ہے مگر شعر پڑھتے وقت یہ لکنت مانع نہیں ہوتی۔

مسودہ کتابت کے لئے دیا جا چکا تھا اور توقع تھی کہ اس کتاب

کے چھپنے کے بعد صاحب موصوف بہت خوش بھی ہونگے اور خفا بھی، خوش اس لیے کہ کراچی کے شعراء کا یہ پہلا تذکرہ تو کسی نہ کسی صورت سے مکمل ہوگیا اور ناراض اس لیے کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کا نام بھی فہرست شعراء میں شامل کرلیا گیا ہے مگر کسے معلوم کہ قدرت خداوندی کچھ اور سوچ چکی ہے صاحب موصوف کافی ضعیف و کمزور ہوگئے تھے۔ ایک دن مسجد جاتے وقت راستے میں پاؤں پھسلا اور گر پڑے جس سے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور تقریباً ڈیڑھ ماہ علیل رہے ان کے اکلوتے صاحبزادے فیض احمد فیضی نے کافی علاج کیا اور ان کی بیٹی خلیل فاطمہ اور ان کے بچوں نے تیمارداری کی مگر فرشتۂ اجل نے ان کی موت کا پروانہ اجرا کردیا تھا آخر کار ۲۴ جنوری ۱۹۶۸ء بروز چہارشنبہ مطابق ۲۳ شوال ۱۳۸۷ھ اس جہانِ فانی سے ۸ بجے شب میں کوچ کیا۔ دوسرے روز مسعود آباد کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

صاحب موصوف کی زندگی میں یہ تذکرہ نہ چھپ سکا جس کا راقم الحروف کو بہت ملال ہے۔ اکثر اس تذکرے کے متعلق مرحوم دریافت کرتے تھے اور اس کی طباعت و اشاعت سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

فخر

شیخ ضیاء الدین نام فخرؔ تخلص کرتے تھے۔ مولوی صبیح الدین کے فرزند ارجمند تھے جو مولوی فصیح اللہ فاروقی قائل برادر امر اللہ شاغل کے

لرزتے تھے۔ ابھی تذکرہ زیر ترتیب ہی تھا اور اس چراغ سحری سے اکتساب
فیض کے فارغ اختیار کئے جارہے تھے کہ آسمان ادب کا یہ درخشندہ ستارہ
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ راقم الحروف کو موصوف کی موت سے
جو صدمہ پہنچا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کبھی قلم رکھتا تھا اور
کبھی پھر اٹھالیتا تھا۔ اردو کی بدبختی اور بدنصیبی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے
کہ قدیم روایات اعلیٰ اقدار شرافت و نجابت کا یہ مرقعہ روپوش ہوگیا۔ اردو یتیم
ہوگیا، اردو بےسہارا ہوگیا۔ اردو بے زبان ہوگیا، اردو اکیلا رہ گیا جس میں لکھاوٹ کی
امیتوں سے نغمے ابلنے کے بدلے مرثیہ اور نوحے سنائی دینے لگے۔ اردو
کی آنکھوں کا نور دل کا سرور چھن گیا اس کا سہاگ اجڑ گیا اس کے نکھار پر
پژمردگی چھاگئی اور اس کا ابھرا ہوا سینہ دب کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں
میں حلقے پڑ گئے، اس کے بوڑھے چہرے پر لٹکی ہوئی جھریوں میں سیاہی
کے بدنما داغ لگ گئے۔ دمکتی ہوئی پیشانی پر جہالت کی مہر لگادی گئی۔
علم و فضل کا پسینہ جو اس کے ماتھے سے کھسوٹ لیا گیا۔ شبلی کے چمن
ضیائے وطن اور صلائے کہن ہم سے تا ابد منہ موڑ گئی ہماری ناقدریوں سے
شاکی ہوکر فضل و کمال کا ستارہ اپنی آخری روشنی بکھیر کر عالم نور میں گم ہوگیا۔

فوز کی موت ایک شاعر ہی کی موت نہ تھی بلکہ ایک اچھے انسان
کی موت تھی ایک مجسمہ خلوص و محبت کی موت تھی ایک روح انجمن
کی موت تھی، ایک عالم کی موت تھی۔ ضیاء الدین فوز مر گئے مگر ضیاء الدین
فوز زندہ ہیں جب تک اس دنیا میں اعلیٰ اقدار خلوص و محبت قائم رہیگی

فن کا نام زندہ رہے گا۔ مضطر کا جسم مردہ ہو گیا مگر ان کی روح زندہ ہے ان کے شعر زندہ ہیں ان کی لے زندہ ہے ان کی آواز زندہ ہے۔ کیا ایسے عظیم شعر کہنے والا مر سکتا ہے۔

رہی رشتۂ حیات آخر یار کے خنجر دو دم سے بھی
گئے نقش قدم بر یار کے ہم کوئے دشمن تک
رہ ظلمات ہم نے خضر کی سہے جیسے انماں ہیں

ہے جبیں پر بھی شکن ابروئے خمدار کے پاس
ایک تلوار کھنچی اور ہے تلوار کے پاس

کبھی چار آنسو بہا گئے کبھی چار پھول چڑھا گئے
مرے دل کی آگ بڑھا گئے کبھی آ گئے جو مزار پر

وہ کبھی نہیں مر سکتے اگر وہ مرنے بھی لگے تو ایسے پچیسوں شعر انہیں زندہ رکھنے پر مجبور کریں گے اور وہ زندہ رہیں گے۔

موصوف کے نمونۂ کلام اور حالات زندگی کے لئے میں نے آپ کے صاحبزادے غیاث الدین کی خدمت میں عریضہ تحریر کیا تھا اس کے جواب میں ان کے دوسرے فرزند ناصر الدین نے ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء کو جواب تحریر فرمایا اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"والد صاحب قبلہ شیخ محمد ضیاء الدین احمد صاحب فخرؔ
کی ایک بیاض ان کے کسی دوست کے پاس ہے قبلہ کو ان کا پتہ یاد
نہیں ہے اس لئے ان سے مراسلت نہیں کرسکتا۔ ایک بیاض کا کافی کلام
کرم خوردگی سے تلف ہوچکا ہے۔ تیسری بیاض سے غزلیات نقل کر کے
روانہ کرتا ہوں۔ قبلہ تقریب قریب سات آٹھ برس سے بالکل بے دست
پا ہیں صحت برابر گرتی جارہی ہے اب تو ان کی بات بھی سمجھ میں نہیں
آتی۔ اللہ ہم لوگوں کے حال پر رحم کرے۔ صحت کی خرابی اور ہاتھ پیر بیکار
ہونے سے شعر و شاعری وغیرہ تقریباً دس برس سے بند ہے۔"

دوسرا خط مرقومہ ۱۳ر جون حسب ذیل ہے۔

کرم فرمائے من السلام علیکم۔ ۱۶ مارچ کے خط کا جواب
دے رہا ہوں۔ حالات سے مجبور تھا اس وجہ سے آنی تاخیر ہوئی میں یوں
بھی کوتاہ قلم ہوں۔"

۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء کی صبح والد صاحب قبلہ کا انتقال ہوا والد صاحب
نے شروع میں ضیاء تخلص رکھا اور آگے چل کر فخرؔ رکھ لیا۔ تاریخ پیدائش
کسی بیاض یا تحریر سے نہیں مل سکی۔ اندازے کے مطابق ۸۵ کے اوپر
انتقال کے وقت عمر تھی۔ والد صاحب نے ساری عمر نہایت سادگی سے
بسر کی۔ نمود و نمائش قطعاً مزاج میں نہ تھی۔ خود تکلیف اٹھاتے مگر ہم لوگوں کو
کوئی تکلیف پہنچے یہ ان کو گوارہ نہ تھا عالم بے دست و پائی میں بھی وہ یہ
نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کا کام کرے حتیٰ کہ ملازمین بھی اور اکثر ایسا

کرنے میں بھی وہ کرے اور کافی چوٹیں آئیں۔ بہر حال میں صابر و شاکر رہتے شعر و شاعری اور کرکٹ سے ہمیشہ لگاؤ رہا۔ جب تک ہاتھ پیر چلتے رہے مشاعرے میں شرکت کی اور ہم لوگوں کے ساتھ کرکٹ کھیلے۔ شطرنج سے بھی شوق تھا اور برج بھی کھیلتے تھے۔ ہاتھوں میں رعشہ آجانے کی وجہ سے لکھنا بند ہوگیا تھا۔ کچھ دنوں شعر بھابی سے یا ہم لوگوں سے لکھاتے رہے بعد میں بات چیت ہونے میں بھی تکلف ہونے لگا اور یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا۔

اسحق بھائی (اسد لق) نے کچھ دنوں ضرور والد صاحب سے اپنی غزلوں پہ اصلاح لی ہے۔ والد صاحب سے انتصار احمد صاحب جو فرحی تخلص کرتے تھے، فیض آباد میں اپنی غزلوں پہ اصلاح لیتے تھے۔ آجکل شاید وہ سپلائی آفیسر یوپی کے کسی ضلع میں ہیں اس کے علاوہ اور مجھے نہیں معلوم ہے۔

ضیاءالدین فخر نے علیگڑھ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا تھا۔ بعد میں وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور بارہ بنکی میں وکالت کرنے لگے۔ یہاں ان کے والد پیشکار عدالت تھے۔ وکالت میں انہوں نے کافی ترقی کی حتی کہ سشن جج ہوگئے اور اسی عہدہ سے پنشن پائی گورنمنٹ نے خان بہادر کا خطاب بھی مرحمت فرمایا تھا۔ صورت شکل سے یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کبھی جج رہ چکے ہیں۔ چھوٹا قد، سانولا رنگ، شیو چٹری، مونچھیں نیم ترشی ہوئی آنکھوں پہ چشمہ اور سفید بال یہ حلیہ تھا جو

۱۹۵۲ء میں راقم الحروف نے آپ کو الہ آباد میں دیکھا تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے۔

طلب دل میں جو ہوگی تو دیدار ہوگا — سر طور ہوگا سر دار ہوگا

ابھی آغاز ہمت ہے ابھی کچھ حوصلے کم ہیں
بروں کو توڑ کر دیوار زنداں دیکھ لیتے ہیں

کبھی تم نے میرا کہنا نہ مانا — کہا جب کچھ نکالا اک بہانہ
ہمارا حال قاصد کچھ سنانا — پھر ان کے ہاتھ ہے آنا نہ آنا
ستا لو جتنا جی چاہے ہمیں کیا — تمہیں کو نام رکھے گا زمانہ
عدو کی خوب سن لیتے ہو اچھا — ہماری بات کانوں میں اڑانا
حسیں سب حضرت دل مطلبی ہیں — کبھی تم ان کی باتوں میں نہ آنا
فلک تم سے کرے گا چال توبہ — ابھی ہم دیکھے بیٹھے ہیں زمانہ
شہید ناز ہیں نازوں کے خوگر — ادب سے شور محشر ان کو جگانا
گلہ صیاد کا بے جا ہے بلبل — مجھے لایا قفس میں آب و دانہ
۱ لحاظ حق خدمت کیجیئے گا — ضیا ہے آپ کا خادم پرانا

کیا کہوں کس قدر سیاہ ہے وہ زلف — بڑھ گئی میری شام غم سے بھی
آب خنجر کے تیرے پیاسے ہیں — سینکڑوں آ چکے حرم سے بھی

اقربا فخرؔ کو دفنانے لئے جاتے ہیں　　وہ بھی چلمن سے ذرا آکے تماشہ دیکھیں

کیا مریضِ دردِ فرقت کا مداوا آ گیا　　سچ تو یہ ہے مر گیا بیمار اچھا ہو گیا

ان سے اب تک ہے کہیں ایفائے وعدہ کا خیال
واقعہ یہ ہے کہ تم کو فخرؔ سودا ہو گیا

کرے گی تیغِ قاتل مشکلیں آساں مقتل میں
اجل سایہ کرے گی کشتۂ بیداد کے سر پر

بہار آنے تو دو اور فخرؔ کو ہونے تو دو سودا
رہے گا نام کو تنکا نہ اک فخرؔ تے بستر پر

تیر سینے کے پار ہے کس کا　　طائرِ دل شکار ہے کس کا
اے صبا کس کی خاک ہے برباد　　یہ ہوا پر مزار ہے کس کا
ضبطِ اظہارِ حال کرتا ہوں　　دل پہ اب اختیار ہے کس کا
یار پہلو میں سر پہ ابرِ بہار　　ساقیا انتظار ہے کس کا
واں وہ آتے ہیں اپنے وعدہ پر　　فخرؔ امیدوار ہے کس کا

وصل میں پورے سب اپنے دل کے ارماں ہو گئے
رخ پہ صدقے ہو گئے گیسو پہ قرباں ہو گئے

تھے میرے نورِ نظر جب تک رہے آنکھوں میں تم
آنکھ سے دل میں گئے تو نورِ ایماں ہو گئے

کس توقع پر میں کرتا التجائے لطف و جود

دیکھ کر صورت ہی میری وہ پشیماں ہو گئے

دے دیا مجھے سمجھا کے اس بت کافر کو دل۔

فخر یہ کیا تم کو سوجھی کیسے ناداں ہو گئے

بیمار محبت کا مداوا نہیں کرتے — تم ایسے مسیحا ہو کہ اچھا نہیں کرتے

میں نے جو کہا خوف خدا کا نہیں کرتے — جھلا کے لگے کہنے کہ اچھا نہیں کرتے

اظہار تمنا پہ تو شرماتے ہو لاکھ — میری لطافت سے ورق سے پروا نہیں کرتے

کہتا ہے کوئی بت کوئی کہتا ہے خدا ہو

تحقیق نہیں یار کہ تم کون ہو کیا ہو

اس حق کا یہ غصہ ہے بلا بچہ خفا ہو — اب میں جو کہوں کچھ تو شکایت ہو گلا ہو

یہ کیا کہ کبھی خوش ہو کبھی چیں بہ جبیں ہو

راضی ہو تو راضی ہو خفا ہو تو خفا ہو

ہم رند جھکے لگے کیوں دیر و حرم میں — میخانہ سلامت ہے ساقی کا بھلا ہو

سمجھیں میں ایسے کا نہیں کوئی ٹھکانہ — جیسے کہ طرفدار نہ تم ہو نہ خدا ہو

چھپتی ہیں کہیں فخر محبت کی نگاہیں

انداز تو کہتے ہیں کسی بت پہ فدا ہو

وصل میں منہ پھیر کر نہ بیٹھو — یاد بھی ہے قرار کیا کیا تھا

کبھی مر کے زندہ ہوتے کبھی زندہ ہو کے مرتے

وہ جو وقت نزع ہوتے یہی بار بار ہوتا

وہ نہ آئے وقتِ رحلت ہوئی مجھ پر آساں
کہ وہ بے قرار ہونے موت مجھے کیا قرار ہوتا

رخ روشن پہ جو وہ زلف پریشاں ہو جائے
صبح امید میری شام غریباں ہو جائے

ناطقہ بند ہو بلبل کا جو ہم نالہ کریں
یار کو دیکھ کے گل چاک گریباں ہو جائے

جاں بلب ہیں ترے انداز تغافل سے قتل
کچھ علاج انکا بھی اے عیسیٰ دوراں ہو جائے

مجھے تو بندۂ احساں حضور کر جانے
غریب خانہ پہ آتے عدو کے گھر جانے

قیامت آئی اجل آتی یار آجاتا
کسی طرح یہ مصیبت کے دن گزر جاتے

زلیخا یہ عبث الزام ہے دامانِ یوسف کا
ذرا اس کا بھی تو چاک گریباں دیکھتے جاؤ

کرم کرتے ہیں اس میں بھی ستم ایجاد کرتے ہیں
لکھا کر غیر سے خط بر سرِ بیداد کرتے ہیں

میں عاجز آگیا اے فخر ان کی بے نیازی سے
یہ بت کب بندگی سے دیکھئے آزاد کرتے ہیں

بزم میں کیوں کیجئے مخصوص مجھ سے اجتناب
پھر تو کہئے گا کہ تو نے کر دیا رسوا مجھے۔

عشق میں میرا ہی دل میرا کہا سنتا نہیں
غیر تو پھر غیر ہے جب آشنا سنتا نہیں

منہ لگے ناصح کے اتنا ہے بھلا کس کو دماغ
اپنے آگے اور کی مرد خدا سنتا نہیں

قبر پہ ہر سال آکر جشن کرتے ہیں عزیز — میرے مرنے کی ابھی تک ان کو خوشی جاتی نہیں
قبر پہ آتے ہیں اکثر فرزند عزیزوں کے ساتھ — دوستی کرتے ہیں دل سے دشمنی جاتی نہیں

نقد دل حاضر ہے پہلے شکل تو دکھلائیے
۸ قاعدہ ہے آدمی کرتا ہے سودا دیکھ کر

ایک عالم میں وہ کافر بیوفا مشہور تھا — فخر تو نے دل دیا کیا سوچ کر کیا دیکھ کر
نرگسی چشم کو کیوں دل میں جگہ دیتے ہو — فخر بیمار کو رکھتے نہیں بیمار کے پاس
ہمارے دل کو تڑپاتی رہے گی — کہاں تک اے نگاہ یار کب تک
عہد ماضی کا کوئی واقعہ یاد نہیں — منزلوں سے دور گئی گزر منزل ہم سے

جنوں ایسا تو ہو آشفتگی اتنی تو بڑھ جائے
۲ رگ سودا ابھر کر اٹھے خیال آئے جو وحشت کا

کبھی کمر کا کبھی درد ان کو شانے کا — یہ سب نتیجہ ہے زلفوں کے سر چڑھانے کا
مجھی نے کس لئے صیاد پر کترنا ہے — مجھے پتہ بھی نہیں یاد آشیانے کا
ساقیا پھر دور ساغر کا چلے — آگئی پھر آج کل والی گھٹا
کھل گیا جوڑا کسی کا بام پر — آسماں پر چھا گئی کالی گھٹا
آج میخانہ میں برسے گی شراب — جھومتی آتی ہے متوالی گھٹا
سنتے ہیں کہیں نشہ میں میخوار کسی کی — آئے تو اچھل جائے گی دستار کسی کی
اتنا تو اثر ہے نگہ باز پسیں میں — رک جاتی ہے چلتی ہوئی تلوار کسی کی

بزم جاناں تک رسائی میں نے مانا ہے محال
شوق ہمت تو کرے آگے میری تقدیر ہے

فخرؔ تم کس فکر میں رہتے ہو آخر رات دن
کیا تردد ہے تمہیں کیا فکر دامنگیر ہے

دل منور ہو گیا آنکھیں بھی روشن ہو گئیں — جب تصور آ گیا اس چاند سی تصویر کا
تم سے کیا مطلب تھا ناحق تم خفا ہونے لگے — ذکر میں کرتا تھا اپنی خوبیٔ تقدیر کا

مجھے معلوم ہے سب حال ایسے زہد و تقوی کا — سب کہنے کیلئے جتنے بزرگ اللہ والے ہیں
خدا جانے وہ آنکھیں فخرؔ کیوں کر قتل کرتی ہیں
نہ ان کے پاس خنجر ہیں نہ انکے پاس بھالے ہیں

نہ ہو ہنگامہ آرائے جہاں کیوں داستاں میری
قلم جادو رقم میرا زباں رنگیں بیاں میری
میں پابند قفس صیاد کی خاطر سے ہوں ورنہ
جلا کر خاک کردے اس کو جب چاہے فغاں میری
نہ گھبرائیں وہ الزام ان کے سر آنے نہ پائیگا
بہانہ ڈھونڈ لے گی کوئی مرگِ ناگہاں میری
کہوں گا میں بھی جو کچھ دل جلے کے منہ میں آئیگا
کوئی کیوں چھیڑ کر اے فخرؔ کھلوائے زباں میری

ہے تماشہ آج ساقی بے طرح مخمور ہے — مئکدے میں رنگ ہی محفل کا کچھ کا کچھ ہے
وادیٔ ایمن ابھی تک نور سے معمور ہے — دیکھنے والا کہاں ہے طور اب بھی طور ہے
فخرؔ چپ رہتا ہوں سن کر حضرت واعظ کی بات
جانتا ہوں عقل سے بیچارہ کوسوں دور ہے

…اکوں یہ درد جگر سے وہ گھبرا کے نکل آئے ہیں گھر سے

ابھی سے غیر حالت ہو چلی محفل کے محفل کی

ابھی بیٹھے ذرا چھیڑی تھی یونہی داستاں دل کی

عدم کے جانے والے راستہ کس نے ترا دیکھا ہو

مسافت کس قدر ہے کچھ خبر رکھتا ہے منزل کی

کہاں تک درد دل کی داستاں بس مختصر سنئے درد

سحر ہونے کو آئی جھلملائی شمع محفل کی

سمجھ یہ آزادی اسے ہمت مردانہ — زنداں کی سلاخوں سے صحرا نظر آتا ہے

پیدا تمنا یانِ شوق میں کچھ اضطراب ہیں — وہ بھی حبیب دل تھے جو گزرے سے آتے ہیں

حسن انگور ہے شیشہ رنگا حباب میں — اک برق ہے کہ کوند رہی ہے نقاب میں

بے تحراب وہ دل ہو نہ وہ آپ کا مزاج — کیا ہو گیا تھا آپ کو عہد شباب میں

کیا پوچھتے ہو دلکو اس دل میں کیا ہے — خوں کردہ حسرت ہوں مایوس تمنا ہے

اصل فنا ہی بیچ ارتقا مضمر — دریا میں اگر قطرہ مل جائے تو دریا ہو

انداز تجاہل میں شوخی تو ذرا دیکھو — کہتے ہیں تمہیں ہم سے جینے کہیں کھا ہو

ہم راز محبت کو اس سے بھی نہیں کہتے — اس دل کا بھروسہ کا کیا یہ بھی تو ہی کا ہو

ہم جبکے سب کچھ اے محرم تیرا کھو بیٹھے

لو وہ بھی یہ کہتے ہیں اس شخص کو سودا ہے

جب دلاتا ہوں انہیں ایفائے وعدہ کا خیال

مسکرا کر کہہ دیا کرتے ہیں ہاں ہو جائے گا

ان کی غفلت شعاریاں نہ گئیں — میری اختر شماریاں نہ گئیں

مجھے دسترس نہ ہوا یہ کیا مرا زور کیا تھا غبار پر
تھی جو احتیاط مزاج میں وہ نہ آئے ہوتے مزار پر

میں بلا سے عشق میں مٹ گیا کہ مرا ضبط جیت اُٹھا
یہ عروج ہے مری خاک کا پڑی اڑ کے دامن یار پہ

تر و تازہ ہیں ابھی آبلے ابھی زخم سینہ ہے خونچکاں
ابھی داغ دل میں ہرے بھرے ابھی یہ چمن ہے بہار پر

میری آنکھوں میں ہیں شرربہار سراپا کر گئی یہ بجلیاں
مرا کیا بگاڑ لیگا باغباں ذرا بڑھ تو لیں یہ دو چار پر

میں تخیلات میں پھنس گیا کہ نگاہ رکھتا ہوں دور بیں
کوئی فخر دے گا فریب کیا انہیں چند نقش و نگار پر

وفا کے صلہ میں وفا چاہتا ہوں — محبت کو رسوا کیا چاہتا ہوں
بس اک نقش برآب ہے میری ہستی — کوئی دم میں خود ہی مٹا چاہتا ہوں

حشر میں کشتۂ بیداد سے فرماتے ہیں — تم کو دیکھا ہے کہیں اور مگر یاد نہیں

سر ہے وقت ذبح زیر پا سے قاتل دیکھنا
زندگی بے کار تھی لیکن یہ حاصل دیکھنا

دل سے قریں رہے کہ جگر کے قریں رہے — مطلب خلش سے ہے تو پیکاں کہیں رہے
یاروں کا قافلہ سر منزل پہنچ گیا — ہم پاشکستہ فخر جہاں تھے وہیں رہے

ڈھونڈتا پھرتا ہے کس کو آفتاب — رات گذری جستجو ہونے لگی
پہلے سرگرداں تھے فخرؔ اں کے لئے — اب خود اپنی جستجو ہونے لگی
وہ کہتے ہیں تمہیں سودا ہوا کیا — کریں اس سے عرض مدعا کیا

رات ساقی کیف میں تھا دور میں پیمانہ تھا
ذرہ ذرہ وجد میں تھا رقص میں میخانہ تھا

جس چمن سے عطر میں ڈوبی ہوئی آتی ہے تو
اے صبا پہلے ہمارا بھی وہیں کاشانہ تھا

رات ان کی راہ چار پہر دیکھتے رہے — آنکھیں لگا کے جانب در دیکھتے رہے

تم تھے پہلو میں تو میرے دل کو تھی تسکین کیوں
شمع تھی محفل میں روشن مضطرب پروانہ تھا

ذکر میرا آ گیا تو ہنس کے فرمانے لگے
فخرؔ اچھا آدمی تھا ہم سے بھی یارانہ تھا

خود بھی تلاش یار میں گم ہو گیا ہوں میں — اب کس کی جستجو ہے کسے ڈھونڈتا ہوں میں
ارمان بھرے دل کو برباد نہ کرنا تھا — ویران جو کرنا تھا آباد نہ کرنا تھا
غایت پردہ بھی ہے کچھ کس لئے یہ حجاب ہے — جلوہ تو ہے نظارہ سوز آپ ہی اک نقاب ہے

ناز میں شوخیاں بھی ہیں شوخیوں میں حیا بھی ہے
حسن ہے اب شباب پر حسن پہ اب شباب ہے

دیکھئے فخرؔ کو کیجئے نہ زیادہ گستاخ
پھر نہ کہئے گا اگر کوئی خطا ہو جائے

دم بھر سکوں نہیں ہر دل بے قرار کو　　　کیا ہو گیا ہے گردش لیل و نہار کو

اللہ اللہ چشم ساقی کی کرشمہ سازیاں

ہے جو صہبا میں وہی ہے رنگ پیمانہ میں بھی

پاس خودداری وہی ہے شان استغنا وہی

آ گئے انداز تیرے تیرے دیوانے میں بھی

ایک کافر سے محبت ہو گئی　　　دین و دنیا سے فراغت ہو گئی

ما ع کب چھوٹا نفس میں کب سے ہوں

کیا بتائیں ایک مدت ہو گئی

ان بتوں کی سرد مہری دیکھ کر　　　فخرؔ افسردہ طبیعت ہو گئی

سوز جگر کچھ اور بڑھا لے بڑھا سکے　　　اے چارہ ساز اور مداوا نہ چاہیئے

دل خود ہی پھر فریب تمنا میں آ گیا　　　فخرؔ اس پر اعتماد ذرا سا نہ چاہیئے

آزمائش ہے آزمائش پر　　　بدگمانی سی بدگمانی ہے

دور تک طلب میں بڑھتا چلا جا　　　راہ طلب میں منزل نہیں ہے

مسلم دل پر دلوں کی حکومت یہ تو بتلا دیں

جنوں کی حد کہاں تک ہے خرد کی حد کہاں تک ہے

وہاں اب تک تو لالے کی شہر بانی نہیں جاتی

یہاں بیمار غم کی شکل پہچانی نہیں جاتی

دل کا راز بھلا کیوں کسی سے کہوں　　　آپ کی بات آپ ہی سے کہوں

دل میں جو ہے وہ کیا کسی سے کہوں　　　تم سے تو تیری خوشی سے کہوں

رہینِ نظر ہے یہ دنیا سراسر　　مگر عارضی ہے غنیمت یہی ہے
بھی فخر سے آپ واقف نہیں میں　　مرنجان مرنج ایک ہی آدمی ہے

گلشن میں ہوا نے سرد چلی ہے خوشی کا ہنگام آیا
اُٹھ ساقی اُٹھ وہ ابر اٹھی وہ رحمت کا پیغام آیا
پھر آنکھ میں آنسو بھر آئے پھر رنگ اڑا ہے چہرے کا
پھر دل کی دھڑکن تیز ہوئی پھر لب پہ کسی کا نام آیا
تھا صبر و سکوں بس کہنے کا جب وقت پڑا کچھ بھی نہ رہا
دل دیکھو میرا تھا اپنا تھا دکھ درد میں آخر کام آیا
صرصر نے چمن برباد کیا بجلی نے نشیمن پھونک دیا
بلبل کو یہ صدمہ کیا کم تھا صیاد بھی لے کر دام آیا

مجھ کو تڑپتے دیکھ کر آپ نے مسکرا دیا
سوز میں لطف آگیا درد نے کیا مزا دیا
ایک ہی تو چراغ تھا وہ بھی صبا بجھا گئی
کس نے مرے مزار کا ان کو پتہ بتا دیا
شمع حیات گل ہوئی دل ہی رہا تھا کام کا
حسن نے چراغ جل سکا پھونک دیا بجھا دیا

فخر کیا حرج ہے کچھ پی کے چلے جائیے گا
میکدہ پاس ہے مسجد بھی بہت دور نہیں

سینے میں ایک درد بھرا دل بنا دیا — مجھ کو بھی التفات کے قابل بنا دیا
اس نے تیرے آستانے کا قائل بنا دیا — اک بے نوا کو رشک کے قابل بنا دیا
امید و بیم نے مری کشتی تباہ کی — ساحل کو موج موج کو ساحل بنا دیا
خود بیں کی نظر نے دیئے قیس کو فریب — ناقہ بنا دیا کبھی محمل بنا دیا
دل کو نہاں یار نے دی اس قدر جلا — اس آئینہ کو دید کے قابل بنا دیا

ساقی کی چشم مست کو کیا پوچھنا ہے فخر
جس پر نگاہ کی اسے کامل بنا دیا

میرے آگے جب کسی نے نام ان کا لے لیا
پھر گئی اک چاند سی صورت نظر کے سامنے

اڑاتا خاک ہر سو کارواں ہے — خدا جانے مہ کنعاں کہاں ہے

فخر

ایک روز میں انجمن ترقی اردو کراچی کے دفتر گیا تو مخدومی و استادی افسر

امروہوی صدیقی نے مجھے بتایا کہ ایک اور نئی دریافت ہے اور وہ ہے جناب فخر علوی ساکن کڑا کی۔ فخر علوی ساکن کڑا کا تذکرہ اورنٹیل کالج میگزین اگست ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۸ پر ملا ہے حقیقت میں فخر علوی کا اس حوالے سے صرف یہ پتہ چلا کہ وہ کڑا کے باشندے ہے جنہوں نے رسالہ حقیقت معراج تصنیف کیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۷۳ اوراق پر مشتمل ہے جو نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے اور ہر صفحہ پر ۹ سطور ہیں اس کی تقطیع ½۹ x ½۵ x ۶ x ½۳ ہے یہ رسالہ معراج کی حقیقت اور دوسرے اہم مسائل سے بحث کرتا ہے۔ فخر علوی شیخ حسن علی بن محمد موسیانی کے مریدوں میں تھے اور ایک شتیہ زررگ شخصیت کے علاوہ اچھے شاعر تھے۔ فخر کا کوئی نمونہ کلام اس مخطوطے سے دستیاب نہیں ہو سکا۔ رسالہ حقیقت معراج "پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اور اورنٹیل کالج میگزین انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے فخر علوی کے سلسلے میں میرے محترم دوست جناب معبر احمد فاروقی اسسٹنٹ لائبریرین پنجاب یونیورسٹی نے بھی کچھ معلومات فراہم کی ہیں جس سیاد پر فخر کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

فخر کئی کتابوں کے مصنف تھے مگر اس کی کوئی تصنیف نہیں پائی جاتی صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

متاع دیدۂ و دل لے چکے ہیں
مگر وہ ہیں کہ پھر بھی سرگرداں ہیں۔

فضا

آپ کا نام نامی کاظم یار اور فضا تخلص تھا۔ آپ مولوی حکیم قاسم یار قمر کے برادر حقیقی اور چودھری جعفر یار کے صاحبزادے تھے۔ شعر و شاعری سے اپنے بھائی کی طرح دلچسپی رکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چونکہ مؤلف کو آپ کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہو سکیں صرف ایک قطعہ تاریخ سراپا غم مصنفہ عبدالحمید فرنگی محل میں مل سکا ہے جو حسب ذیل ہے۔

جناب مولوی عبدالحلیم از حکم یزدانی
ز دنیا نا مرادے خود لقاب انداز رحلت شد
بسیلاب الم درد اوگیتی خانۂ خود را
متاع عیش غرق بحر طوفان مصیبت شد
بصد حسرت بہر جانب صدائے نوحہ می آید
کہ امروز از جہاں سلطانِ اقلیم ولایت شد
زمیں را از رخش شید داغ رنج جانکاہش
فلک آئینہ دار فتنۂ روز قیامت شد
ز بزم قدسیاں آتا ۔ فیض آمد بجان من
چو فکر سال تاریخش عنان گیر طبیعت شد
فضا چوں مہر شد روشن زغیب این رمز بر طبعم
کہ آں ماہ منیرم زینہ ۂ گلزار جنت شد

فیضی

فیضی احمد نام، فاروقی نسب، فیضی تخلص ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق
بچپن سے ہے۔ آپ کے والد مولوی فضل احمد عزلتی، دادا مولوی سجاد حسن تجار
پردادا مولوی رفیع الدین رفیع، سب اپنے زمانے میں اچھے شاعر گذرے ہیں
فیضی نے ابتدائی تعلیم گھر ہی میں کی۔ پھر الہ آباد سے ہائی سکول کے
امتحان میں کامیاب ہو کر لکھنو کے ایک بنک میں ملازم ہو گئے تقسیم ہند کے
بعد پاکستان منتقل ہو گئے اور نیشنل بنک میں اب ایک اچھے عہدہ پر فائز ہیں
شعر و شاعری کا ذوق اب نکھر گیا ہے۔ علامہ اقبال کو اردو کا سب سے بڑا
شاعر اور اپنا روحانی استاد تصور کرتے ہیں۔ قومی اور ملی جذبہ سے اوائل
عمر سے ہی سرشار ہیں۔ اب مذہب کی طرف رغبت زیادہ ہے۔ علامہ سید ابوالاعلیٰ
مودودی کی تصنیفات سے بہت زیادہ متاثر ہیں "خلافت معاویہ و یزید" نے
بھی ان کے ذہنی رجحان میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس کے مصنف محمود احمد عباسی
کو "علامہ" کہتے اور ان سے مراسم بھی ہیں۔

ناطق لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ آسیؔ ردولوی سے بھی آپ نے
چند غزلوں کی اصلاح لی ہے۔ اپنے نکاح کے فوراً بعد ایک غزل پڑھی تھی جس
کا ایک شعر یہ ہے۔

تمنائے دل ہو گئی میری پوری　　کہ بس ہی گیا میرا گھر دھیرے دھیرے

اس غزل کے چند اور اشعار یہ ہیں۔

انہیں مجھ پہ کچھ رحم آنے لگا ہے — دعا کر رہی ہے اثر دھیرے دھیرے

ایک اور شعر میں اسحٰق رونق کی استادی اور فیضانِ صحبت کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

وہی فیضِ رونق جو جاری رہے گا — میں ہو جاؤں گا نامور دھیرے دھیرے

آپ کا بقیہ نمونۂ کلام یہ ہے۔

خار و خس ہی میں ہے پوشیدہ چمن بندی کا راز
تو اگر چاہے تو نظمِ گلستاں پیدا کرے
ہے اگر دل میں ترے احساسِ نظمِ کائنات
ہر نظر تیری نظامِ دو جہاں پیدا کرے

داستانِ عشق دھرائی گئی — حسن میں کچھ برہمی پائی گئی

ان کی آنکھوں سے ہیں آج آنسو رواں — کیا کسی نے سنا دی مری داستاں
سامنے دشتِ غربت کی ہیں منزلیں — شوق لے جا رہا ہے نہ جانے کہاں

جب سے وہ ملتفت ہیں یہی خوف ہے
رنگ بدلے نہ اپنا کہیں آسماں
میرے قدموں سے وابستہ ہیں منزلیں
عزم ہے میرے سینے میں فیضی جواں

ان سے ملنے کی تمنا تو بہت ہے لیکن
یہ بھی اک کوشش ناکام ہوئی جاتی ہے

اے جنوں چاک نہ کر جیب و گریباں للّٰہ
عاشقی مفت میں بدنام ہوئی جاتی ہے

میں یہ حیران ہوں کہ کس کس کی زباں کو روکوں
ان کے آنے کی خبر عام ہوئی جاتی ہے

کس کے جانے کا یہ دردانگیز منظر پیش ہے
ہر نفس کو آج سرگرم فغاں پاتا ہوں میں

میرے تخیلات کی دنیا بدل گئی
جب سے تم آ گئے نظر انتخاب میں

فیضی جمال یار کا عالم کچھ اور ہے
یوں تو بڑی چمک ہے رخ آفتاب میں

کیا آج دعا میری ہم آغوش اثر ہے
مائل بہ کرم ان کی نظر دیکھ رہا ہوں

بیٹھا تری محفل میں لیے حسرت ارماں
کب التفات کی ہوتی ہے نظر دیکھ رہا ہوں

کوئی شوق دیدار میں مر رہا ہے
جواب آپ کا لن ترانی عجب ہے

کبھی بے خودی اور کبھی رنج بے حد
مرا قصہ زندگانی عجب ہے

فیضی شوریدہ سر اتنا تو ہو
خود کہیں وہ میرا دیوانہ ہے تو

قائل

مولوی شیخ فصیح اللہ نام قائل تخلص۔ مولوی امیر الدین عرف امیر اللہ متخلص بہ شائق کے برادر حقیقی تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی عبد القادر رئیس کڑا بڑے ذی علم اور فارسی زبان کے منتہی تھے۔ آپ محلہ مولویانہ میں پیدا ہوئے اور تمام عمر وطن میں ہی گذاری۔ علم وفضل وراثت میں ملا تھا۔ شاعری کا قصبے میں گھر گھر چرچا تھا۔ مشاعرے ہوتے، دعوتیں ہوتیں اور اکثر دن ان ہی مشاغل میں گذر جاتے۔ محلہ مولویانہ ادب و شعر کا حقیقی معنوں میں۔ شروع ہی سے مخزن ومعدن رہا ہے یہاں کا ہر بچہ سخن سنجی اور شعر گوئی کا ذوق وراثت میں ہی پاتا تھا۔ آپ کا شعر پڑھنے کا انداز نہایت درد انگیز تھا۔ سنا گیا ہے کہ جب شعر پڑھتے تھے تو لوگوں کی آنکھوں میں نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ زیادہ کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ نساخ کے "سخن شعرا" سے صرف ایک شعر دستیاب ہوسکا ہے جو پیش کیا جاتا ہے

حاک در اکسیر کی ہے ورد برابر مجھ کو
کر دیا فقر کی دولت نے تونگر مجھ کو

شوکت نادری میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

" قائل موسوم مولوی فصیح اللہ از رئیسان کڑا و برادر اعیانی مولوی امیر اللہ شائق است استعداد علمی بخوبی دارد چندے در لکھنؤ طالب علمی کردہ گاہے بہ اصرار جامع ایں اوراق فکر سخن می کند ایں دو شعر آں بزرگ بطریق یادگار۔

می شود۔

خاکِ دامگیر کی ہے قدر ہما پہ مجھ کو
کر دیا فقر کی دولت نے تونگر مجھ کو

عاشق پہ اپنے رحم تجھے اے صنم نہیں
وعدے کی شب ہے دود یہاں دم میں دم نہیں

قائل

کڑا کی سرزمین میں دو شاعر قائل تخلص کے گذرے ہیں ایک مولوی فصیح اللہ قائل جو مولوی امراللہ کے برادر حقیقی اور افصح الفصحا امام الشعراء وحید الدین وحید کے حقیقی چچا تھے دوسرے خاندان بخاری میں اسرار علی جواد کے فرزند ارجمند سید جواد الحسن قائل۔ قائل ثانی کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور اچھے شعر کہہ لیتے تھے کیونکہ "این خانہ تمام آفتاب است" کے مصداق پورا خاندان شاعر تھا۔ آپ کے دادا بیدار علی بیدار، چچا پرورش علی سخی اور سجاد علی فیاض والد اسرار علی جواد، بھائی عارف حسین عارف تمام کے تمام اچھے شاعر تھے۔ آپ نے اچھے اچھے مشاعروں میں کامیاب غزلیں پڑھ کر داد تحسین حاصل کی۔ ترنم سے شعر پڑھا کرتے تھے۔ انتقال یکم جنوری ۱۹۲۳ء مطابق ۱۳۴۱ھ کو ہوا۔ ایک شعر سنا گیا وہی درج ذیل

ہے۔اس کے علاوہ اور کچھ دستیاب نہیں ہو سکا۔ شجرہ نسب " تاریخ کڑا مانکپور" کے صفحہ ۱۳۶ پر درج ہے۔ آپ تحصیل سراتھو کی عدالت میں مختاری کرتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

آشتی پر تو مزاج بُتِ سفاک آیا
ہارے پیدا ہوئی نالوں میں اثر کی صورت

قمرؔ

قاسم یار نام قمرؔ تخلص آپ چودھری جعفر یار صاحب رئیس کے خلف الرشید تھے عربی فارسی اور اردو میں منتہی تھے۔ قمرؔ نے علوم عربیہ کی تکمیل فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحیؒ سے کی فارسی مولانا محمد حسین الہ آبادی سے پڑھی۔ حدیث کا درس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے لیا اور طب کا درس حکیم عبدالعزیز لکھنوی سے حاصل کیا۔ ڈاکٹری سول سرجن سہارنپور سے سیکھی۔ ویدک لکھنو کے ایک نامی دید سے سیکھی۔ تھوڑی بہت سنسکرت اور انگریزی بھی جانتے تھے۔ عبرانی زبان سے بھی واقفیت تھی ان کا کلام درد و محبت سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ بڑے ہی منکسر، خلیق، سادہ مزاج اور حلیم شخص تھے۔ علم کے بحر ذخار تھے۔ کسی مسئلے پر گفتگو کیجیے۔ علم ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ بڑے حاذق طبیب تھے طبابت کی وجہ سے فرصت کم ملتی تھی لیکن شاگردوں کی تعلیم کا بھی مناسب وقت

مقرر کر رکھا تھا ۴۲ سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مولوی نہال احمد نہال، انہیں کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے جنہوں نے بڑی مفید اور اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ "روضۃ النعیم" مصنفہ عبد المجید فرنگی محلی مطبوعہ ۱۳۰۳ھ کے صفحہ ۲۷ سے قمر کا ایک قطعہ تاریخ نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے مولوی عبد العلیم کی وفات پر لکھا تھا۔

محرم اسرار یزداں مولوی عبد العلیم
آنکہ از درگاہ حق تشریف عز و جاہ یافت

دیدہ مائے فعتش چوں فکر من شد گرم سیر
زیر پائے خویش تاج فرق مہر و ماہ یافت

چند او رشدی کاندر حریم معرفت
عقل او از شمع بزم اولیا اللہ یافت

از بساط اینجہاں چوں آستیں افشاندہ رفت
پیش ایزد جنت الفردوس عشرت گاہ یافت

نور ذاتش تا حجاب افگندہ بر رخ روزگار
قید ظلمت عالم از تابیر رخ و آہ یافت

چوں چراغ صبح شد بے نور روئے آفتاب
ماہ خود را قید غم از حلقۂ خرگاہ یافت

تنگ شد بر دوش ہستی جامۂ عیش و سرور
درد دل چرخ ستم ریز مصیبت سلو یافت

شد چو دامنگیر خاطر فکر تاریخ وصال
رہبر خود فیض آں مرد خدا آگاہ یافت۔

مکتشف شد بر قمر ایں معنے از روحانیاں
کو فنا فی اللہ شد کنہ بقا باللہ یافت

۱۱۰۰ھ

غزل

شوق کس گل پیرہن کا شعلہ زن گلشن میں ہے
گل گریباں چاک بلبل نالہ و شیون میں ہے

اک نظر ہیں کیوں نہ ہو آتا محشر کا ظہور
فتنہ انگیز دہاں اس شوخ کی چتون میں ہے

کب بیاں سے اس کے حل ہو عقدۂ وصف دہن
علت عقد لسانی غنچۂ سوسن میں ہے

کیا اثر دکھلا رہی ہے سوزش راہ لے نہ
شعلۂ اختری ہو لئے جنس دامن میں ہے

قیس

سید مجید احمد نام قیس تخلص کرتے تھے سید علی احمد رضوی کے فرزند تھے مروجہ روایت کے تحت گھر پر تعلیم حاصل کر کے علی گڑھ یونیورسٹی سے انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ میں آپ کا شمار ممتاز طلبہ میں ہوتا تھا۔ آپ کی رہائش اس پارٹی والا تھی جس میں راشد الخیری کے ماموں شیخ بدر الحسن عثمانی بھی تھے اس دور طالب علمی میں آپ نے بڑی کارگذاریاں کیں اور کافی ہنگامہ پرور آپ کی زندگانی کا تصور کیا جاتا تھا۔ آپ بڑے وجیہہ تشکیل۔ گورے چٹے لمبے تڑنگے آدمی تھے۔

قصبے کے الیکشن میں بھی آپ کئی بار انتخاب لڑے اور اہل کرا کی ہمدردی و محبت کا جذبہ رکھنے کے باعث کافی خلوص سے کام کرتے رہے چند دنوں قصبۂ کرا میں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ کواپریٹو سوسائٹی اور پولٹری فارم

کے صدر تھے۔ کڑا کی تمام زمینداری کا انتظام انہیں کے سپرد تھا یہ اور بات
ہے کہ کچھ اعزا کی زیادتیاں، پر ناہم تعلق ختم ہو گئے۔ جس میں کڑا کے کچھ لوگوں
کے دلوں میں آپ کی طرف سے غبار آ گیا۔

کڑا میں اپنا مکان بھی کافی عالیشان اور دیدہ زیب بنوایا جس کی
شہرت قصبہ اور بیرون قصبہ بھی ہو گئی تھی آپ کے مکان کا رنگ پیلا تھا اس
وجہ سے "پیلی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کڑا میں اس محلہ کو ڈپٹیانہ محلہ
بھی کہا جاتا ہے۔ نفیس کی تاریخ ولادت نہیں معلوم ہو سکی اندازہ ہے
کہ ان کی عمر تقریباً ۶۰ سال کی تھی جب ان کا انتقال ۲ ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ
مطابق ۲۳ اگست ۱۹۵۲ء بروز شنبہ تقریباً ۵ بجے شام ہوا۔ ان کے
انتقال کی خبر سن کر کڑا میں سنسنی پھیل گئی اور وہاں کے مسلمان ہندو بہت
غمزدہ ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجے عثمان احمد نے جائداد پر
قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے مکان پر بھی۔ اواخر عمر میں نفیس کی
بیگم کی زندگی بڑی تنگ دستی و عسرت میں گذری آخر کار بعارضہ کینسر ان
کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور اب شاہین کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں ہیں۔

نفیس کو بچپن سے ہی شعر و سخن کا بڑا شوق تھا۔ مشاعروں میں شرکت
کرتے غزلیں کہتے داد وصول کرتے مگر اپنا دیوان مرتب نہ کرتے۔ آپ کا
مجموعہ کلام منظر عام پر نہیں آسکا صرف چند غزلیں جو مشاعروں کی یادگار ہیں
لوگوں کے ورد زباں ہیں۔ شعر گوئی کا بڑا نکھرا اور ستھرا ذوق تھا۔ مشکل
زمینوں میں بھی غزلیں کہہ کر اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھایا ہے۔ قدیم اور

جدید روایات کا امتزاج آپ کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

بادہ و ساغر وہاں ساقی بھی ہے محفل بھی ہے
آرزوؤں میں یہاں محصور میرا دل بھی ہے

دیکھئے کب تک کٹے اور کس طرح غربت کی راہ
آبلہ پائی بھی ہے اور دوریٔ منزل بھی ہے

کشتیٔ دل کا ہمارے دیکھئے کیا حشر ہو
بادباں اُترا ہوا ہے ناخدا غافل بھی ہے

اے دلِ درد آشنا یہ ہے وفاؤں کا صلہ
سرگرانی میری بارِ خنجرِ قاتل بھی ہے

دیکھ آہ نارسا گھبرا نہ جانا راہ میں !
میری ہمراہی میں میرا ایک لختِ دل بھی ہے

بس نہیں چلتا مگر اٹھتی ہوئی موجوں سے کچھ
ورنہ کشتی ہے رواں اور سامنے ساحل بھی ہے

وہ حقیقت میں نگاہیں قیسؔ کی پاتی نہیں
ورنہ اب تک نجد میں لیلیٰ بھی ہے محمل بھی ہے

قیسؔ اور غزنویؔ سے بڑے مراسم تھے غزنویؔ کو ان کی وفات پہ از حد رنج ہوا اور اس سانحہ پہ انہوں نے قیسؔ کا قطعہ تاریخ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے۔

ہے بگیاں یہ مصرعۂ تاریخ حسبِ حال ١١١ — اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے ١٢٨١ ١١١
١٣٧٠ھ
١٩٥١ء

کمال

شاہ کمال الدین[1] حسین نام کمال تخلص۔ آپ بڑے عالم و فاضل اور صوفی منش تھے۔ آپ کو تصنیف و تالیف سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعری قابلیت اور ذکاوت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ محقق۔ عبدالغفور نساخ۔ نصیرالدین ہاشمی۔ فرحت اللہ بیگ اور شیفتہ نے اپنے تذکروں اور مضامین میں ان کا حال قلمبند کیا ہے مصحفی نے اپنے تذکرہ موسوم بہ "تذکرہ ہندی" میں یوں تحریر کیا ہے

"شاہ کمال الدین حسین کمال تخلص وطن بزرگانش کڑہ مانکپور داز چندے والد قبلہ گاہ ایشاں در صوبہ بہار نیز طوطن گرفتند دا نیہا ہمہ درزمانہ خویش منصبدار پادشاہی

---

[1] "اردو" ماہنامہ جنوری ۱۹۵۵ء مضمون نصیرالدین ہاشمی۔

[2] دیوان یقین۔ مرتبہ فرحت اللہ بیگ صفحہ ۶

۳۔ سخن شعرا۔ صفحہ ۳۹۹ مصنفہ عبدالغفور نساخ

۴۔ تذکرہ ہندی صفحہ ۱۹۰ مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفی۔ مرتبہ عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء

بودہ اند۔ شاہ مذکور در آغاز شباب بہ خاندانِ اولیہ بیعت کردہ ظاہر حال خود را بہ لباس درویشی آراستہ و سیر بنگالہ کردہ بہ لکھنؤ وارد شدہ۔ حالا بہ مکانِ راجہ ہولاس رائے سکونت وارد و محو نقش۔ نیز از ہما میرسد۔ شوق شعر ہندی از مدتِ مدید در دلش جاگرفتہ بود ازیں جہت دوادیں اساتذۂ سلف و حال را جمع نمود و قریب سی دیوان بہم رسانیدہ۔ بفیض صحبت بزرگانش و سیر کلام ایشاں کلام خود را نیز بر پایۂ اعتبار کشیدہ۔ پیشتر شاگردیش بیک جا تعین نداشت از چندے بحلقۂ تلامذۂ قلندر بخش جرأت داخل شدہ"

مولوی عبدالرحیم خاں نے اپنی کتاب تاریخ نظام اردو حصہ اوّل کے صفحہ ۲۱۹ پر بھی شاہ کمال الدین حسین کمالؔ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"شاہ کمال سید صحیح النسب تھے۔ برار سے حیدرآباد میں آئے صرف ایک لنگوٹہ باندھ کر برہنہ رہتے تھے اور ایک سانڈنی پر جھولا رکھ کر بیٹھتے تھے۔ ایک شتر سوار آگے نقارہ بجاتا چلتا تھا۔ بڑے قوی الجثہ تھے۔ بڑے فصیح و بلیغ خوش آواز تھے۔ طوطی دکن مشہور تھے شعر بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے ایک گاؤں جاگیر میں بھی تھا۔ سنہ ۱۲۰۷ھ میں وفات پائی۔ منڈی چودھیہ میں موسیٰ ندی کے کنارے ان کی قبر موجود ہے۔ صاحب اولاد تھے۔"

آپ کا تذکرہ گارساں دتاسی نے بھی اپنے خطبہ میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کے تذکرہ "مجموعہ الانتخاب" کا بھی ذکر گارساں دتاسی نے کیا ہے۔ ۱

کمالؔ کے والد ماجد قادر نواز خاں منصب دار اور جاگیردار تھے یہ جاگیر انہیں سرکار عالیہ سے مرحمت ہوئی تھی۔ بعد میں قادر نواز خاں سراج الدولہ کی

(بقیہ حاشیہ (۲۰۴)) با صاحبان معنی مزاجش یک دتیرہ موزوں و مرکب الکرز در مشاعرہ فقیر حاضر شدہ ما کلام این خاکسار را بہ دل ودل دوستی دارد۔ چنانچہ ہر تیرہ دیوان سابد ست خود نقل گرفتہ و تذکرہ را کہ تیار شدہ بخریدار این تمام رسانیدہ کہ دانستن جو نام خود کمال مجسم است بعرش اری سال میجا در خواہد بود "نسخود را مسمیٰ"

تاریخ نظام اردو حصہ اول مصنفہ مولوی محمد عبدالرحیم خاں صاحب مطبوعہ ۱۳۳۱ھ حاجی منشی تورسنہ علیجان صاحب تاجر کتب بازار چار مینار نے طبع کرایا بہمت تمام ۱

ملازمت میں منسلک ہو گئے پھر شاہجہاں آباد جاکر شاہ محمد تقی کے جو حضرت غوث پاک جیلانی کی اولاد میں تھے۔ مرید ہوئے۔ اور خلافت حاصل کی آخر ترک دنیا کر کے فقیری اختیار کی اور عظیم آباد کے قریب محی الدین پور کو بسا اپنی قیام بنایا اس سلسلہ میں بادشاہ وقت نے آپ کو سند بھی دی جہاں مرشدزادہ کے نام پر قصبہ آباد کیا مسجد مہمان خانہ نیز اپنا مقبرہ بنوایا اور کچھ جائداد بھی خریدی یہیں انتقال ہوا اور یہیں دفن ہوئے۔

والد کے انتقال کے وقت کمال کی عمر صرف ۱۴ سال تھی۔ انہیں بھی سیاحت کا شوق دامن گیر ہوا۔ جوانی ہی میں فقیر ہو گئے۔ اور بنگال ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے

عہد آصف الدولہ میں ۲۲ سال بسر کئے اور یہیں ۱۲۱۱ء میں شعراء کا کلام مرتب کر کے اس کا نام "مجموعۃ الانتخاب" رکھا پھر آمد کرا اور دارالحکومت میں کچھ روز مقیم رہ کر حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ حیدر آباد ہی میں ان کا انتقال ہوا کہا جاتا ہے کہ ۱۸۴۳ء تک کمال حیدر آباد میں حیات تھے اور اس وقت ان کی عمر ستر سال تھی۔ نواب کرنول نے ان کو جاگیر بھی عطا کی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کرنول کی ریاست ضبط کر لی۔ مگر کمال کی جاگیر انہیں بحال کر دی۔

رحمت اللہ بیگ۔ انعام اللہ خاں یقین کے دیوان کے دیباچہ میں

ط۔ شاہ کمال کی تاریخ وفات، از سحاب مرزا اردو نامہ۔ کراچی انجمن ترقی اردو

تحریر کرتے ہیں کہ دکن میں شمالی ہند کے اکثر شعرا کے جو دواوین پائے جاتے ہیں وہ خاص طور سے کمالؔ ہی کی سعی کا نتیجہ ہیں یعنی یا تو کمال کے لائے ہوئے ہیں یا ان کے نقل کردہ ہیں۔

کمال کا تحریر کردہ تذکرہ "مجموعۃ الانتخاب" ایک ضخیم کتاب ہے جس میں شعراء کے حالات صرف ایک ایک دو دو سطروں میں ہیں۔ مجموعۃ الانتخاب کا ایک نسخہ نواب سر سالار جنگ مرحوم کے کتب خانہ حیدرآباد میں محفوظ ہے اور ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں تھی پایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مجلس ترقی ادب لاہور پاکستان نے اس کی مائکرو فلم بھی منگا لی ہے اور بہت جلد اس تذکرہ کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ حیدرآباد والے تذکرہ کا سائز $8\frac{1}{2}" \times 12"$ اور صفحات کی تعداد ۳۵۶ ہے فی صفحہ ۱۴ سطریں ہیں۔ یہ خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ اولاً انتخاب کا دیباچہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ردیف وار شعرا کے تخلص کے لحاظ سے حالات فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ کلام کا انتخاب کافی ہے۔ کل ۲۳۶ شعراء کا حال قلمبند ہوا ہے۔ ۱۷۰ شعرا ایسے ہیں جن کا تذکرہ میرؔ۔ قائمؔ۔ اور مصحفیؔ نے اپنے تذکروں میں کیا ہے اور ۶۵ شعرا ایسے ہیں جن کا حال ان تذکروں میں نہیں۔

کمالؔ کو شاعری سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ پہلے کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اور اپنی اصلاح کے لئے اساتذہ کے کلام ہی سے استفادہ کرتے تھے بعد میں جرأت سے اصلاح کی اور چند اصلاحوں کے بعد ہی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔ شاہ کمال کے فرزند اکسار حسین شمس الامرائے

صاحبین میں تھے اور کسی اولاد کا پتہ نہیں چل سکا۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

شب وصال میں جب سوز غم کی بات چلی　　خروش مرغ سحر نے کہا کہ رات چلی
کچھ اور سانہ چلے ہم تو اس جہاں سے کمال　　ہمارے ساتھ فقط اک خدا کی ذات چلی

میں بندہ کیوں نہ ہوں اس کی ادا کا　　عیاں اس بت میں ہے جلوہ خدا کا
تو خواہی پانخواہی گالیاں دے　　ہمارا کام ہے دینا دعا کا
ہے بس ڈھپنے کو تن یاں چادر خاک　　میں کیا خواہاں کسی سے ہوں ردا کا
ہیں اس دیوار کے سایہ میں جو شخص　　کریں کیا لے کے وہ سایہ ہما کا
کمال اس کا جھکا سر کس کے آگے
ہے جو بندہ علی مرتضیٰ کا

جوں قدم یار نے ٹھوکر سے مرے سر پہ رکھے　　سر جھکا زانو پہ میں ہاتھ جگر پر رکھا
ہمکو صیاد نے رکھا جو قفس بس تو آد　　دست شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پہ رکھا
سنگ سو اسکی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا　　مثل گوہر ہم نے اٹھا کر اسے سر پر رکھا
بیٹھے بیٹھے مجھے کوں آگیا یاد آج کمال
تو نے رومال جو لے دیدۂ تر پر رکھا

چشم خوں بستہ سے پھر اشک رواں ہوتا ہوا　　طفل خوابیدہ بہت دیر میں بیدار ہوا
جانے کیا ہمکو پھر اک سو نظر پڑا　　دیکھا میں جس طرف کے تئیں تو نظر پڑا

پیا ہے صفائے حسن تری میں کہوں کہ کیا　　ہر آئینہ سے صاف تر آرد و نظر پڑا
تک تا ہے نہ آنکھوں میں میرے یہ خیال　　اکثر ہے یہ کہ سرو لب جو نظر پڑا
دیکھی کماں غور سے اس کی کمر جو میں
کچھ اور تو نہ تھا مگر اک مو نظر پڑا

مرے جیسے ملے آنکھوں تک دل آن پہنچا　　جو آنا ہے تو یاں اپنے تئیں جلدی سے پہنچا
ابھی ہانا سلسلے یہ مرزا ہو جس کا ہوگا　　گر گرنی سے مضافی پہ وہ خورشید سے پہنچا
لبادا کم نہ ہوئے بزم میخوار دل کی یکسبب　　فشاں اوس ساقی پر مغاں بھر کر سبو پہنچا
پلا حسرت بھرا میں کشتی ہستی سے بے ہنگام　　دم بسمل یہ میرا اس کے دامن تک لہو پہنچا

کیوں تو پھرتا ہے دلا گرد اسکے سودائی ہوا　　لطف کیا ملنے کا ہے اس سے تو ہرجائی ہوا
خبر شکست شیشہ دل کچھ نہ دیکھا اس کا کام　　مرتفع جس دانہ یہاں سے جیرہ میانی ہوا
قیس کو الفت میں میری مت برابر تو سمجھ　　عشق و لیلانا کے سمجھے گا جو صحرائی ہوا

یہ زخم دل ہے اسے جرات اس ابروئے پُرخم کا　　کرے گا اس کو کیا چنگا تیرا پھاہا مرہم کا
یہ ہے الماس کی کوئی گریباں پاک اے مہد　　پس از خورشید بھالے پھیر مارا صبح کا چمکا
کروں کیا اے کماں آنسو تھمے آنکھوں سے جو میرے
نہیں کچھ سوجھتا درماں مجھے اک چشم پرنم کا

دل کے ہر داغ کا ہے رنگ کچھ اسے یاد نیا — پھر کر تو بھی کہ پھولا ہے یہ گلزار نیا

جنس دل جس کی مانگی ہے قیمت اس سے — واہ پیدا یہ ہوا نزود خریدار نیا

کس طرح کیجئے نہ پھر تو تلون جلوہ اسے — رنگ ہر لحظہ دکھاتا ہے وہ دلدار نیا

کہہ مشتاق طبیبوں نے کہا دیکھ مجھے — طرفہ آزار ہے یہ اس کو ہے بیمار نیا

جوں جوں کرتے ہیں دوا اور مرض بڑھتا ہے — یا الٰہی اسے کیا ہے یہ آزار نیا

ایک نقشہ پہ نہ ٹھہرا رہے پھر کیونکر کمال
رنگ اس چہرۂ عالم کا ہے ہر بار نیا

گھر اپنے بلا کے رستی آن نکالا — جھگڑا نو مزے کا یہ مری جان نکالا

اس صانع قدرت کے ہوں قربان ہر شکل — اللہ یہ انسان سے انسان نکالا

میں کود کے دیوار گیا یار کے گھر اندر — بیچارہ گیا مفت میں دربان نکالا

اپنی نظر کے آگے سے عالم گذر گیا — یہ قافلہ شباب نہ جانے کدھر گیا

کیوں ہمیں تو دیکھو کہ آزردہ جانا ہو گیا — کیا ہوا گر ہم فقیروں کا بھی آنا ہو گیا

مبتلا کس کے ہوئے آفاق پہ ہیں ہم کمال — شہرۂ آفاق جو اپنا فسانہ ہو گیا

رہ جا چمن میں تو کوئی دم اور عندلیب — تا ایک دو نالہ کریں ہم اور عندلیب

اس گل بغیر ایک تو سونا لگے ہے باغ — کرتی ہے بول بول ستم اور عندلیب

خط جو اس جلے عاشق کا اسے بہلا ہے — پھر کبھو ان نے نہ ہنستے ہے اٹھایا کاغذ
تیرہ بختی تو یہ ہے جینے کی ضعیفوں کے بہانے — ہوئی گلزار جہاں شب کو جلایا کاغذ

ٹکڑے کیسے جگر کو میرے ٹوٹ ٹوٹ کر — رویا ز بسکہ غم میں ترے پھوٹ پھوٹ کر
اک ہم رہے اسیر قفس اور ہمصفیر — پہنچے چمن میں قید سے سب چھوٹ چھوٹ کر

ہم گدا دیکھتے ہیں اس بت گمراہ کی راہ
یعنی آ نکلے تو کچھ مانگیں ہیں اللہ کے نام

ہاتھ میں اس بت کی جو نازک کلائی آ گئی — گویا قبضہ میں مرے ساری خدائی آ گئی
وہ بت مغرور کل ہم سے ہوا جو ہم ردیف — سامنے ہو کر مجسم کبریائی آ گئی
لے چلا صحرا میں کیوں مجھ کو دل وحشی تو کھینچ — بیٹھے بیٹھے جی میں یہ کیا تیرے بھلائی آ گئی
اکڑ و بالا بے طرح سے کر چکے تھے تم کو نند — شیخ صاحب آپ کے آڑے کمائی آ گئی
حرف مطلب جوں کہا اس سے کیا میں نے بیاں
سنتے ہی بس اس کے چہرے پر رکھائی آ گئی

١

نظر پڑتے ہی اسیروں کو کوئی دلگیر کانپے ہے — کہ جیسے دیکھ کر صیاد کوئی نخچیر کانپے ہے
نظارا اس شوخ کی پڑتے ہی بس دل تھرتھرا اٹھا — کلیجے پر کوئی جیسے کہ کھا کر تیر کانپے ہے
چلا وحشت سے ہوں میں آگے ماں لیکے کوچہ میں — کہ جوں جوں پاؤں رکھتا ہوں ادھر زنجیر کانپے ہے

کیا غضب ہے دم ہے آنکھوں میں لبوں پر جان ہے
دم کی فرصت اب نہیں اور دل میں سوار مان ہے

کھولے آنکھیں وقت آخر بھی ترا بیمار ہے — مرتے مرتے بھی اسے کیا حسرت دیدار ہے
اب جو اٹھ آئے گلی سے یار کی تو کیا کہیں — سامنے آنکھوں ہی کے ہر رخنہ دیوار ہے
خواب غفلت میں ہے کیا بیدار ہو ہشیار ہو — قافلہ راہ عدم کا چلنے کو تیار ہے
سانس لے سکتے نہیں ہیں کیا کہیں ہم آسماں — اب تو درد دل سے ہمکو زندگی دشوار ہے

اٹھتا ہے اس کے کوچے سے بار گراں مجھے — تکلیف سیر باغ نہ دو دوستاں مجھے
تجھ بن نظر اٹھا کے میں دیکھوں ہوں جس طرف — اوجڑا نظر پڑے ہے یہ سارا جہاں مجھے
اٹھتا ہے دل سے نالہ بھی لے آہ کا عصا — غم نے کیا ہے اس قدر اب ناتواں مجھے
آزادی قید زلف سے آتی نہیں نظر — بخت سیہ نے لاکے پھنسایا کہاں مجھے

از بس کمال انس ہے جی کو قفس کے ساتھ
نے فکر باغ ہے نہ غم آشیاں مجھے

نہ سمجھو آپ سے تشریف یار لاتا ہے — ہمارا جذبۂ دل پہ ابھار لاتا ہے
گلوں کو جھانکیں ہوں کیا کیا چمن میں جو صیاد — قفس اٹھا کے یہ فصل بہار لاتا ہے
نہ آتے ہم بخدا تیرے در پہ اے کافر — یہ کیا کریں یہ دل بیقرار لاتا ہے
بلائیں لینے لگا میں تو پیچھے ہٹ کے کہا — سرک بھی یاں سے کہاں کا پیار لاتا ہے

ہزار آئیں بہاریں پہ نخل تک اپنا
کبھی شگفتہ ہوا ہے نہ بار لاتا ہے

نثار ہونے کی تیری گلی کی خواہش ہے
یہ گرد باد جو اتنا غبار لاتا ہے

پس فنا تو ذرا آ کر یہ دلِ مضطر
قیامت ایک نہ سنگ مزار لاتا ہے

دلانہ اس سے الجھ تو کہ سانپ چھتے ہیں
دکھا وہ زلف نئی مجھ سے مار لاتا ہے

چمن میں دیکھا جو اس گل کو آنکھ اٹھا کے کمال
تو آنکھوں میں وہ گڑ دے کو خار لاتا ہے

کچھ ان دنوں دلِ پر داغ اس بہار پہ ہے
گمان یہ گلوں پہ نہ لالہ زار پہ ہے

چمن میں کانٹے پہ گل کو پرو دے ہے جو کوئی
یہ عندلیب کا دل ہے جو نوکِ خار پہ ہے

گیا جو میں جی سے اٹھا کر جو دردِ تنہائی
تو بیکسی مرے اب نوحہ گر مزار پہ ہے

نہ تن سے نکلے ہے جی اور نہ یار آتا ہے
عجب طرح کا عذاب اپنے جسم زار پہ ہے

نہیں ہے پوست تو بے ہوشی کمد یا معبود
نشہ کمال فقیروں کا اب اتار پہ ہے

آہ مسیحا جسے دیکھ کر کنارا کرے
اس کے مرض کا بھلا کیا کوئی چارہ کرے

تیغ سے اپنا گلا کاٹیں نہ پھر کیونکہ ہم
غیر کو ابرو سے کچھ جب وہ اشارہ کرے

سیرِ چمن میں نہ آئے جس کو نظر اپنا گل
آہ گلوں کا وہ کیا خاک نظارہ کرے

فرقۂ عشاق میں ہے وہی صاحب کمال
ذلتِ خواری کے تئیں جو کہ گوارا کرے

نہیں خورشیدِ فلک ہم جو چمکتے جاویں
سایہ ساں جائیں جدھر سر کو پٹکتے جاویں

یاد کش آہ ہے اور دل میں بھری آتشِ غم
شعلہ پر شعلہ نہ پھر کیونکہ بھڑکتے جاویں

زلف مشکیں میں جو ہو مثلِ صبا اپنا گذر
ہم بھی پھر جاویں جدھر کو تو مہکتے جاویں

ہم جدھر جاویں تو یہ دیدۂ پر اشک اپنے　　جام لبریز کی مانند چھلکتے جاویں
یہ بھی کوئی بیٹھنے کا بزم میں اسلوب ہے واہ　　جوں جوں ہم آگے بڑھیں آپ کھسکتے جاویں
خاک رہ جی کی ہوا ہوں میں غضب ہے یہ کہ　　اس طرف گذریں تو دامن کو جھٹکتے جاویں

میاں او جانے والے آنکھ اٹھا کر ٹک ادھر دیکھو　　کوئی مضطر پکارے ہے ذرا منہ پھیر کر دیکھو
اجی میں کیا کہوں ناچار ہوں کہتے ہو کیوں مجھ سے　　مزیوں حیران ہو کر مجھ کو تم دوپہر دیکھو
یقین تم کو اگر آتا نہیں ہے میری حالت کا　　تو آئینہ کو اپنے سامنے ٹک تم بھی دھر دیکھو
کمال خستہ کو یارو یہاں قسمت سے آئی ہے　　نہیں تو مجھ کو دیکھو اور یہ میرا سفر دیکھو

اعتماد اس کے ہو پھر قول پہ کیونکر جن کے　　دم بدم بات نئی ہر گھڑی اقرار نیا

میں بندہ کیوں نہ ہوں اس کی ادا کا　　عیاں اس بت میں ہے جلوہ خدا کا

شعلے سے آہ کے یہ دل نالاں بجھ گیا　　کیا بس چلے ہے آتش سوزاں سے کاہ کا

قد کا نہ تیرے آنکھوں میں کیونکر ہے خیال　　اکثر ہے یہ کہ سرد لب جو نظر پڑا
بس کود کے دیوار گیا یار کے گھر اور　　بیچارہ گیا مفت میں دربان نکالا

دیکھ رستے میں ہمیں دینے لگے گالی کیا خوب　　جان صاحب نے نئی یہ تو نکالی کیا خوب

شہر آشوب شاہ کمال

ز بسکہ ہے فلکِ دون پرست و نا ہنجار — سہے ہے محنت نجباؤں کے دست آزار
ہر ایک شخص ہے ہاتھوں سے اسکے زار و نزار — عجب طرح سے گذرتی ہے آہ لیل و نہار
نہ چین جی کو کسی کے نہ ایک جا ہے قرار

جو شخص اہل کمال اور ہیں گے اہل ہنر — وہ فکرِ قوت میں رہتے ہیں بہ غم ششدر
کہ تن کو جان کی نہ جان کو ہے تن کی خبر — پھرتا ہر کس و ناکس کے ان کو ہے دوہ
وزیر و شاہ سے ملنا تھا جن کو ہمک دمار

نہ ان کو ملتی ہے طفلِ صغیر تک بھی خورش — نہ سر پہ ٹوپی ہے ثابت بدن پہ نہ پوشش
جب ان پہ ہووے ہے کچھ گرسنگی کی شورش — تب اٹھ کے گھر سے جو کرتے ہیں رزق کی کوشش
تو کھا کے رنگ وہ پھر آتا ہے گھر میں بس نا چار

جو تنگ ہو کسی عمدہ سے جا کرے ہیں سوال — تو منہ چڑھا کے وہ بیٹھے ہیں اور پھلا کر گال
لگے ہے کہنے وہ اپنا ہی تنگی و احوال — زبان پہ لاتے ہیں اور یہ مثل وہیں فی الحال
کہوں میں کیا کہ ہے اک انار و صد بیمار

وزیر و شاہ جو ہیں انکے ملک کا ہے ڈھنگ — کہ اپنے تخت سے رہتی ہے انکو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہیں گرفتاریاں بقید فرنگ — سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہے شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار

جہاں تھے بجنے کے طبل اور توپ کے تو پر — بکے ہے اب وہاں ناقوس اور ستار و طنبور
دریغ ایسا ہو برباد خانہ تیمور — کہ ریزہ چیں تھے سو جسکے قیصر و فغفور
بگڑ گیا ہے زمانے کا ہائے کیا اطوار

وہ جو پہ شہر ہے اور ہے وہی یہ ہندوستاں   کہ جس کو رشک جناں جانتے تھے سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے یہ ویراں   نظر پڑے ہے بس اب صورت فرنگستاں

نہیں سوار رہے یاں اب سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبت و تھالی دھاکے کی تھی صدا   فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت کا کیا رتبا   بموجب کہ محل سراؤں میں گردوں کا پھیرا

نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

نہ ہووے دیکھ کے کیونکر دل اپنا اب مغموم   بموجب کہ جہاں ہما، تہ آشیانہ بوم
وہ جیسے تو بس اس ملک بھر میں مخدوم   فرنگیوں کے جو حاکم تھے ہو گئے محکوم

تو ہم غریبوں کی پھر کیا ہے یاں شمار و قطار

رئیس شہر جو ہے اس کی اب ہے یہ اوقات   رہے ہے شوق الٰہی میں محو وہ دن رات
نہ عزم ہے نہ امیری کی اس کو تشویشات   خبر نہ ملک کی اس کو نہ کام کی کچھ بات

رہے ہے اور مزے کی شراب میں سرشار

جو جانشیں تھا ہوا بعد آصف الدولہ   کہ خوش تھے جس سے سب ادنیٰ اعلیٰ
نمک حراموں کا ہووے خدا کرے کہ بُرا   دیا تھا قید میں ظالم نے اس کو آہ پھنسا

نکل گیا یہ وہ مردانگی سے بس اک بار

وہ یعنی صفوۂ عالم یہ جس کا ہے گا نام   ملقب وزیر علیخاں بہادر اس کا نام
رہا تو جب سے یہ کچھ کر گیا ہے ایسا کام   کہ یاد رہے گا وہ کام تا بروز قیام

نہیں تجلی کو حق کی ہے سچ سے تکرار

کمال

شیخ کمال احمد نام کمالؔ تخلص شیخ محمد تقی ولد شیخ محمد وزیر رئیس کے صاحب کمال فرزند ہیں۔ سنہ ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ کڑا اور اس کے قرب و جوار میں آپ کا نام کافی مشہور ہوا۔ اور یہاں کے فضلا میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے فرزند رشید مولوی نہال احمد نہالؔ اپنے زمانے میں بڑے ذی علم فہیم متدین عالم۔ انشاء پرداز۔ صوفی اور صحافی گذرے ہیں۔ منشی جمال احمد دوسرے صاحبزادے بڑے نامی گرامی اور عوامی رہنما رہ چکے ہیں۔ جنہوں نے کڑا سے ایک ماہنامہ "ہمدرد" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ بہت مفید رسالہ تھا۔ نیز مفید کتابیں بھی مثل "کیا اشاعت اسلام بزور تلوار ہوئی" وغیرہ شائع کی تھیں۔ صاحب تصنیف ہونے کے علاوہ بہترین مقرر بھی تھے۔ کمال سے شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے پایا تھا۔ مقامی شاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اور اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔
ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ میاں جی بخشش علی نے آپ کو فارسی کی تعلیم دی تھی میاں جی محسن علی کا شمار کڑا کے ان گنے چنے فضلا میں ہوتا تھا جو کڑا کی ناک تصور کئے جاتے تھے۔
نظم و نثر اچھی لکھتے تھے جس میں شگفتگی۔ سلاست اور روانی پائی جاتی تھی۔ اس وقت دبستان شاعری میں نسیرؔ کی شاعری کا طغرا بہت بلند تھا۔ اس زمانے کے اکثر شعرا نسیرؔ سے ہی اصلاح سخن لیتے تھے۔ کمال نے بھی اپنے

اس خاندانی شاعر بشیر علی بشیر سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ بشیر کمال کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اپنی بیاض شاعری بھی انہوں نے کمال ہی کو دے دی تھی۔ مگر یہ بیاض اب خاندان میں محفوظ نہیں۔ بشیر کے انتقال کے بعد کمال نے اپنا کلام علامہ وحید کو دکھانا شروع کیا اور ایک مدت تک وحید سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ آپ بہت منکسر مزاج۔ متدین۔ پاک دل۔ صاف گو۔ ذی مروت۔ دلنشان تھے۔ انتقال ۲۵۔ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ کو ہوا۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔ شجرہ نسب تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۲۵ پر درج ہے۔

جل کر مل نہ پڑے زلف کے بل کھانے سے
درد شانے میں نہ ہو بال کے سلجھانے سے

شمع رکیوں ہوں نازاں مرے جل جانے سے
سوزش عشق میں امنڈوں ہوں میں پروانے سے

دل عاشق پہ قدم رکھے نہ یوں وقت خرام
ٹوٹ جائے نہ یہ تبنشہ کہیں ٹھکرانے سے

اک پریزاد کا جب سے میں ہوا دیوانہ
کام رکھتا ہوں نہ اپنے سے نہ بیگانے سے

اس کی دیں یاد رہے جب دیں پہ آجاتا ہے
سیکڑوں دانے خدا دیتا ہے اک دانے سے

ہو گیا ہے دل صد چاک مرا اس میں اسیر
زلف خمدار کو سلجھاؤ نہ اب شانے سے

عشق بت میں نظر آتی ہے مجھے شان خدا
میں مرکنے کا نہیں اب کبھی بت خانے سے

کھینچتا ہے طرف کوچہ قاتل مجھ کو
دل ہمیشہ سمجھتا نہیں سمجھانے سے

دیر سے لایا خدا مجھ کو ترے کوچے میں ۔۔۔ پہنچا میں کعبۂ مقصود کو بت خانے سے
جب سے بہتا ہے ترے دستِ حنائی کا خیال ۔۔۔ مہلت اک دم کی نہیں خونِ جگر کھانے سے

دل سودا زدہ سے چھیڑ نہیں اچھی کمال
دیکھو ہشیار الجھتے نہیں دیوانے سے

خندۂ گل گریۂ شبنم سے کچھ مطلب نہیں ۔
اک روش پر ہیں ہوں مثلِ سرو بستاں آج کل

"قصیدہ نعتیہ"

جو رکھا تاجِ حق نے فرقِ آدم پر کرامت کا ۔۔۔ وہ باعث تھا ازل ہی سے تیرے ہی جلوۂ خلقت کا
بنائے کیوں نہ سب سے گو سا جبہ رسالت کا ۔۔۔ ضیا سے جس کی پرتو ہے ترے نورِ نبوت کا
کوئی نازاں سعادت پر کسی کو فخر طاعت کا ۔۔۔ بھروسہ ہم گنہگاروں کو ہے تیری شفاعت کا
وسیلے کی سند لکھی ہوئی آدم کے ہاتھ آئی ۔۔۔ جو دیکھا نام حق کے ساتھ نامِ پاک حضرت کا
سراپا آغاز سے انجام تک کیسا خیال اس کو ۔۔۔ رسولوں میں کوئی غمخوار ایسا ہے بھی امت کا
کسی سے بھی علاجِ معصیت ہوتا نہ محشر میں ۔۔۔ اگر ہوتا نہ بہرِ رحم دل مرہم شفاعت کا
ترے باعث سے کیا کیا پرورش حق کی ہوئی ان کی ۔۔۔ دریچہ ادھر وا ہے ادھر دروازہ رحمت کا
ظہور اب عالم سے جو جو پردہ نہ اٹھ جاتا ۔۔۔ نہ کہنا کوئی کو خوش انجمن میں رازِ خلوت کا
عدم سے لایا تھا شوقِ زیارت سراسر ہیں ۔۔۔ یہاں اب منتظر ہوں وعدۂ روزِ قیامت کا
شگفتہ کیوں نہ ہو گلزارِ دل مضمونِ عارض سے ۔۔۔ مذاقِ عشقِ حضرت رنگ ہے اپنی طبیعت کا

صبا جانا مدینے میں تو اتنا عرض کر دینا
کہ اب اچھا نہیں احوال مشتاقِ زیارت کا

تو وہ ہے جلوۂ نورِ حقیقت جسکے پرتو سے
ازل سے تا ابد ہے راستہ روشن ہدایت کا

نمایاں شانِ وحدت کی ہے ذاتِ پاک احمدؐ سے
محمدؐ میں نظر آتا ہے جلوہ ذاتِ وحدت کا

گرامی

فصیح اللہ نام گرامی تخلص۔ مولوی فخر اللہ رئیس کے فرزندِ ارجمند تھے۔ شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ بیشتر نعت کہتے تھے۔ صوفی منش تھے اس واسطے کلام میں تصوف کی جھلکیاں ملتی ہیں محلہ قصبایانہ میں مکان تھا۔ قصبہ کے جملہ اہلِ علم بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ متین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ آپ نے قادری سلسلہ میں بیعت بھی کی تھی۔ بڑے صاحبزادے سید اولاد اللہ پاکستان میں آگئے ہیں اور ڈاکٹری کرتے ہیں۔

درج ذیل اشعار آپ کے دوسرے صاحبزادے سید انصار اللہ نے آپ کی بیاض سے نقل کر کے روانہ کئے ہیں۔ یہ بیاض سید انصار اللہ ہی کے پاس محفوظ ہے۔ بقیہ تین لڑکے سید اسد اللہ، فضل اللہ، و نعمت اللہ بھی ہندوستان میں برسرِ روزگار ہیں۔ گرامی کا انتقال تقسیم ہندوستان سے قبل ہوا ہے۔ راقم الحروف نے بھی آپ کی زیارت اپنے عالمِ طفلی میں کی ہے ظاہری تقدس سے باطنی تقدس کا اندازہ ہوتا تھا۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے

قلب انسان ہے تجلی گہ خلاق جہاں — اس لیے ہو گیا مشکل مرا انسان ہونا

وہ نہیں میں کہ نہ ہوتا یہ نظارہ جس کو — دیکھا شوق سے گر جلوہ نمایاں ہوتا

ہے ستارہ اوج پر اس عاشق دلگیر کا — جس کے حق میں مل گیا دامن تری شمشیر کا

سرو قد کا نام جب سے میں نے لیا — قمریاں کرتی رہیں کوکو بکو
اے گرامی دل میں ہے اس کا خیال — کیوں بہائیں آپ آنسو سو بسو

دیکھنا اللہ نے چاہا جو حسن با کمال — بن گیا از حکم رب سے بہتر آئینہ
آئینہ جو بن گیا ہے حسن کا اللہ کے — ہو نہیں سکتا ہے ایسا کوئی دیگر آئینہ
اٹھ گرامی قبر سے صلِ علیٰ کہتا ہوا — تک کر اس کو دیکھئے جس سے مظہر آئینہ

آخر عمر میں آپ کو ہومیوپیتھک کا شوق ہوا چنانچہ آپ نے اس کو پڑھ کر سارٹیفکٹ بھی حاصل کیا اور مفت علاج کرتے تھے۔

گہر

آفتاب احمد نام، تخلص گہر، عرفیت علوی نسب ہے۔ آپ جمال احمد جیسے مشہور زمانہ اور رسندائے کڑا کے چشم و چراغ ہیں۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں بمقام محلہ چوک پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی خادم حسین سے گھر پر پائی۔ مولوی خادم حسین کا شمار اس وقت کڑا کے اہل علم میں ہوتا تھا۔ اور اس وقت کے بیشتر لوگ ان سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں بغرض تعلیم الہ آباد تشریف لے گئے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں الہ آباد کے کرسچن کالج سے دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اور وہاں سے بی۔ اے تک تعلیم مکمل کرکے چلے آئے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور کسی اسکول میں مدرسی کر لی۔ حیدرآباد پر ہندوستانی تسلط ہو جانے کے بعد کراچی تشریف لے آئے اور جہانگیر لائن ہائی اسکول میں مدرسی کرنے کے بعد اب ریٹائر ہو چکے ہیں، حیدرآباد کالونی میں رہتے ہیں۔ نہایت ملنسار، انکسار دوست، خوشگو اور نیک سیرت انسان ہیں جس سے ملتے ہیں ٹوٹ کر ملتے ہیں۔ بڑے خلوص و محبت رکھنے والے ہیں۔ آپ کے زمانہ تعلیم میں الہ آباد میں مشاعروں کا بڑا چرچا تھا وہیں سے شاعری کا شوق دامنگیر ہوا۔ دارالاقامہ میں اکثر مجلس مشاعرہ منعقد ہونے لگی۔ تعطیلات میں کڑا میں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ کرانا انہوں نے اپنے ذمہ لیا اور بڑے اچھے اور عالیشان مشاعرے منعقد کرائے اس طرح اس [illegible]

میں بھی کڑا کی فضا ایک بار پھر شعر و نغمہ سے گونج اٹھی۔ شاعری میں کبیر الدین ظہیر[1] سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ کبھی کبھی حمید اللہ سے بھی اصلاح لی ہے۔ ہم عصر شعرا میں عماد الدین عماد[2] اور ظہیر حسن[3] بے تاب اچھے شاعر گزرے ہیں۔ آپ بھی کڑا کی خاک پاک سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کے تفصیلی تذکرہ کی تاب نہیں رکھتے اپنے وطن کی یاد میں اکثر آبدیدہ و غمدیدہ ہو جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

بخشش بے شمار کیا کہیے　　رحمت کردگار کیا کہیے
حوصلہ بڑھ گیا گناہوں کا　　لطف آمرزگار کیا کہیے

وعدۂ وصل یار کیا سمجھے　　لذت انتظار کیا کہیے
کچھ ترے حسن کا قصور نہیں　　دل ہے بے اختیار کیا کہیے
دل پہ رنج و غبار کا عالم　　آئینہ پر غبار کیا کہیے
عالم یاس آنکھ میں آنسو　　دوست سے ہمکنار کیا کہیے
میں تشنۂ دید کیا کرتا　　اور پھر بار بار کیا کہیے
حسرت و یاس باعث تسکیں　　مونس و غمگسار کیا کہیے
زندگی خود ہے ایک جبر کہن　　تہمت اختیار کیا کہیے

---

[1] کبیر الدین ظہیر کا تذکرہ صفحہ ۲۳۳ پر ہے۔

[2] عماد کا تذکرہ ۲۶ پر ہے۔

[3] ظہیر حسن بے تاب صفحہ ۸۲ پر ہے۔

نعت گوئی سے بہت شوق ہے اور ہر سال بڑی پابندی سے یوم ولادت حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم مناتے ہیں اور نعتیہ مشاعرہ کرتے ہیں جس کی ابتدا مولوی نہال احمد نہاؔل کی نعت سے ہوتی ہے۔ نعتیہ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ثنا خواں کیوں نہ ہو سارا جہاں شانِ رسالت کا
محمدؐ میں نظر آتا ہے جلوہ ذاتِ وحدت کا

ابوبکر و عمر عثمان علی سے ہے عیاں جوہر
صداقت کا عدالت کا سخاوت کا شجاعت کا

نگاہ مہر ہے آئے آفتاب دیں تری ورنہ
صلہ ایسا گہر کو مل نہ سکتا نعت خدمت کا

گہر کا انتقال ۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں ہوا۔

گہر

شیخ کریم احمد علوی نام گہر تخلص شیخ محمد تقی کے فرزند تھے۔ تاریخ پیدائش ۱۲ صفر المظفر ۱۳۲۵ھ بتائی جاتی تھی۔ جس روز آپ کی ولادت ہوئی شاہ کریم میر مانکپوری کا عرس تھا۔ اور شیخ محمد تقی وہاں گئے ہوئے تھے۔ یہیں ان کی ولادت کی خبر ملی۔ اسی مناسبت سے ان کا نام کریم بخش رکھا گیا۔ مگر بعد میں کریم احمد کے نام سے مشہور ہوئے۔ شجرۂ نسب خاندان علوی سے ملتا ہے۔ جو تاریخ کڑہ مانکپور کے صفحہ ۱۲۳ پر درج ہے۔ شیخ گہر نے اپنی جائداد میں اضافہ کیا اور دلدلہ وجو دھبا پرتاب دسے سوار خط کڑا خرید لیا

جو بعد میں آپ کے بھتیجوں کو دستے میں ملی۔ صرف ایک دختر نیاز فاطمہ بی بی آپ کی واحد چشم و چراغ تھیں۔

گھر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کتب درسیہ فارسی زیادہ میاں جی بخشش علی سے پڑھیں۔ میاں جی بخشش علی اس زمانے میں فارسی میں کافی قابلیت و استعداد رکھتے تھے۔ اور کڑا ہی میں ہی نہیں بلکہ الہ آباد لکھنؤ اور قریب کے اضلاع میں مشہور تھے۔ فن سپہ گری بھی آپ نے سیکھا اور ورزش کے بھی پابند تھے۔ آپ کی قوت و طاقت کے بہتر لطیفے قصبہ میں اب بھی مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار بازار میں کسی شخص نے کہا کہ اگر آپ بڑے پہلوان ہیں تو ایک ہاتھ سے مجھے اپنے سر کے اوپر اٹھا کر دکھایئے۔ شیخ صاحب کو جلال آگیا ایک ہاتھ کمر میں دیا اور اپنے سر پر اٹھا کر اس شخص سے کہا کہ بول کدھر پھینکوں وہ آدمی بڑی منت وسماجت کرنے لگا۔ شیخ صاحب نے توبہ کرائی اور نیچے زمین پر کھڑا کر دیا۔

بڑے پارسا اور فیاض طبیعت کے مالک تھے۔ نثار اور شاعر تھے شیخ بشیر علی بشیر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ شعر وشاعری سے بہت شوق رکھتے تھے اور شعر وسخن کی محفلوں کی گرما گرمی کے باعث تھے۔ جب مولوی رفیع الدین نے اپنے لڑکے سجاد حسن سجاد کی شادی کی تو آپ نے اس میں کافی حصہ لیا اور کام کاج میں ہاتھ بٹایا حتیٰ کہ اسی شادی میں علیل ہو گئے جو ان کے لئے مرض الموت ثابت ہوا۔ ۱۹ر جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ کو سجاد حسن کی شادی ہوئی اور ۵ رجب ۱۲۹۶ھ کو گھر نے انتقال کیا۔

آپ کے بھائی شیخ کمال احمد کمالؔ کے فرزند ارجمند شیخ نہال احمد
نہالؔ نے گھر پر ایک کتاب "کمالاتِ کریمی" معروف بہ "حدیقۂ احمدی"
تصنیف کی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

جس نے دل سے ہمیں بھلایا ہے
آج رہ رہ کے یاد آیا ہے

مبینؔ

سید محمد مبین نقویؔ، م مبینؔ تخلص کرتے تھے۔ مولوی سید محمد مبین منیسؔ کے
سب سے بڑے صاحبزادے، اپنے والد کے شاگرد۔ صاحبِ تصانیف، بہترین
ادیب و انشا پرداز تھے۔ انشا پردازی میں بھی آپ کو امتیازی درجہ حاصل تھا آپ
کے ایک فرزند سید محمد نقی تقیؔ کراچی میں ہیں جو اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں
مبینؔ نے ایک بہت قابل قدر نایاب کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں قلمی نسخے
نوادرات اور بڑے قیمتی رسائل و جرائد موجود تھے آپ گورنمنٹ برطانیہ کے
عہد میں فوج میں کلرک رہے اس ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پولیس
میں سب انسپکٹر ہو گئے۔ پھر یہ ملازمت بھی ترک کر دی اور ماڈرن ہائی اسکول
الہ آباد میں مدرس رہے اسی زمانے میں شاعری شروع کی۔ بڑے بڑے ادیب
آپ کے مکان پر تشریف لاتے اور شعر و سخن کی محفلیں گرم ہوتیں۔ آپ نے
دیوان جانؔ صاحب ترتیب دے کر انوار احمدی پریس سے شائع کرایا جلال اللہ
احمد جعفری آپ کے قریبی دوستوں میں تھے جو انوار احمدی پریس کے مالک
تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

(آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کیوں نہ قرباں ان کی صورت دیکھ کر ہو اک جہاں
ہر ادا او یہ شکل ہے ہر کرشمہ دل ستاں
دل مرقع ہے ان کی الفت کا
یہ کرشمہ ہے سب محبت کا

متین

مولوی محمد متین نام نقوی نسب متینؔ تخلص کرتے تھے۔ یہ محمد متین نقوی کے فرزند صالح تھے جو میر بنیاد علی کے بیٹے اور میر مظفر علی کے پوتے تھے۔ بہت بڑے ذی علم، ذی فہم۔ محقق۔ مورخ اور مشہور شاعر تھے اُردو کے علاوہ فارسی و عربی کے بھی بہترین شاعر تھے اور شاعری کے ہر صنف پر قادر تھے غزل و ہزل کے علاوہ قصائد۔ مراثی۔ نوحہ جات رباعیات۔ قطعات۔ تاریخی وغیرہ تاریخی اور بہت سی نظمیں بھی موجود ہیں۔ نثر نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اکثر اخبارات و رسائل اس کے شاہد ہیں۔ متینؔ کی بہت سی تصانیف ہیں ان میں تاریخ اسلام کو خصوصیت حاصل ہے لیکن ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔

آپ قصبہ کے دوسرے شخص تھے جنہوں نے ۱۹۰۰ء میں بی اے پاس کیا۔ اس کے قبل محلہ قضیانہ کے نبی اللہ نے بی اے پاس کیا تھا۔ متینؔ کو شاعری

سے بہت شغف تھا۔ اور میر علی عباد نیساں الہ آبادی شاگرد منبر شکوہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ دُبلے پتلے اور نحیف و ناتواں انسان تھے۔ الہ آباد میں وکالت کرتے تھے۔ مگر ضعف بصارت کی وجہ سے آخر عمر میں وکالت ترک کر دی تھی۔ علم حاصل کرنے کا آخر عمر تک شوق رہا اور اس شوق کے تحت آپ نے اپنا ایک مختصر سا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔ جس میں عربی و فارسی کی نایاب و نادر کتابیں فراہم کی تھیں ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بعمر ۷۰ سال داعی اجل کو لبیک کہا۔ سید محمد رفیع نقوی کے چچا تھے اور انہیں کی معرفت راقم الحروف کو آپ کا بہت کچھ نمونۂ کلام اور حالات زندگی دستیاب ہوئے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

ہے یقیں مجھ کو یہ اپنے ضعف جسم زار سے
دب کے مر جاؤں گا اک دن سایۂ دیوار سے

مندرجہ بالا شعر طرحی مشاعرہ کا ہے جو انہوں نے الہ آباد کے طرحی مشاعرہ میں پڑھا تھا جس میں اکبر الہ آبادی کا شعر مصرعہ طرح تھا۔

ان کی گاڑی لڑ گئی ہے میری موٹر کار سے

دل تک پہنچتی تیغ ادا ان کی دیر میں
پڑتی جو کوچۂ رگ گردن کے پھیر میں

ان کی نظر سے داغ جگر اور جل اٹھے
بجلی سے آگ لگ گئی پھولوں کے ڈھیر میں

گاڑوں یہاں تک خنجر سفاک وطن پر
کہ آخر سنبل سودا اُگے دیوار آمن پر

کس طرح پہنچے کعبہ امید سے یا رتک
دل پڑ گیا ہے لوچہ گرد کے پھیر میں

کیا لطف دے نہ ری غزل مختصر متین
یہ چند شعر میں سے کہے تھوڑی دیر میں

الہ آباد ہی کے ایک طرحی مقاصدہ کے قصیدہ سے دو شعر چراغ محفل
مصادف کے صفحہ ۱۲۰ سے نقل کئے جاتے ہیں۔

زر و قوت میں نہ بے مثل ہوں کیونکر حیدر
ہاتھ خالق کے ہیں بازوئے پیمبر حیدر

سرخیٔ چہرہ کفار اڑا دیتے ہیں
تیغ سے کاٹتے ہیں رنگ گل تر حیدر

اکثر اساتذہ غزلیں لکھ کر دوسروں کو دے دیا کرتے ہیں اور دوسرے لوگ انہیں پڑھ کر داد تحسین وصول کرتے ہیں۔ متینؔ بھی انہیں شاعروں میں سے تھے جنہوں نے مختلف واقعات کو بڑی خوبی اور تیزی سے نظم کیا ہے ساتھ ہی ساتھ چند غزلیں لوگوں کو لکھ کر دی ہیں۔ ایک بار ایک صاحب کو ایک غزل لکھ کر دے دی تھی جس کے چند اشعار یہ تھے۔

یاد آتے ہیں جو سیر دشت اُلفت کے مزے
سر کو ٹکراتے ہوں زنداں کے در و دیوار سے

میکدے میں آپ آتے شیخ صاحب گر کبھی
اپنی ٹوپی ہم بدلتے آپ کی دستار سے

دل میں جو ہے دردی رنج سے عدل ہے صاف صاف
راز الفت کا چھپاتے ہو عبث ستار سے

آپ نے دو مسدس بھی لکھے ہیں جو بہت مشہور ہوئے ہیں۔ اور اطراف و اکناف میں اب تک پڑھے جاتے ہیں۔ ان مسدسوں کے اکثر بند لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ پہلا مسدس "عبدالشکور کی آمد سواد خط میں" کے عنوان سے ہے۔ دوسرا مسدس "انجمن" کے عنوان سے ہے۔ ان مسدسوں کو رفیع نقوی نے روانہ کیا ہے وہی یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

چونکہ مولوی متین صاحب شیعہ ہیں جن کے یہاں تبرا جزو ایمان ہے لہذا دوسرے مسدس میں انہوں نے نہ صرف سُنر فلسفے کا اظہار ہی تبرا کیا ہے بلکہ دنیا بھی حافظ نے سقیفہ بنی ساعدہ اور عمر بن سعد کو بھی نہیں چھوڑا۔ باوجودیکہ ان چیزوں کا ذکر مسدس میں ضروری نہ تھا۔

انعقاد انجمن الہادی

واقعہ قصبہ کڑا

اک انجمن کا ان دنوں چرچا کڑے میں ہے	لوگوں میں تفرقہ ہے یہ غوغا کڑے میں ہے
ہنگامہ رستخیز کا برپا کڑے میں ہے	تقریبِ دشمنوں کی یہ ہر جا کڑے میں ہے

یہ انجمن نہیں ہے فریبوں کا جال ہے
نصرت ہے مفسدوں کی حریفوں کی ڈھال ہے

شامل ہوئے ہیں اس میں زیادہ وہی یہود — لیکن مخالف اس کے ہیں قصبے کے اہل سود
جن کے دماغوں میں ہے خلل عقل ہیں مسدود — رہتے ہیں وہ لفافۂ تعصب میں ردّ و کد

فرماتے ہیں کہ نام سے اس کے عناد ہے
یہ انجمن نہیں ہے بنائے فساد ہے

کہتا ہے کوئی اس کے تو ممبر ہیں رافضی — کہتے ہیں سنیوں سے فزوں تر ہیں رافضی
ابلیس سے فریب میں بڑھ کر ہیں رافضی — نزدیک اپنے خوک سے بدتر ہیں رافضی

ان سے تو بات چیت بھی کرنا گناہ ہے
ممنوع عقل و شرع بلا اشتباہ ہے

اک جلسہ منعقد ہوا اہلِ ضلال کا — نو فیر کے جو گھر ہیں بے فکر سنبھال کا
تجویز وہ مقام ہوا قیل و قال کا — مجمع ہوا اسی میں ہر اک بدخصال کا

تھا اژدہام جوش مخالف کے جیش کا
قاضی کا گھر تھا خانۂ مدرس فریسیوں کا

اشرار مجتمع تھے شیاطین بنے ہوئے — حواریہ بیٹھے تھے سب دین بنے ہوئے
مادل میاں سے تھے گرو مسکیں بنے ہوئے — بند آنکھوں کو کئے ہوئے غمگیں بنے ہوئے

تھی احتیاج ان کو نہ کچھ عرضِ حال کی
چہرے سے آشکار تھی صورت ملال کی

ان لوگوں میں جو سب سے زیادہ خلاف تھے — جوشِ مخالفت میں وہ سرگرم لاف تھے

خورشید کو احاطہ کئے لوزہ باف تھے　　کمبل آبیرا اوڑھے تھے متّو لحاف سے تھے
لرزہ انہیں چڑھا تھا وہ تھے تپ میں مبتلا
پٹی وہ سر میں باندھے لپیٹے تھے بہ گلا

پائین فرق تھے علی احمد کے نور عین　　اولاد سب کے آگے تھے پیچھے تھے اُنکے زین
یوں استغاثہ کرتے تھے سب سے بشور و شین　　احقاق کا کوئی مرے اوپر نہیں ہے دین
جھوٹا ہے دعویٰ جھوٹے کے حملے کو رد کرو
مظلوم ہوں حسینؑ کا صدقہ مدد کرو

خورشید بولے ہم ہیں تمہارے شریک حال　　پہنچائے کچھ ضرر نہیں احقاق کی مجال
مکار و حیلہ ساز ہے لیکن وہ بدخصال　　جائے نکل کے نیچے سے یہ یہ ہے محال
دشمن کے آگے ہم کبھی سر موڑتے نہیں
آئے شکار سامنے تو چھوڑتے نہیں

میرے علاقہ کا نہیں اب تک دیا حساب　　اس نے کیا ہے جرم تغلب کا ارتکاب
چوری سے قلمیں آموں کی بیچی ہیں بے حساب　　ہے قصد استغاثہ میں دائر کروں شتاب
دعوے سے دست کش نہ ہوا گر یہ ناسزا
فاضل میاں سے کہہ کے کراؤں گا میں سزا

بندن کے ساتھ اس نے بڑھایا یہ اعتبار　　اپنی سپردگی میں لیا جملہ کاروبار
حاصل تمام ہو گئے جب اس کو اختیار　　لکھوائے اپنے نام پرونوٹ تین چار
اغوا سے اس کے سر کو اٹھایا چماروں نے
دینا لگان ترک کیا کاشتکاروں نے

افسوس کا مقام ہے حیرت کی یہ ہے جا — کرنے لگی ذلیل رعایا مقابلہ
چیونٹی کو عرش پھاندنے کا حوصلہ ہوا — لودھوں نے مل کے باغ سے بیدخل کردیا

ظاہر ہوئے تھے جتنے کرشمے فساد کے
فتنے اٹھائے سب ہیں اسی بدنہاد کے :

ہر چند خود فریب مجسم ہے بیرسٹر — جس کا نہیں ہے مکر و دغا میں کوئی نظیر
لیکن زمیں تھوڑی سی بننے لگا امیر — کہتا ہے یہ جہال ہمارے ہیں دستگیر

رکھتا نہیں زمیں پہ قدم اب غرور سے
لیتا نہیں ہے کام یہ عقل و شعور سے

معلوم بینک کے ہیں مہیں سب معاملات — ہے لوگوں کی تباہی کی باعث انہیں کی ذات
اقساط بینک لے کے مکرر یہ بد صفات — کرتا نہ تھا وصول کبھی درج کاغذات

ظالم کے ہتھکنڈوں سے بہت گھر اجڑ گئے
دو چار بن گئے تو ہزاروں بگڑ گئے

جب بینک کا عرضکہ دیوالا نکل گیا — گویا دہن میں آ کے نوالا نکل گیا
من کو نگل کے حلق میں کالا نکل گیا — اندھیارا گھر ہوا تو اجالا نکل گیا

عزت رہی نہ رنج میں دل مبتلا ہوا
دولت نکل گئی جو رواں زلزلا ہوا

تھا بینک کے شکست کا صدمہ انہیں کمال — سارا علاقہ بک گیا دولت رہی نہ مال
دل میں ہوا بقائے وجاہت کا جب خیال — تدبیر سوچی نام وری کی یہ بے مثال

قائم کرنے بس ایسی ہوا اک انجمن جدید

سسٹم نئے اصول نئے ہوں چلن جدید

بلوایا دوستانِ حماقت خمیر کو عبدالولی کو زین میاں کو نذیر کو

صالح کو اور عفور میاں کو کبیر کو مشاق کو معین میاں کو بشیر کو

احمق ہوئے جو جمع کیا ان سے مشورہ

نوٹس کا سب کی رائے سے لکھا مسودہ

مضمون اس کا یہ تھا کہ اے حامیانِ قوم باشندگانِ قصبۂ نام آورانِ قوم

اے دوستانِ خولص والے ماہرانِ قوم قائم ہے جن کی ذات سے نام و نشانِ قوم

اس دفعہ یہ گذارش عبد ذلیل ہے

عزو ادب سے قوم کے آگے اپیل ہے

پیش آ گیا ہے ان دنوں بحث ایک مسئلا جسکے سبب سے دل ہے مرا غم میں مبتلا

میں چاہتا ہوں عرض کروں اس کو برملا تشریف لائیں آپ تو ہو طے یہ مرحلا

شب کو غریب خانے میں ہے آج پارٹی

طیار ہو گی سب کے لئے خورش گوانٹی

لوگوں کے نام لکھے گئے اہتمام سے فہرست پھر گھمائی گئی ان کے نام سے

نائی زبانی کہتا تھا ہر خاص و عام سے دعوت محل میں آپ کی ہے آج شام سے

قلیہ ہے قورمہ ہے مزعفر ہے کھیر ہے

ایرانیوں کی چائے عرب کی پنیر ہے

جب لوگ مجتمع ہوئے ستون طعام میں تقریر کی حمال نے یہ اتحاد عام میں

قائم ہوئیں کمیٹیاں اب ہر مقام میں تفریق تاکہ کچھ نہ رہے خاص و عام میں

کوئی ہمارے قصبے میں پر انجمن نہیں
راغب اس امر خیر پہ اہل وطن نہیں

حالت گڑھے کی قابل افسوس ہے کمال — دیکھو جدھر عروج و ترقی کو ہے زوال
اصلاح حال کا ہمیں مطلق نہیں خیال — حالت ہماری بدلے یہ اک امر ہے محال

عادات بد میں چھوڑا نہیں ہم چھوڑتے نہیں
رسم خراب لوگوں سے ہم توڑتے نہیں

قتل عمر کے دن نہ کریں شیعہ عید اب — روز غدیر خم کو نہ سمجھیں سعید اب
متروک کر دیں دوسروں کو لعن پلید اب — قائم نہ ہو نفاق کی صورت پدید اب

شیعہ کی طرح اب کریں سنی بھی حاضری!
کر دے تعلقات کو محکم برادری!

دونوں فریق سمجھیں تعصب کو اب حرام — شیعہ پڑھیں نماز ہو سنی کا گر امام
جس میں فلاح سب کی ہو مل کر کریں وہ کام — باقی رہے نہ تفرقہ مابین خاص و عام

شیعہ کے ساتھ مذہب سنی شریک ہو
میدانوں کے مقابل میں سنی شریک ہو

اس سے بھی لغت کوئی بیٹا اگر کرے — قطع تعلقات اسی دم پدر کرے
روحِ عدول اس سے سرمو اگر کرے — صحبت سے اس کی چاہیئے شوہر حذر کرے

جو کچھ برادری کہے وہ سب قبول ہو
منسوخ جملہ حکم خدا و رسول ہو

جب ختم کی جماعت نے تقریر دل پذیر — مبہوت اس کو سکتے ہوئے سب جوان و پیر

مسرور تھا دکام میں خورشید اور نیر — اچھو اُٹھے اُدھر سے اِدھر سے اُٹھے کبیر
کہنے لگے درست یہ آرائے حضور ہے
اک انجمن یہاں کے لئے بھی ضرور ہے

یونس کے ساتھ شفقت لئے کاغذ و قلم — ممبر کا نام کرتے تھے فہرست میں رقم
دھمکی کسی کو دیتے تھے کسی کو دم — اٹھواتے تھے حلف کبھی کھلواتے تھے قسم
محفل برائے وضع امورِ صحیفہ تھی
اُجلی جو بی صاف نذیرِ سقیفہ تھی

تا لیبِ قلب کرتے تھے لوگوں کی سرفراز — پڑھتے نہال گوشہ میں تھے شکر کی نماز
کہتے تھے یہ عزیز حسن ہو نہ فاش راز — جلدی سے کامیاب کرے سبب بے نیاز
قائم کرشمے ہیں دولتِ جمہور آج ہو
اس انجمن کے ممبروں کا جلد راج ہو

چلتے ہوئے یہ نعرے جواد الحسن کے ہیں — مفسد ہیں سرگروہ جو اس انجمن کے ہیں
بدخواہ و بدسگال سب اہلِ وطن کے ہیں — دشمن نبیؐ کے اور عدو پنجتن کے ہیں
مذہب کا پاس ہے نہ مروت کا نام ہے
اس انجمن کو دور سے ایسا سلام ہے

مختار کر چکے جو یہ تقریر دل پسند — ہر سمت سے صدا ہوئی تحسین کی بلند
عادل: بولے رائے بہت ہے یہ سود مند — بے شبہ انجمن کی شراکت سے ہے گزند
لازم ہے ممبری سے کریں لوگ احتیاط!
حامی جو اس کے ہیں کریں ترک ان سے ارتباط

ہونے نہ پایا تھا ابھی جوش دفرد شِ کم — تقریر کی یہ چھٹو میاں نے بچشم نم
اے دوستانِ مشفق و یارانِ ذی کرم — اے حاضرین جلسہ و اے صدر محترم

شکوہ ہے دوستوں سے دل دردمند کا !
سن لیجئے یہ مرثیہ دو چار بند کا !

اعجاز عرض ہے مشتاق سے مجھے — مطلب معین سے ہے اخلاق سے مجھے
صدا لم سے بغض کینہ ہے اسحاق سے مجھے — اُلفت ہے خاص قسم کی اشفاق سے مجھے

صبحن سرورِ قلب ہے لختِ جگر نثار
اس کے قدم پہ جان فدا اس پہ سر نثار

وابستہ ہم مجید کے ہیں خاندان سے — اظہار شکر ہو نہیں سکتا زبان سے
گو دشمنوں نے ہم کو نکالا مکان سے — پھر ہم نے لے لیا اسے کس آن بان سے

ہم کو ملا عروج انہیں کے گھرانے سے
سب گھر پلا ہمارا اسی گھر کے دانے سے

عورت ہو یا کہ مرد ہو بوڑھا ہو یا جوان — قدرت نے سب میں کوٹ کے بھردی ہیں خوبیاں
یکساں سبھوں کی ہم پہ رہیں مہربانیاں — اس گھر کے ٹکڑوں سے ہیں پلی اپنی ہڈیاں

پروردۂ قدیم ہم اس خاندان کے ہیں
ان چوتڑوں پہ داغ انہیں کے نشان کے ہیں

احسان میرے بھائی پہ بے انتہا کیا — عہدہ جو باپ کا تھا مجھے وہ عطا کیا
تھا گھر پہ جو مطالبہ اس کو ادا کیا — احساں کیا تو ہم نے بھی شکر خدا کیا

قبضے میں میرے سونپ کے گھر بار کر دیا

اپنے علاقے کا مجھے مختار کر دیا!

نوکر کو چاہیے کہ ہو مالک کا خیر خواہ ہر وقت اسکے نفع و ضرر پہ رکھے نگاہ
ہو جس میں منفعت وہ کرے راہ اختیار تعمیل حکم میں نہیں آقا کی کچھ گناہ

واجب ہے دفع شر کرے اہل فساد کا!
مجھ کو عمل پسند ہے ابن زیاد کا!

کمزور دل کے میر دراثت حسین ہیں دشمن میں اور دوستوں میں بین بین ہیں
لپٹن کی چائے سردی میں تپ میں پیتے ہیں رہتے وہ مجلسوں میں بعید شور و شین ہیں

انصار کے شریک ہیں کلّو کے ساتھ ہیں
احسان کے گواہ ہیں للّو کے ساتھ ہیں

پنہاں نہیں ہے لوگوں پہ عبدالولی کا حال ہاتھ آگئی ہے مرے یہ تشبیہ بے مثال
میٹھی چھری سے دشمنوں کو کرتا ہے حلال موسیٰ کے ہے لباس میں فرعون دو جہاں

بدکار ہے جواری ہے اور سود خوار ہے
پیراہن شریف میں گویا چمار ہے

مسدس

آمد سوار خط میں ہے عبدالشکور کی دہشت سے کانپتی ہیں زمینیں قبور کی
آواز لاٹھیوں کی ہے یا صوت صور کی ہل چل مچی ہے دشت میں روز نشور کی

روحیں مثال طائر بے آشیانہ ہیں
کنج لحد کو چھوڑ کے لاشیں روانہ ہیں

آتا ہے اس شکوہ و تجمل سے توربان ۔۔۔ کاندھے پہ خانہ سازگزی کا ہے لحاف
ہے گھوٹی منڈی ہوئی داڑھی پاک صاف ۔۔۔ دستہ بغل میں ریش سے موہائے زیر ناف

بستہ بغل میں ہاتھ میں نیمہ لئے ہوئے
پٹواری ساتھ ساتھ ہے نصنے لئے ہوئے

ہیں ساتھ میراپور[1] کے تکیہ کے توربان ۔۔۔ لنگی کوئی ہے باندھے کوئی اوڑھے ہے لحاف
ترشی ہیں مونچھیں ریش درازی میں تا بناف ۔۔۔ دل میں سبھوں کے نور سے ایماں کے پاک صاف

کووں نے کاؤں کاؤں کی تہنیت ادا ۔۔۔ کتوں نے آفریں کہی گیدڑ نے مرحبا
آواز ہو سہاک سے دی بوم نے ندا ۔۔۔ اہلاً لنا و سہلتک اللہ والمنا

خرگوش آئے کود کے تسلیم کے لئے
اٹھے بگولے دشت کے تعظیم کے لئے

اٹھ اٹھ کے مینڈکوں نے ادب سے کیا سلام ۔۔۔ آواز دی گدھے نے کہ حاضر ہے یہ غلام
جو حکم ہو حضور کا دوں اس کو انصرام ۔۔۔ کی عرض لومڑی نے کہ یہ ہے نمک حرام

حاضر ہے خانہ زاد مدارات کے لئے
بیٹھی ہوں راستے میں ملاقات کے لئے

تشریف لائے خیر طلب شاد ہو گئے ۔۔۔ ویرانے آج حسرت شداد ہو گئے
گھوروں کے آج دن پھرے آباد ہو گئے ۔۔۔ قابض سوادِ خط پہ خداداد[2] ہو گئے

---

[1] میراپور ایک موضع نزد سوادخط کڑا۔ [2] عبدالشکور کے باپ کا نام خدا بخش تھا۔

دولت فزوں ہو بڑھتی یونہی آبرو رہے
دشمن ہو پائمال محب سرمزد رہے

مسکین آگے آگے چڑھائے ہیں آستیں — آرہ فقیر[۱] سے دوش پہ رکھے بہت قریں
عبدالولی[۲]- امیدن[۳] و انگن[۴]، کبیر[۵] دیں — سوئے بسار کوئی کوئی جانب یمیں

فکرِ حصول قبضہ ہے جوش و خروش ہے
مومن کی ہمرہی میں ہر ایماں فروش ہے

اک جا ٹھہر کے پوچھا کہ کس کا ہے یہ شجر — نادر[۶] نے عرض ادب سے یہ کی ہاتھ جوڑ کر
یتا غفور کا عذی پہلے تو تھا ثمر — سُبحی[۷] کا اس پہ قبضہ ہے دو سال سے مگر

یہ پیڑ ملک خاص ہے خادم کے باپ کی
مل جائے مجھ کو گر تو عنایت ہے آپ کی

نعرہ یہ ہے کہ ہم ہیں زمیندار صرف کل — ہم نے کئے ہیں سینکڑوں گھر کے چراغ گل
مسجد کھودا کے ہم نے بنائے ہیں چاہ و پل — ہے اپنی سود خواری کا سارے جہاں میں غل

رتبہ ہے ملکیوں سے ہمارا بڑھا ہوا
نام اب سوادِ خط پہ ہے اپنا چڑھا ہوا

آگے ہمارے گردنیں ہیں سرکشوں کی خم — کلمہ ہمارا پڑھتا ہے ہر بانیٔ ستم
بھاگے ہمارے ڈر سے ہیں مفسد سمجھ کے عدم — ہے ذاتِ دفع شر کی ایسے جانو مختتم

---

۱ فقیرے آرہ کش ۲ عبدالولی صاحب رئیس ۳ امیدن قصاب ۴ انگن نوربافت ۵ کبیردین رئیس ۶ نادر کمنگر ۷ سبحی نوربافت۔ شاہ حسام الحق مانچوزجی

ہم سے پناہ مانگتے ہیں عبد الولی بھی ہیں
نالاں ہمیں سے سکھ پائی قلی بھی ہیں

پوچھا تناؤ قبر ہے یہ کس پلید کی — مسکیں ادب سے بولے کہ بابا فرید کی
حضرت حسام شاہ کے اندھے مرید کی — الگن پکارا قبر ہے یہ اک شہید کی

سنتے ہیں سب سے نام مگر جانتے نہیں
ہم لوگ تو وہابی ہیں کچھ مانتے نہیں

جب ساتھیوں سے اپنے سعادت[1] نے یہ سنا — کہنے لگا کہ ہے یہ مرے دل کا مدعا
باقی رہے نشاں رہیں پر نہ قبر کا — ہو کاشت جس سے نفع ہو کبروں سے فائدہ

سب مقبروں کو کھود کے مسمار کیجئے
پرتی کو کاشت کے لئے تیار کیجئے

ہمتا زیب دگر میں شیطاں نہیں مرا — ہاں معترف منافق و ناداں نہیں مرا
کیا غم جو میرا بخش[2] ثنا خواں نہیں مرا — ایسا ہے کون جس پہ کہ احساں نہیں مرا

ممنون ہیں ہمارے محمد متین[3] بھی
ممنون ہیں کبیر[4] بھی زین عابدین[5] بھی

جن[6] کو ملی کم تعلقہ کی ہے ورثہ میں داوری — ان کی بھی ہم نے کی ہے مصیبت میں یاوری
حاصل ہوئی جونک کی ان کو میجری — قارون سے مال و زر میں لگے کرنے ہمسری

---

۱ سعادت عبد الشکور کی عرفیت تھی ۲ میرا بخش نوباف ۳ محمد متین صاحب ناظم ۴ کبیر میاں رئیس ۵ زین العابدین رئیس کڑا ۶ جمال احمد صاحب۔

سارا علاقہ بیچ کے تاراج کر دیا !!
برباد چند سال میں سب راج کر دیا !

حکام سے ترکار میں صحبت تھی رات دن — دعوت تھی پارٹی تھی ضیافت تھی رات دن
مقروض سر بسر یار ریاست تھی رات دن — لٹتی فضول ننگ کی دولت تھی رات دن

سامانِ دعوتِ رفقا دیگ میں گیا !
سرمایہ علاقہ منی بیگ میں گیا

درباری ہو گئے تو ہوا شوق ممبری — مدمقابل ان کا ہوا ایک کھتری [۱]
فتین وجعلساز و دغا باز ومفتری — اس کی مدد کو ہو گئے تیار چودھری [۲]

امجد حسین جن کو یہ اس کا صلہ ملا
خدمت ملی وقار ملا مدعا ملا

ہوتی تھی جانبین سے ووٹر کی گیر ودار — کہتا تھا اپنے ساتھیوں سے ہر امیدوار
ہاں اے وفا شعار وخبردار ہوشیار — دینا نہ ووٹ میرے مخالف کو زینہار

ہنگام امتحاں ہے حمایت کا وقت ہے
دینا مجھی کو ووٹ اعانت کا وقت ہے

الیاسقیم ووٹ دہندہ کا حال تھا — رعشہ بدن میں بات کا کرنا محال تھا
تھی کشمکش میں روح کہ جینا محال تھا — ان کا کچھ خیال نہ ان کا خیال تھا

---

[۱] جمال احمد کے مقابلہ میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری کے لئے فرید گنج کا ایک کھتری الیکشن میں کھڑا ہوا تھا [۲] چودھری امجد حسین صاحب رئیس۔

بے ہوش و بدحواس تھے ساکت زبان تھی
کاہش میں انتخاب کنندہ کی جان تھی
ناگاہ غل ہوا کہ وہ مارا غزال کو — کتنا دلیل آج کیا بدخصال کو
یہ فتح یہ ظفر ہو مبارک جمال کو
آئے ہمنے گو نہ اقبال مدد کو بڑے بڑے
میداں سے سب کو ہم نے نکالا کھڑے کھڑے

مژہ نے کی ہے چھری تیز قلب مضطر پر — لہو کے بدلے نکلتی ہے جان نشتر پر
جلا رہا ہے جگر شوق بوسۂ دنداں — نکلتی جان ہے پیاسوں کی آب گوہر پر
ہمارے دل کو بچا عشق خال سے یارب — پڑیں اچاٹ نہ تجھ سے کہیں کبوتر پر
وہ میکدے میں بھی سوتے نہیں ہیں بے پردہ — گمانِ دیدۂ عاشق ہے چشم ساغر پر

بہار آئی نئے سر سے ہوا شوق چمن ہم کو — ملا برگ شگوفہ بدنہ داغ کہیں ہم کو

کسی پر اور وہ مشق ستم نہیں کرتے — ہمیں ہیں ایک زمانے میں امتحاں کے لئے
بہار خون شہیداں ہے قابل تفریح — حضور جاتے ہیں کیوں سیر بوستاں کے لئے

طاؤس رقص کرتے ہیں گاتی ہیں بلبلیں — آمد ہے باغ میں کسی زہرہ جمال کی
زلفوں سے چھوٹنا دل وحشی کا ہے محال — بے ڈھب پھنسی کمند میں گردن غزال کی

نمی دانند سندان طاعتے جز خدمت ساقی
بود جہر نماز اے شیخ مسجد خشت آں ما سا

مرغوب

سید اطہر علی نام۔ مرغوب تخلص۔ آپ کے دادا نثار علی اپنے چچا کے لڑکے سے ناراض ہو کر اور فرار ہو کر دلی بھاگ گئے تھے۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ آپ سے اور آپ کے چچیرے بھائی سے تلوار چلی اس میں چچیرے بھائی کو شدید چوٹ آئی۔ جس پر نثار کو یہ خیال ہوا کہ چچیرا بھائی مر جائے گا۔ اسی دہشت میں دلی بھاگ گئے۔ مگر علاج ہوا اور ان کا بھائی صحت یاب ہو گیا۔ نثار لڑا سے فرار ہو کر دلی میں محمد شاہ صوبہ کے یہاں قیام پذیر ہوئے تھے جہاں انہیں بڑی عزت و احترام سے رکھا گیا تھا وہ اپنی خوش مزاجی اور خوش مذاقی کی بنا پر بہت مقبول اور ہر دلعزیز رہے۔ جب چچا انہیں تلاش کرتے ہوئے پہنچے تو وہ پہلے تو روپوش ہو گئے

نثار علی کے لڑکے محمد تقی پیدا ہوئے۔ محمد تقی نے بڑی ترقی کی۔ اور نمک کے محکمے کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے۔ اور محمد تقی کے علی نقی پیدا ہوئے یہ بھی شاعر تھے۔ اس سلسلہ کا ایک سجعہ نثار علی نے لکھا تھا۔ سجعہ یہ تھا۔

شد محمد تقی نثار علی ۔ کرد ایجاد فیض لم یزلی
ز محمد تقی علی نقی

مرغوب نے اپنی نوحوں کی کتاب حدائق مرغوب میں اقتباسات حالات
کے تحت صفحہ ۵۹ تا ۱۴۴ ان کے حالات درج کئے ہیں۔ علی نقی سید تخلص کرتے
تھے۔ علی نقی کے تین لڑکے سید علی کریم۔ سید نثار حکیم اور محمد قاسم تھے۔ علی کریم
شروع میں محکمۂ نمک میں انسپکٹر ہو گئے۔ بہت دنوں کے بعد چاند لیلہ چلے آئے
پھر بچھراؤں میں مولوی محمد علی کے منیجر ہو گئے۔ علی اطہر سید علی کریم کے فرزند ہیں
جو چاند پور ہی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۸ جمادی الاول
۱۳۰۱ھ روز پنجشنبہ ۶ مارچ ۱۸۸۴ء بوقت ایک بجے دن ہوئی۔ تاریخی نام
مرغوب احمد ہے۔ ایک صاحب نے اس سلسلے میں ایک قطعہ بھی لکھا تھا۔

سعید ازل سید تولد کرد — سزد در بگوئیم محبوب احمد
پئے سال تاریخ ہمنام دیکتا — سروش سخن گفت مرغوب احمد
۱۳۰۱ھ

مرغوب نے تعلیم قصبہ چاند پور کے اردو مڈل ہائی اسکول میں پائی۔
آپ نے وہیں سے ہائی اسکول کو دویژن میں کامیاب کیا۔ اس کے بعد پرائیویٹ
انگریزی پڑھتے رہے اور امیٹھا ضلع سہارن پور میں اعلیٰ انجینیرنگ اسکول میں
داخل ہوکے جہاں سے کلاس پاس کرکے اوورسیر ہو گئے اور سرحد، دہلی،
مالوہ۔ بمبئی۔ رانی کھیت، دہرہ دون وغیرہ میں تعیناتی ہوتی رہی۔ ۱۹۴۹ء
میں ریٹائر ہو گئے۔ پھر لکھنؤ میں قیام پذیر رہے۔ ۱۹۶۱ء میں ہجرت کرکے
کراچی چلے آئے۔ ۱۹۵۹ء میں حج کیا۔ عراق اور دمشق کی زیارتیں کیں۔ ۱۹۶۰ء
میں آنکھوں میں تکلیف ہوئی اور اس کی وجہ سے آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔

مرغوبؔ کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ شیخ رحمت سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہے۔ ابتدا میں غزل کے میدان میں ہی طبع آزمائی کی۔ پھر بعد مطالعہ و کتب بینی اور اپنے دادا کے فیضان صحبت سے اہل بیت کی مدحت پر طبیعت راغب ہوئی اور اب اسی سے شغف ہے غزل وغیرہ سے صاحب موصوف کو کوئی رغبت نہیں رہ گئی۔ آپ کی سات تصانیف ہیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ آپ کی جملہ تصانیف کتب خانہ آستانہ قدس خراسان میں موجود ہیں۔ ان ساتوں کتابوں کے نام یہ ہیں۔

گلشن جنت۔ حدائق مرغوب۔ ساغر نسیم۔ اصحاب کہف۔ گلستان سجاد جہاد مختار۔ عاشور غم۔

آپ کی دو کتابیں تنویر کعبہ، تاریخ علم چھپ چکی ہیں۔ گلستان سجاد میں جناب سجادؔ کے پنج شعری عربی ردلیف وار دیوان کا اردو میں الہامی ترجمہ ردلیف وار کیا گیا ہے کہ ہر شعر کے وہی معنی ہیں اور وہی ردلیف ہے۔ جہاد مختار میں ساڑھے پانچ ہزار اشعار میں پورے کربلا کا حال قلمبند کیا گیا ہے

آپ بڑے قادرالکلام، فصیح اور شیریں بیان شاعر ہیں۔ آپ نے داغؔ دہلوی کی خدمت میں بھی ایک غزل حیدرآباد بھیجی تھی جو انہوں نے بہت پسند کی اور صرف ایک شعر میں ایک لفظ بدل دیا وہ شعر یہ ہے۔

تری فرقت میں اے پیارے اگرچہ دم نکلتا ہے
تمنائے زیارت میں مگر تھم تھم نکلتا ہے

داغؔ نے تھم تھم کو کم کم کر دیا اور یہ تحریر فرمایا کہ تھم تھم ہمارے یہاں

متروک ہے۔ صاحب موصوف کی پوری غزل معہ داغ کی دستخط کے لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

لگے ارمان شکل یار بن بن کر نظر آنے
دم آہ ان آنکھوں سے عجب عالم نکلتا ہے

مرے سینے کے اندر آتش غم کے شرارے ہیں
دھواں بن بن کے دل کا حلق سے پیہم نکلتا ہے

نقاب روئے روشن سے رُخ پر نور کا جلوہ
جو چھپ چھپ کر نکلتا ہے تو یہ کیا کم نکلتا ہے

ہماری قدر لازم آپ کو ہے یہ سمجھ لیجئے
وفادار اس زمانے میں بہت ہی کم نکلتا ہے

مری دنیا سے رحلت اور انکی حاضری ہے دیکھنے قابل
کہ وہ مشتاق ہیں دیکھیں تو کیونکر دم نکلتا ہے

مرغوب کے چار لڑکے ہیں۔ پہلے سید نوادر حیدر فرسٹ سکریٹری فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں۔ دوسرے سید حسن یاور افریقہ میں پروفیسر ہیں تیسرے سید علی نصرت جج سندھ ہائی کورٹ کراچی چوتھے ابرار حیدر لندن میں ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

"مناجات"

فریاد ہے فریاد ہے فریاد خدایا
دلدار ہے مجھ کو تری امداد خدایا
ہر وقت پہنچتا ہے تو امداد کو اس کی
مضطر کوئی کرتا ہے فریاد خدایا

سنسان مقامات میں بستے چلے جاتے ۔۔۔ مرا دل ویراں بھی ہو آباد خدایا

زینب کی تھی فغاں مرے دلبر کہاں گئے ۔۔۔ نورِ نظر شبیہ پیمبر کہاں گئے

دوست جتنے گئے زمانے سے ۔۔۔ اے دل مبتلا وہ کب آئے
رابطہ صرف اتنا باقی ہے ۔۔۔ فاتحہ پڑھ لی یاد جب آئے

خود تو نے محبت میں یہ آزار دیا ہے ۔۔۔ بیمار مجھے دیکھ کے کہتے ہیں یہ فرزانے

روشن ہے ذرّے ذرّے سے جب آپ کا جمال
غیبت کا عہد بھی نہیں بار گراں مجھے
لیل و نہار ہیں مری نظروں میں ایک سے
بے رنگ کیوں دکھاتے ہیں نیرنگیاں مجھے

جن بندوں سے ابر کرم اللہ کا برسے ۔۔۔ پانی کے لئے تین شب و روز وہ ترسے

شکر ہے علم آشنا ہوں میں ۔۔۔ عالموں سے ملا ہوا ہوں میں

جاہلوں کے قریب کیوں جاؤں ۔۔۔ جب کہ بوجہل سے خفا ہوں میں

مرغوب سمجھ رکھنا ہے معبود کا شیدائی
دانا ہی تھے بہلول نہ زنہار تھے دیوانے

مشفق

کرم تیر خاں نام مشفق تخلص کرتے تھے۔ تفصیلی حالات نہ تو کتابوں میں ملے اور نہ زبانی کچھ علم ہو سکا۔ "مرقع نگار" کی پرانی جلدوں سے صرف اتنا علم ہو سکا ہے کہ آپ کڑا کے رہنے والے تھے۔ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہنہ مشق شاعر تھے۔ اور اچھے شعر کہتے تھے۔ ۱۸۸۸ء کے بعد کسی سنہ میں انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

دل مرا اک بت پہ شیدا ہو گیا ہائے اس کافر کو یہ کیا ہو گیا
توبہ تو بہ ان بتوں کے عشق میں کعبۂ دل بھی کلیسا ہو گیا
بوسہ دے کر یار کو دل دیدیا عشق میں یوں مفت سودا ہو گیا
بولے وہ آ کر جنازے پر مرے مر کے یہ بیمار اچھا ہو گیا
بعد قیس و وامق و فرہاد کے ہم سے پھر آباد صحرا ہو گیا
یاد میں خالِ رخِ معشوق کے دل پہ اک داغ سویدا ہو گیا

میں تو تجھ سے کبھی کرتا نہ محبت قاتل

"مرقع نگار" جلد پنجم نمبر ۲ صفحہ ۱۰-۱۲۔ بابت ماہ مارچ ۱۸۸۸ء

پڑ کر دل کیا نہیں قابو میں طبیعت قاتل

سوئے آرام سے ہم بعدِ شہادت قاتل
گوشۂ قبر ہوا گوشۂ راحت قاتل

مطہر

قاضی مطہر نام۔ مُطّہر تخلص۔ علم و فضل میں اپنی آپ مثال تھے بڑے سنجیدہ اور متین شخص تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ "صبح گلشن" مصنفہ سید علی حسن خاں مطبوعہ ۱۲۹۵ھ کے صفحہ ۴۲۰ پر آپ کے حالات اس طور سے درج ہیں۔

"قاضی مطہر۔ متوطن شہر کڑا است جوہر علم و فضلش سنجیدہ و برگزیدہ
ولفو و نظم و نثرش کامل العیار و سرہ۔ دست بہ بیعت حضرت
شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی قدس سرہ دادہ و در حضور سلطان
فیروز شاہ قدم بر مسند قرب و منزلت اعلیٰ نہادہ۔ ناظم تبریزی
او را شاعر شیریں زبان و نمکین بیان نگاشتہ و مسودات اشعارش
مولانا محمد صوفی مازندرانی در گجرات یافتہ بترتیب دیوانش
قلم برداشتہ ازینجا بعضی اور آگجراتی انگاشتہ؛
"منتخب التواریخ" مصنفہ ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی مترجم محمود احمد

لے کراچی یونیورسٹی فن وار تقسیم نمبر ۲۳ ۰ ۷ ر۔ ۹۵ ۴ مملوکہ راقم الحروف قیمت دا روپیہ
ع ب د ف

فاروقی۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء کے صفحہ ۱۶۲ پر سلطان فیروزشاہ کے ذکر میں عہد فیروزشاہی کے شاعر کے عنوان سے یوں تحریر ہے۔

" اس عہد کے دوسرے شاعر مولانا معطہر کڑہ تھے۔ ان کی اولاد میں سے اس عہد تک لکھنؤ میں موجود ہے اور اپنے بزرگوں کے وقف کے برابر عزت و مراتب پر فائز رہے مولانا مطہر کا ایک دیوان بھی ہے جس میں پندرہ سولہ ہزار شعر ہیں۔ ان کے کلام پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا اور منصب کے تناسب سے شہرت دب کر رہ گئی تھی اس لئے ان کی فضیلت کا جتنا چرچا تھا اتنا ان کے شعر رواج نہ پا سکے بہر حال بہ نظر غور دیکھنے پر ان کے کلام کی ندرت واضح ہوتی ہے۔"

" ارمغان پاک" مصنفہ شیخ محمد اکرام ایم اے مطبوعہ ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔ اشاعت چہارم ۱۹۵۹ء کے صفحہ ۴۰ پر یوں رقم ہے۔

" لیکن اسی زمانہ میں (موجودہ الہ آباد کے قریب) بلاد مشرقی کے صدر مقام کڑا میں ایک ایسا شاعر پیدا ہوا جو ہندوستانی شعراء کی دوسری صف میں ایک امتیازی جگہ کا مستحق ہے۔ مطہر کی تاریخ پیدائش۔ سال وفات اور دوسرے حالاتِ زندگی کے متعلق تذکرہ نگار خاموش ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے بعض اشعار کی بنا پر قیاس کیا ہے کہ اس کی تاریخ

له مقالات شیروانی صفحہ ۳۷۱

پیدائش ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء) اور تاریخ وفات ۷۹۱ھ (۱۳۸۸ء)
ہے۔ مظہر حضرت سلطان المشائخ کے جانشین حضرت چراغ دہلی
کا مرید تھا۔ اور اس نے کئی قصیدے فیروز تغلق اور اس کے
امرا کی تعریف میں لکھے۔ شاعر کا خاص مربی بلاد شرقی کا عالم
اور انشا کے ماہر و کامکتوب نگار عین الملک تھا۔

بدایونی نے مظہر کی ملائیت کی شکایت کی ہے اور بلاشبہ
اس کے بعض قصائد سے روغن چراغ دان کی بو آتی ہے لیکن
صاف اور موثر اشعار کثرت سے ہیں اور چھوٹی بحروں کی بعض
غزلیں تو تیر و نشتر کا اثر رکھتی ہیں۔"

کوئی مصنف مظہرؔ اور کوئی مطہرؔ لکھتا ہے۔ "صبح گلشن" اور "منتخب
التواریخ" کے مصنف قاضی مظہرؔ بتاتے ہیں۔ مگر مقالات شیروانی اور "اذکار
پاک" میں "قاضی مطہر" ہے۔ اتفاق سے کلام جتنا بھی راقم الحروف کو دستیاب
ہوا اس میں کہیں بھی تخلص نہیں ہے جس سے یہ گتھی سلجھ سکتی فی الحال آئندہ
تحقیق و تدقیق کے لئے دروازے وا ہیں۔ شاید کوئی اہل قلم اپنی تحقیق کی
مزید روشنی ڈال سکے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

صبح شد صبح سر از خواب گراں بردارید
بادہ خواہید و ز دل درد گراں بردارید
اے عزیزان ادب مجلس یاراں ادبی است
خوش نشینید و تکلف ز میاں بردارید

طلب وصل یار باید کرد		ورنه در عالم کنار باید کرد

در جهان هر کجا بتے بینم		سر نهادن بپائے می خواهم

عمر دنیا درازی دارد		هرچه گیرید مختصر گیرید

کارم از دست رفت سامان چیست		دردم از حد گذشت درمان چیست
طشت بدنامیم ز بام افتاد		باز در پرده دل هنوز پنهان چیست
محتسب گشت و کس نمی پرسد		که بگو جرم این مسلمان چیست
از من آن شوخ را بگوئے دوست		کاین همه کینه با محبان چیست

گر زنی نیش و گه دهی نوشم
اگر این لطف می کنی آن چیست

مرثیه چراغ دهلوی

ز دور محنت این سپهر زنگاری		کدام دل که نه خون گشت از جگرخواری
کجا به جام طرب مجلسے بنا کردند		که از سپهر نبارید سنگ قهاری
دنا ز عالم فانی مجو که مشهوراند		فلک بخبره کشی اختران به غداری
خزینة البیت سپهر از لغزش انسانی		دفینة البیت زمین از نبات فرخاری
ز دست چرخ ندانم کجا کنم فریاد		که بر گذشت به ناجوری او دلیاری
جهان به ماتم خواجه نصیر دین محمود		هزار گونه فغان کرد و نوحه و زاری

اے مطہر گر ہوس داری کہ گوئی مدحتی — مدح خاقانِ جہاں بطرز خاقانی بیار

اے مطہر نخواہی آسودن — ترک کونین تا نخواہی کرد

وز زبان مطہر مسکین — شاہ ما این دعا مبارکباد

اورنٹیل کالج میگزین کے مئی ۱۹۲۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر وحید مرزا کا ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ مطہر کا نام مظہر غلط تھا بلکہ مطہر تھا۔ علاوہ ازیں مندرجہ بالا مقطعے بھی دستیاب ہوئے جس سے یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ ان کا نام مطہر ہی تھا اور یہ کڑا کے رہنے والے تھے۔ مطہر کڑا کا دیوان فارسی بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جس کی مائکروفلم کراچی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ یہ دیوان ناقص ہے اور ردیف "ل" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے قبل کا دیوان نہیں ہے۔ "قاضی مطہر کڑا" کی ایک اور کتاب "نصیب الاخوان" ہے، جو پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے جس کا نمبر ش ۹۸۲ ہے۔

مقصود

سید مقصود علی نقوی نام مقصود تخلص کرتے تھے۔ پرورش علی سخی جیسے

یکتائے روزگار کے فرزند دلبند تھے۔ شاعری وراثت میں پائی تھی۔ علمی قابلیت کافی تھی۔ عربی، فارسی کی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے ہی حاصل کی تھی اور انہیں سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ رومانی شاعری سے کافی دلچسپی تھی۔ بڑے حسن پرست تھے۔ محفلوں میں ترنم سے غزلیں پڑھتے تھے اور داد وستائش کے مستحق ہوتے تھے۔ مجموعہ کلام شائع نہ ہو سکا، دیگر شعرائے کرام کی طرح آپ کا سارا کلام خاندان کی لاپروائی کی وجہ سے تلف ہو گیا۔ البتہ کچھ نوحے اور مرثیے نیز مسدس میں متعلق واقعات کربلا خاندان میں اب تک موجود ہیں۔ اپنے والد کے انتقال پر بہت ملول و غمگین رہتے تھے۔ مشہور ہے کہ پندرہ روز تک اپنے اس غم میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ والد مرحوم کی وفات پر متعدد قطعات تاریخ لکھے تھے جو سخی کے دیوان میں شائع ہو گئے ہیں۔ اور پیش خدمت ہیں۔

وفاتِ قبلۂ کونین کا سن — کہاں اظہارِ غم کرتے پھرو گے
لکھو اک مادہ وہ مختصر سا — جسے ہر شخص آسانی سے پڑھ لے
اگر پوچھے کوئی مقصود تاریخ — تو کہہ دو سخی جنت میں پہنچے

۱۲۹۳ھ

میرے والد قبلۂ کون و مکاں — نامزد با نام زیبائے سخی
چل لیے دنیا سے جب سوئے ارم — خلد میں یزداں سے کی جا سخی
سال رضواں نے کہا مقصود سے — جنت موجب میں آئے سخی

۱۲۹۳ھ

مقصود حیدرآباد دکن میں ملازم تھے اور وہیں انتقال ہوا۔ وہ زمانہ

محرم میں وطن جلتے تھے۔

ملوکا

بابا ملوک داس نام ملوکا تخلص۔ آپ سندر داس کے لڑکے اور قوم کے کھتری تھے۔ آپ کی ولادت بیساکھ سُدی پنچمی سمت ۱۶۳۱ بکرمی اور وفات بیساکھ سُدی چودس سمت ۱۷۳۹ بکرمی مطابق ۱۶۸۲ء ہے جس سے آپ کی عمر ۱۰۸ سال قرار پاتی ہے۔ آپ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ بہت نفس کش اور عبادت گذار تھے کثرت ریاضت سے ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کے چہرہ پر غضب کی کشش تھی مخالف سے مخالف آدمی بھی ان کا گرویدہ ہو جایا کرتا تھا۔ بہت ملنسار مزاج، حلیق، خداترس، خوش دل اور نیک نفس انسان تھے۔ ہندی زبان کے بہترین شاعر تھے اکثر شعرائے ہندی نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ بابا جی ہندو مسلم تفریق نہیں کرتے تھے۔ بلکہ دونوں فرقوں سے یکساں محبت کرتے تھے۔ آپ کی شاعری مثل کبیر داس، تلسی داس کے ناصحانہ ہوا کرتی تھی۔ اورنگ زیب کو بابا جی کی دید کا اشتیاق ہوا بادشاہ نے بابا جی کے بلانے کو قاصد بھیجا تو قاصد بابا جی کا ایسا گرویدہ ہوا کہ دہلی نہ واپس گیا۔ اسی طرح بادشاہ کا جو بھی قاصد بلانے کو آتا وہ واپس نہ جاتا تو بادشاہ نے دو احدی بھیجے وہ دونوں احدی بھی بابا جی کی حیات میں مر گئے تو بابا جی نے ان دونوں کی قبریں پختہ اپنے مکان کے اندر بنوائیں جو ابتک موجود ہیں اکثر مسلمان ان قبروں پر فاتحہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔

بابا جی کا مکان اب تک موجود ہے۔ خاندان والے مرمت کرتے رہتے ہیں اور اسی میں قیام رکھتے ہیں۔ جب اورنگ زیب کا اصرار بہت بڑھا تو بابا جی دہلی گئے۔ وہاں بھرے دربار میں کچھ اشلوک اور دوہے پڑھے تو اہل دربار دنگ رہ گئے۔ بادشاہ نے کھی منگوایا اور دسترخوان بچھا کر انواع و اقسام کے شاہی کھانے چنوائے حکم ہوا کہ کھائیے۔ بابا جی نے ایک لقمہ اس کھانے پر ڈالی تو وہ سب کھانا راکھ ہو گیا بابا جی نے بادشاہ سے کہا کہ بابا راکھ اور خاک فقیروں کا حصہ ہے ایک روز کوئی درویش دہانہ چاہ پر چادر رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر بابا جی نے کہا کہ بابا خدا کی بندگی میں پردہ کیسا یہ کہہ کر وسط دہانہ چاہ پر دونوں زانو معلق بیٹھ گئے اور عبادت میں مصروف ہوئے بادشاہ اگرچہ کٹر مسلمان تھا لیکن بابا جی سے بہت خوش ہوا۔ خلعت فاخرہ اور موضع سرائے اکھنور جو کہ اب تحصیل اور ریلوے اسٹیشن ہے ضلع الہ آباد میں اور ضلع باندہ میں ایک سو باون روپیہ دس آنہ نقد سالانہ معافی (حا) کیا جو کہ لغایت مخصوص خاندان رہا۔ گورنمنٹ برطانیہ کے زمانہ میں موضع سرائے اکھنور یہ الگزاری تشخیص ہوئی اور جانشینان کی لاپرواہی سے بڑا حصہ اس کا بیع اور نیلام ہو گیا۔ ریاست پنا کی مہارانی نے بابا جی کے مکان سے ملحق ایک ٹھاکر دوارہ دھرم کا استھل بابا ملوک داس کے نام سے مشہور ہوا بنوا دیا۔ اسی استھل میں بابا جی کے گدی کا بھی مقام ہے۔ جس میں سدا برت تقسیم ہوا کرتی تھی اور آئندہ روند آکر اس میں قیام کرتے تھے ان کو اس سے کھانا ملا کرتا تھا۔ خاندان والوں کی بے توجہی اور لاپرواہی سے استھل کا زیادہ حصہ منہدم ہو چکا ہے

باباجی کے گدی کے جانشینان گیارہ ہوئے ہیں۔ اب کوئی شخص باضابطہ گدی نشین نہیں ہے اہل خاندان میں دو گروہ ہو گئے ہیں۔ دونوں گروہوں کے پاس باباجی کی حسب ذیل چیزیں موجود ہیں۔

(۱) کتاب قلمی، بزبان ہندی (جس میں اشلوک وغیرہ ہیں)، یہ کتاب باباجی ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

(۲) باباجی کی کھڑاؤں۔

(۳) باباجی کا ایک ہزار دانوں کا مالا۔

(۴) باباجی کا تکیہ

(۵) باباجی کی چادر۔

(۶) باباجی کی گدی (آسنی) ایک گز مربع

(۷) باباجی کی چھڑی۔

(۸) باباجی کی دو عدد لکڑیاں (جن پر فقرا بیٹھنے کے بعد ہاتھ رکھتے ہیں یہ چیز اب بھی اکثر خانقاہ کے پیروں کے پاس رہتی ہے۔

(۹) باباجی کے عہد جوانی کی قلمی تصویر

(۱۰) باباجی کے عہد ضعیفی کی قلمی تصویر

(۱۱) باباجی کے ایک چیلہ کی قلمی تصویر۔

(۱۲) تصاویر لیلےٰ و مجنوں (لیلےٰ و مجنوں کی تصاویر باباجی کے پاس صنعتی لحاظ سے تھیں نہ کہ عشقیہ طور پر) ایک بوتل میں لیلےٰ کا مجسمہ اور دوسری بوتل میں مجنوں کا مجسمہ ہے۔ صفت یہ ہے کہ بوتل کے اندر مجنوں کے مجسمہ کا رُخ

پیلے ہی کی جانب رہا کرتا ہے۔ اگر پیلے کے مجسمے والا بوتل اٹھا لیا جائے تو جس جانب وہ بوتل کیا جائے تو مجنوں کا مجسمہ اپنی بوتل میں اسی جانب گھوم جاتا ہے۔

(۱۳) تصاویر قلمی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلّم وحضرت علیؓ و حضرت امام حسنؓ وحضرت امام حسین علیہ السلام اگرچہ یہ سبھی فرضی ہیں لیکن باباجی کو ایسی چیزوں سے عقیدت اور دلچسپی نہ تھی ورنہ ایسی چیزوں سے ان کو کیا واسطہ تھا۔

اہل خاندان مندرجہ بالا چیزوں کو ہندو و مسلمانوں دونوں کو دکھلاتے ہیں۔ باباجی کو حضرت خواجہ کڑک ابدالؒ سے روحانی محبت تھی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں

خواجہ کڑک اک پیر رہتے، ہاتھ صراحی پیالہ دھرتے
مٹی برتن کرتے چھوٹا، گری صراحی پیالہ پھوٹا
بھئے کرودہ[1] پٹ[2] جہاں پگ مارا[3] تہاں بھیا ایک گرانالا[4]

(ترجمہ) خواجہ کڑک ایک پیر رہتے تھے وہ صراحی اور پیالہ ہاتھ میں لئے جا رہے تھے۔ مٹی کے برتن ہاتھ سے چھوٹ گئے صراحی اور پیالہ گر کر ٹوٹ گیا (خواجہ صاحب نے) غصہ ہو کر صراحی و پیالہ پہ پیر مارا۔ وہاں (زمین) پر ایک نالہ بن گیا۔

نوٹ :- کڑا میں یہ مقام جانب پچھم جہاں پر قصبہ کے بازار کی سڑک ختم ہوتی ہے اب تک موجود ہے۔ وہاں پر بہت گرا نالہ تھا۔ گورنمنٹ برطانیہ کے

---

[1] ہاتھ [2] تب [3] غصہ [4] پیر [5] نالہ

زمانہ میں اس نالہ پر ایک پختہ پل بنا دیا گیا ہے اور جو نشیب ہے اس پر پتھر کے ٹکڑوں سے کھرنجہ بنایا گیا ہے۔

باباجی کُڑا کے متعلق کہتے ہیں:۔

کُڑا خود مکہ کہلا دے گا آواز کھی از غیب
اپنے دیوانے کو دیدار میں دکھا دے گا
حکم ہے کندھیا کا تو پھر کے لبا دے گا

(ترجمہ کُڑا اُجڑنے کے بعد پھر سے بسے گا اور مکہ کا درجہ حاصل کرے گا یہ سب کچھ حکم خدا سے ہو گا۔

دو مٹھائیاں باباجی کی خاص ایجاد ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) چندیہ: خالص شکر کی چپاتیاں بنا کر اس پر تل جما دی جاتی ہے۔
(۲) گھور نار: یہ مائدہ کے مثل سیخ کباب کے بنا کر اور تل کر شکر کے قوام میں ڈالے جاتے ہیں۔ ذائقہ مثل بالوشاہی کے۔ یہ دونوں مٹھائیاں کُڑا میں خاص طور پر اب تک بنتی ہیں۔

باباجی کی سمادھی انہیں کے گھر میں بنائی گئی ہے جو اب تک اچھی حالت میں موجود ہے۔

قصبہ کے ہندو مسلم دونوں کی یہ کوشش ہے کہ اٹھل جو کہ منہدم ہو گیا ہے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ اٹھل کی تعمیر کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور صوبہ کی گورنمنٹ سے درخواست کی گئی کہ اس تاریخی عمارت کی تعمیر میں سرکاری مدد بھی ہونی چاہئے چنانچہ صوبہ کی سرکار نے ایک خطیر رقم منظور کر لی۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا نتیجہ

نکلا اور اب کیا ہو رہا ہے صرف اتنا معلوم ہے کہ باباجی کے خاندان کے دونوں گروہ کے کچھ افراد نے "نغمہ استھل بابا ملوک داس" کے نام سے رسید بکیں چھپوائی ہیں اور صوبہ جات یو۔ پی و بہار و مدھیہ پردیش کے اضلاع میں چندہ وصول کر کے خوب کھا رہے ہیں۔ صرف اتنا ضرور کیا ہے کہ باباجی سمادھی پر سیمنٹ لگوا دی ہے۔ باباجی کے استھل کی عمارت کے ہر چہار جانب جو خالی اراضی (استھل کے متعلق) تھی اس پر چند برہمنوں نے غاصبانہ قابض ہو کر مردعہ بنا لیا ہے۔ اور پٹواری سے سازش کر کے اپنے نام اندراج کرا کے لگان قائم کرا لیا ہے اور اس میں تمبا کو کی کاشت کرتے ہیں۔ اور استھل کے منہدم شدہ دیواروں کی اینٹیں فروخت کیں یا اپنے گھر اٹھا کر لے گئے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

(۱) دین دیال سو نبو حب سے نب سے جیا میں کچھو اور لسی ہے
(دین دیال = خدا، جیا = دل، کچھو = کچھ)

تیرو کہاں کے جاؤں کہاں تڑے بپت کی پڑے، کھینچ کسی ہے
(تیرو = تیرا، بپت = مصیبت، پڑے = پڑا)

اسے مُراری پیکا دکھوں تڑے سماں سلے ودچ دُسی ہے
(مُراری = خدا، سماں = چمک، دُسی = دیکھنا)

تڑد ہنسی نہیں مرنہ ہنسی ہے

تیرے اک بھروس ملوک سنے دوچ دُسی ہے
(بھروس = بھروسہ، دُسی = دیکھنا)

(۲) رام کہو رام کہو رام کہو باوڑے اوسر چوکے بھوندو پایو بھلے داؤں ہے

خدا کہو خدا کہو خدا کہو موقع

جن تو کو تن دینو تاکو نہ بھجن کیو۔ جنم سیا نوجات لوہا لپسے نا وڑے

تمکو بدن

کہت ملوک داس چھوڑ دے پرائی آس۔ بیٹھو ہرگن مگن ہوئے گاؤ رے

[illegible]

(۳) دیا دھرم نہیں تن ہیں مکھڑا کیا دیکھا درپن ہیں

رحم ایمان چہرہ آئینہ

کاگج کی اک ناؤ بنی ہے ڈال دیا جب ساگر ہیں

کاغذ کشتی دریا

دھرمی دھرمی پار اُتر گئے ڈوبے پاپی جل ہیں

دیندار گنہگار پانی

(۴) اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام

سانپ طائر

داس ملوکا کہہ گئے سب کو داتا رام

(۵) جہیں گھٹ دیا جہاں پر بھو آپ۔ ناہی نکٹ نہ آوے پاپ

رحم خدا گناہ

(۶) ملوکا کہتے بڑا ندہیں گرو کو کہتے اور۔ ہر دو جہتے تو ٹھور ہے گرو دیتے نہیں ٹھور

خدا

نثار

نام سید حامد علی تخلص نثار۔ آپ نقوی البخاری سادات قصبہ کے ایک ایسے فرد گذرے ہیں جن کی اولاد میں پرورش علی سخی۔ بیدار علی بیدار عارف حسین عارف ایسے نامی گرامی شعراء دنیائے شاعری میں چمکے۔ سخی اپنے عہد میں اگر بے مثال شاعر تھے تو بیدار علی بیدار نے اپنے وجود سے علم کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ عارف حسین عارف نے دور آخر میں پھر سے شاعری کو چار چاند لگا یا تھا۔ اور فن تاریخ گوئی میں اپنا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اگر آپ کے بعد آپ کے لڑکے، پوتوں اور پڑپوتوں پر نظر ڈالی جائے تو ہر شخص اچھا شاعر نظر آئے گا۔ بیدار علی بیدار۔ اسرار علی جواد۔ جوادالحسن نائل۔ حامد علی نثار۔ پرورش علی سخی۔ مقصود علی مقصود۔ سید سجاد علی[1] فیاض عارف حسین عارف۔ افتخار حسین افتخار۔ غرضیکہ آپ کا خاندان "این خانہ تمام آفتاب است" کے مصداق ہے۔ اگر کڑا میں خاندان مولویانہ کے ہم پلہ و مدمقابل کوئی دوسرا خاندان شعر و شاعری میں ہو سکتا ہے تو وہ یہی خاندان ہے

نثار نے کڑا میں ہی تعلیم پائی اور اپنے والد خدا بخش سے عربی و فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ خدا بخش ایک نیک شریف سنجیدہ بزرگ تھے جنہیں شعر و شاعری سے زیادہ مذہب اور تاریخ سے دلچسپی تھی۔ نثار نے اردو

---

[1] سجاد علی کا نام تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۲۶ پر غلط رقم ہے۔ ان کا نام سجاد حسین نہیں بلکہ سجاد علی تھا۔

اور فارسی دونوں زبانوں میں بے مثال اشعار لکھے مگر ان کی بیاض نہ نواب ان کے خاندان میں محفوظ ہے اور نہ ان کا کلام کسی اور جگہ دستیاب ہوتا ہے تاہم چند اشعار لوگوں سے سنے ہیں جو درج کئے جاتے ہیں۔

یہ موسم اور یہ کالی گھٹائیں
کہاں تک یار وہ ہم کو نہ آئیں

ایک شعر تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۳۴ پر ملا ہے۔ وہ درج کیا جاتا ہے۔

لے سر دامن کس نے کف پائے بگرفت
عالم افتادہ درین داد یہ بیکار ہنوز

خاندان کا مکمل شجرہ نسب تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۳۵۔۱۳۶ پر درج ہے۔

ندیم

سید محمد شکری نام ندیم تخلص تھا۔ مولوی شمس الدین اعظم الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا جو ناسخ کے شاگرد تھے۔ آپ کا شمار ارباب علم و فکر میں ہوتا تھا۔ ایک ذاتی کتب خانے کے مالک تھے جس میں عربی و فارسی کتب کا بڑا نایاب ذخیرہ تھا۔ زمانہ غدر میں ضلع بارہ بنکی میں تحصیلدار تھے۔ بعد غدر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنائے گئے اور نین گاؤں چک، بردی، ساٹری ڈیہہ اور گنگوہ سے ہوئے۔ سلسلہ نسب سید جلال الدین بخاری سے ملتا ہے۔ اکسٹرا

اسسٹنٹ کمشنری سے پنشن لینے کے بعد ہز ہائی نس نواب شاہجہاں بیگم کے عہد میں دس گیارہ برس تک نائب مدار المہام ریاست بھوپال رہے۔ نہایت فراخ دل۔ سیر چشم، کنبہ پرور اور عالی نواز شخصیت کے مالک۔ نمونہ[1] کلام یہ ہے۔

بوئے گل ہو کے چمن میں سب اغیار رہے
ہم رہے بھی تو مثال خلش خار رہے

ہم سے پوچھیں گے سوادِ عمل زشت کی وجہ
کھل کے کہہ دیں گے کہ زلفوں میں گرفتار رہے

شرم آتی ہے نکیرین سے کیا بتلائیں
کس کے مطلوب رہے کس کے طلبگار رہے

دم آخر بھی مہیا رہے سامانِ خوشی
میرے زخموں کو ہنسانے لیے تلوار رہے

پوچھ بیٹھے جو نہ آنے کے سبب ہم ان سے
بول اُٹھے کہ فقط شرم سے لاچار رہے

شورش عشق نہ کچھ حسن و جوانی تک ہے
ہم وہ ہیں حشر تلک جیسے رہے یار رہے

نہ وہ راضی ہوئے ہم سے نہ ہمیں موت آئی
ہم سے بیزار وہ ہم زیست سے بیزار رہے

سر کٹے جنبش ابرو سے ہزاروں لیکن
ایک ہم خنجر قاتل کے طلب گار رہے

خوب گذری کی ستایا نہ کسی نے ہم کو
اور ہم بھی نہ کسی کے پئے آزار رہے

اتفاقات سے وہ ہو گئے جانی دشمن
جو ہمیشہ مرے مونس مرے غمخوار رہے

اے ندیم آپ کے کیا زخم جگر ہم دھوتے
ہم تو اپنے ہی مصیبت میں گرفتار رہے

قطعۂ تہنیت بنائے تاج محل در بھوپال دالی بھوپال شاہجہاں بیگم کی عمارت

روانِ شوکت جہانِ شکوہ شاہ جہاں
سخن بمدح شریف تو باد مستعمل

---

[1] تذکرہ روز روشن "مطبوعہ ۱۲۹۷ھ مولفہ مولوی عبد الحامد محمد یوسف علی صاحب

کسیکه تا ابدت جاه خسروی بخشید — مر الملک اطاعت کشید روز ازل
تویی بجاه سلیمان بقدر اسکندر — بروزگار اعز و بمهر دلار اجمل
رذات پاک تو علم و هنر قیام گرفت — چنانکه هستی محلول از وجود علل
ز اهل شرک بعهد تو صد بکدن ست — بهای لات و منات و سرای نسر و هبل
امانت تو بود چون امانت داور — ثنای تست دل زنگ خورده صیقل
ستایش تو و مدح جمیل والاجاه — جدا جدا نظر آید به دیدهٔ احول
مقدسکه بود اعتبار یکتائی — مجدد یکه بود افتخار اهل هکل
فگندهٔ چه عجب طرح تازه ایوانی — بالفاق چنین مهر اوج علم و عمل
بکاخ ابیض کسری اگر دهم تشبیه — قصور وار بنا شمر نزد اهل دول
بنای شاه جهان ست تاج گنج بهند — بنای شاه جهان بیگم ست تاج محل
زهی بلند عمارت زهی مکان رفیع — نه مشتری ست مایی اوج منزلت نه زحل
دلیل عرفی شیرازیم که یک مصرعش — بوصف قصر تو اینجا نگاشتم به محل
زهی صفائی عمارت که در تماشایش — بدیده باز نگردد نگه ز تاج محل
شعاع نو مشعشع بود چو قبهٔ نور — تجلی متجلی رست صورت مشعل
ملمعهٔ شب قدر ست یا بجلوهٔ طور — و یا منارهٔ رخشنده از فلک منزل
هران حدیث که از بخت نارسا گوییم — ز عاطفت نگذاری درین محل مهمل
زچشمهٔ کرمت تشنه میرد م هیهات — کسان بکوثر شیرین من و ادام الخل
ز خوشدلی رقعی یافتیم و خورسندیم — بمهر عزار فان لم یصبه وابل فطل
بحضرتت سخنے مختصر ہمے سنجم — تراست دست طویل و مراست طول امل

مرا رسد کہ بجاں دولت دعا گویم ۔۔۔ کہ در شریف نوازی ست گوہر قوشل
نمای دوحۂ عمر حسود دولت نور ۔۔۔ ہمہ زگلشن تہمو پامال باد مستاصل
چو ایں مکان بلند آستاں عمارت یافت ۔۔۔ مادح رفعت تو شد بارِ تفاع حمل

ندیم مصرع تاریخ خواند برجستہ
زتاج بند سرائے جلیل تاج محل

نعیم

شیخ نعیم اللہ نام نعیم تخلص کرتے تھے۔ تفصیلی حالات کا کچھ پتہ نہیں چل سکا البتہ مختلف کتب تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کو شیخ بشیر علی بشیر سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ وحید کے استاد بھائی اور معاصر تھے۔ مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے۔ لکھنؤ اور الہ آباد کے مشاعروں میں جا کر غزلیں پڑھیں اور داد وصول کی۔ "پیام یار[1]" لکھنؤ سے آپ کے یہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

اس درجہ ہوا زار ترے ہجر میں جاناں ۔۔۔ بستر پہ جو ڈھونڈیں تن لاغر نہیں ملتا
تشبیہ قیامت سے ہے رفتار کی بے جا ۔۔۔ چالوں سے تری فتنۂ محشر نہیں ملتا
تنہائی کا مونس ہے شب ہجر کا ساتھی ۔۔۔ غم خوار کوئی دل کے برابر نہیں ملتا

فرہاد نہیں قیس نہیں کس سے کہیں حال
اے ثانیٔ لیلےٰ کوئی ہمسر نہیں ملتا

---

[1] "پیام یار" مئی ۱۸۸۶ء صفحہ ۲۰

نہالؔ

شیخ نہال احمد علوی، کمال احمد کمالؔ رئیس کے خلف الرشید تھے ولادت ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ تاریخی نام مظہر عالم ہے۔ عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ علم تصوف سے کافی شغف رکھتے تھے۔ نہایت ذہین، خدا ترس، ذی علم، فہیم، نکتہ سنج، نیک طینت، نیک سیرت، نیک دل، خوش گو، خوش مزاج، بذلہ سنج اور صاحب دقار تھے آپ پر چودھری مولوی قاسم یار قمرؔ کا اثر بہت گہرا تھا اور انہیں کی فیضان صحبت سے علوم دنیوی و دینی میں مہارت تام حاصل کر لی تھی۔ خلوت و جلوت میں ہمیشہ خوف الٰہی طاری رہتا۔ ایک اچھے انشا پرداز۔ صحافی۔ ادیب۔ نثر نگار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مقرر بھی اچھے تھے۔ کڑا کی اکثر مجالس میں سیرت نبوی ؐ پر آپ کی تقاریر اب بھی یاد کی جاتی ہیں۔ قرآن حکیم کے مطالب و معنی پر کافی عبور حاصل تھا۔ مولوی ضیاء الدین حسن رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے۔ اپنی تمام جائداد خدمت خلق میں صرف کی۔ متعدد تصانیف میں سے "ضیاء السلوک" صوفیاء کے نزدیک ایک معرکۃ الآرا کتاب تصور کی جاتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ اس دور میں کڑا میں نہال احمد کے پلے کا صاحب علم و فہم اور صاحب تالیف و تصنیف کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا تو غلط نہ ہوگا۔ آج بھی آپ کا نام دیار و امصار میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ افسوس بعد میں کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو آپ

کے نام کو روشن کرتا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۷۲ء کو یہ علم و فضل کا ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور کڑا کی سرزمین ایک بزرگ عالم شخصیت سے محروم ہوگئی۔ آپ کڑا سے ایک ماہنامہ "احسان" شائع کرتے تھے۔ اس میں بلادِ اسلامیہ اور خاص طور سے ترکی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے "الاحسان" کے لئے ایک رسالہ بعنوان "کمالاتِ امدادیہ" تصنیف کر دیا۔ جس میں مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے حالات و ارشادات لکھے گئے تھے یہ رسالہ دفتر "احسان" سے شائع ہوا۔ "الاحسان" میں تصوف، اخلاق، بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے حالات ہوتے تھے مولانا نے نہال مرحوم نے کئی قابلِ قدر تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں "مراۃ الحقیقت"، "اخلاقِ اسلامی"، "کمالاتِ کریمی"، "تذکرہ شاہ مولانا محمد حسین الہ آبادی" مشہور ہیں۔ آپ نے حضرت مولانا خواجگی کڑوی کی مشہور تصنیف "مراد مرید" کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا اور اس کو انوار احمدی پریس الہ آباد سے مع متن کے شائع کرایا تھا ایک منظوم کتاب بطرز مثنوی لکھی جس کا نام "روح افزائی الذکر غیر الوری" ہے۔ نہال نے حمد خدا میں چند اشعار کہے تھے ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔

خدایا کروں کیا تری حمد ذات — کہ چھوٹا ہے منہ اور بڑی ہے یہ بات
تفکر سے اس میں یہ حالت ہوئی — کہ جو کچھ سمجھ تھی وہ رخصت ہوئی
کہ پائے تصور یہاں لنگ ہے — فضائے تخیل بہت تنگ ہے

نہ مجھ کو نظر نے دکھایا تجھے
نہ ادراکِ عقلی نے پایا تجھے
نہ مرغِ خرد کچھ خبر لا سکا
نہ عنقائے وہم اک نشاں پا سکا

اقتباس از قصیدہ در بیان ولادت

ذرا سچ بتا دے تو ہی آسماں
تجھے یاد ہے یا نہیں وہ سماں
وہ تابش کہ روزِ قیامت خجل
فلک آتشیں مہر آتش فشاں
وہ صرصر کے جھونکے وہ بادِ سموم
وہ جھلسے ہوئے نخلِ باغِ جہاں
گلستانِ عالم تباہ و خراب
لپٹیں سوختہ ہر شجر نیم جاں
اداسی سی چھائی ہوئی ہر طرف
چمن میں نہ بلبل نہ گل کا نشاں

افق پر ہے ابرِ کرم کی گھٹا
صبا دوش پر لا رہی ہے رواں
ہوئی تیز بادِ صبا دم بدم
ہوا ابر باراں محیطِ جہاں
ترشح کا آغاز بھی ہو گیا
برسنے لگا ابرِ رحمت نشاں
لگاتار بارش کا ہے زور و شور
ہوئے دشت و صحرا سے دریا رواں

محمدؐ نبی اور محمد ولی
شہ اولیا، سید مرسلاں
کمال ان کی مسند جمال ان کا تاج
براق ان کا مرکب مکاں لامکاں

وہ محمد رسول احمدؐ پاک نام — وہ محبوب حق شافع عاصیاں

سخی و کریم و رؤف و رحیم

خلیق و حلیم اور شیریں زباں

ہ

حمیدہ خصال و جمیل الشیم — وہ غمخوار امت پناہِ جہاں

وہ سردار محشر وہ شاہ رسل — مقام ان کا محمود و جنت مکاں

غزل نعتیہ

تاب جمال جملہ جمیلاں جلال تو — ہر گوہر کمال زکان کمال تو

صد نور آفتاب نہ سنجد بہ ہمسری — اے نور حق بہ پرتو نور جلال تو

در جستجو تلاش، مثالت کجا کنم — در عالم وجود نیابم مثال تو

عمرم بجز امانت ولیکن بخواہش — از صبح تا بصبح دگر در خیال تو

ذکر جمیل یار دہد لطف وصل یار

غافل مشو ز ذکر تو بہ شود این نہان تو

در عالم مثال نداری مثال خویش

محبوب حق بخوبی و حسن و جمال خویش

ہر کاملے بہ پیش کمالت نہادہ سر

در ہر کمال فرد شدی از کمال خویش

آدمیت نیست جز این اے پسر
نور احمد در صفاتش جلوہ گر

سید اولاد آدم مصطفےٰ
بادشاہ جملہ عالم مصطفےٰ

ہر یکے از انبیاء، اولیا
بہرہ ور از فیض ہائے مصطفےٰ

پاک تر از جان پاکان ست او
خوب تر از روئے خوبان ست او

آپ کے انتقال پر ملال پر غریق نے تاریخ وفات یوں لکھی ہے۔

رضواں سے میں نے پوچھا ان کا مقام عالی
بولا بہت ادب سے "بلاغ ارم میں آ گے"

۱۳۵۵ھ

نصرؔ

ابونصر نام۔ نصرؔ تخلص کرتے تھے آپ شیخ اشرف حسن کے فرزند تھے مولوی امر اللہ کی زوجہ ثانیہ رحیمن کے بطن سے ایک لڑکی عبیدہ نامی ہوئی تھیں جن کی شادی شیخ اشرف حسن کے ساتھ ہوئی تھی، انھیں عبیدہ کے بطن سے چار لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ ابونصر، ابوسعید، ابوالبرکات، اور ابومحمد۔ ابونصر اور ابوسعید شاعر گذرے ہیں۔ ابونصر نے ابتدائی تعلیم فارسی، عربی وغیرہ کی گھر پر ہی حاصل کی، تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ

ریاست ریواں میں پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ جہاں کافی محنت اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ آپ کے فرزند محمد سعید عرف للّو الہٰ آباد رانی منڈی میں قیام پذیر تھے اور اب وہ انتقال کر گئے۔

نصر کو شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا محلہ لوہانی کی ادبی فضا ان کے لئے بہت راس آئی۔ شعر کہنے لگے اور اپنے خاندان کے بزرگ علامہ وحیدالدین وحید سے اصلاح لینے لگے۔ آپ کے پاس وحید کی اصلاح شدہ غزلیں موجود تھیں مگر اب دست درازیٔ زمانہ کے ہاتھوں ناپید ہو چکی ہیں۔ آپ کے فرزند اور نبیرگان کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

آپ حلیم شمیم بڑے قدر آور انسان تھے تقریباً ۹۵ سال کی عمر پاکر ۱۹۵۸ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی کوئی بیاض راقم السطور کو دستیاب نہیں ہو سکی۔ آپ کے فرزند کو کئی خطوط تحریر کئے گئے مگر جواب خموشی میں ملا بہر حال تحویلِ حافظہ کی مدد سے آپ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

جب ان سے سرِ شام ملاقات ہوئی ہے
اک کرب کے عالم میں بسر رات ہوئی ہے

اک اچٹتی نگاہ ڈال گئے
گر رہا تھا مجھے سنبھال گئے

وارث

خواجہ محمد وارث نام تخلص وارث قصبہ کے رئیس تھے شعر و شاعری کا ذوق

بچپن سے، آپ کا کلام زیادہ دستیاب نہیں ہو سکا صرف دو قطعات تاریخ دیوان سخی کے صفحہ ۱۰۰ سے نقل کئے جاتے ہیں۔

سنیئے اشعار پر ارمان سخی — ہے مضمون دل و جان سخی
غزلیں ایسی پسند احباب — وجد کرتے ہیں سخندان سخی
دیکھئے بول چال بھاکا میں — طوطی ہند ہے زبان سخی
ہوتے یوں ہیں خلف سعادتمند — کیا بجا لائے ہیں فرمان سخی
وارث رفتہ نے لکھی تاریخ — سنیئے تو چھپ گیا دیوان سخی

۱۳۰۸ھ

زور ستم سے بھی تھی آن سخی — ہے عیاں تصویر سے شان سخی
کہتے ہیں جس چیز کی خواہش ہوئی — غیب سے ہوتا تھا سامان سخی
شاعروں کا تذکرہ جب آگیا — یاد کرتے ہیں سخندان سخی
بیٹے نے چھپوا دیا ان کا کلام — ہو گئی تعمیل فرمان سخی
خاندانی واسطہ ہے کیوں نہ ہو — وارث رفتہ ثنا خوان سخی
فکر تاریخ طبع میں یہ لکھا — وہ لطافت کا ہے دیوان سخی

۱۳۰۸ھ

واصل

سید محمد واصل نام۔ واصل تخلص۔ آپ سید محمد قریہ رئیس کے فرزند

کاظمی المشہدی سادات سے تھے، ولادت بھی کرنا ہی میں ہوئی اور تربیت و پرورش بھی قصبۂ مذکور ہی میں پائی۔ سن شعور کے بعد کتب درسیہ فارسی ذی استعداد علماء و فضلا سے پڑھیں کچھ مدت وطن مالوف میں رہ کر بسلسلہ تلاش معاش ۱۲۹۲ھ میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ اس وقت مدرسہ انجنیری قائم ہو چکا تھا۔ آپ علم ریاضی کے ماہر اور مشاق تھے اور اس میں کافی عبور رکھتے تھے اس لئے فن انجنیری کا کمال حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ میں داخل ہوئے اور سرکار نظام سے ۲۰ روپے ماہوار وظیفہ پایا۔ تحصیل علم کے بعد صدر مدرس ہو گئے۔ ۱۳۰۷ھ میں اسی مشاہرہ پر مدرسی سے سرکار عالی کے محکمہ صفائی میں منتقل ہو گئے۔ یہ زمانہ میر محبوب علی خاں آصف جاہ نظام الملک ششم کا تھا۔ روشنی طبیعت و صفائی طینت سے شعر موزوں فرماتے تھے عید الضحیٰ میں قربانی کی کھالوں کو جمع کرنا۔ دیوبند کے دارالعلوم کے لئے حیدرآباد میں آپ ہی کی کوششوں کا ثمرہ تھا۔ قوم اور مذہب کا بڑا درد رکھتے تھے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ثانی القوم تھے۔ ۱۳۱۳ھ میں اس دار فانی سے بعالم باقی رحلت فرمائی۔ تاریخ رحلت " واصل حق داخل جنت ہے " مقبرہ بیرون دروازہ چادر گھاٹ ایک مسجد کے صحن میں موسیٰ ندی کے کنارے ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

کہیں سے شمع نے دیکھا اک پری کو ۔۔۔ کروٹ پکڑے ہوئے در پہ کھڑی ہے

قریب آکر کہا اے راحتِ جاں — یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
پلٹ کر یوں کہا اس دلربا نے — نگہ باہم گریبان سے لڑی ہے
چمن میں کس کی آمد اس گھڑی ہے — کہ خلقت پیشوائی کو کھڑی ہے
کہیں جا گوش بر آوازِ گل ہیں — کہیں نرگس بھی در تکتی کھڑی ہے

کہیں بلبل کی ہے نغمہ سرائی
کہیں قمری کی کوکو ہر گھڑی ہے

آپ کے چند شاگردوں میں سے محمد زماں خاں کا سراغ گلدستہ سخن بابت ماہ نومبر ۱۸۸۳ء صفحہ ۳۲ سے ملتا ہے۔

واصل

"یہ وہ تذکرہ ہے جو سخنوران میں نہ آنا چاہیئے مگر اپنے عزیز دوست یار عماد حمید الحسن کی ضد کو کیا کیا جائے جنھوں نے مجھے رسوا کیا۔" واصل

اکثر مجھے واصل صاحب کا یہ جملہ یاد آتا ہے کہ جو کچھ لکھنا ہو ابھی لکھ ڈالو، بعد میں زبان و بیان صیقل کیا کرنا، آج جبکہ سخنوران قصبہ کرڈا تقریباً مکمل ہو چلی ہے تو اس جملے کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ واصل صاحب نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھ کر اور مختلف ذرائع سے کرڈا کے سخنوران کا حال معلوم کر کے ایک کتاب مرتب کر ہی دی۔ ان کا خود تذکرہ وہ کیونکر لکھتے اس لئے یہ کام میں نے اپنے ذمہ لیا۔

محمد واصل نام اور واصل تخلص ہے۔ خاندان عثمانی کے چشم و چراغ ہیں اس لئے نام کے ساتھ عثمانی لکھتے ہیں، گھر کی عرفیت بھولے میاں ہے اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق آپ کے والد نے آپ کا تاریخی نام محبر حسنین عثمانی تجویز کیا، لیکن جب ذرا لکھنے پڑھنے کا شوق ہوا تو عادل رشید کی اتباع میں واصل رشید بن بیٹھے۔ رشید دراصل آپ کے گاؤں کے نام رشید مئی کا جز ہے۔ آپ کے والد کی بیاض سے پتہ چلتا ہے کہ اپریل سنہ ۱۹۳۳ء کا مہینہ وہ مبارک مہینہ ہے کہ جب آپ نے اس دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی۔

آپ کے والد علم کے دلدادہ تھے اور خود بھی درس و تدریس میں رہتے تھے۔ آپ کے والد کا انتقال سنہ ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ واصل صاحب نے سنہ ۱۹۴۴ء میں درجہ چہارم کا امتحان پاس کیا۔ آپ کے والد کی خواہش تھی کہ آپ کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے لیکن زندگی نے وفا نہ کی آپ کے بڑے بھائی محمد عاقل صاحب نے تہیہ کر لیا کہ باپ کی خواہش کو پایۂ تکمیل کو پہنچائیں گے۔ اس غرض سے اول تو انہیں الہ آباد اپنی ایک عزیزہ ابوالبرکات صاحب کی زوجہ اجمل کے پاس جنہیں یہ لوگ دادی کہا کرتے تھے بھیجا، لیکن واصل صاحب جو حد سے زیادہ وطن پرست تھے Home sick کے مرض میں مبتلا ہو گئے، اس باعث سلسلہ تعلیم منقطع کر کے آپ کو واپس رشید مئی جانا پڑا۔ اس کے چند ماہ بعد آپ کو آپ کی ہمشیرہ عزیزہ کے پاس کانپور بھیجا گیا۔ وہاں عرصہ چھ سات

ماہ قیام کیا اور حصول تعلیم میں کوشاں رہے مگر گھر کی یاد کا مرض پڑھنے میں سدِ راہ بنا رہا، آخر کار وہاں سے بھی واپس چلے آئے۔ اسی زمانے میں آپ کے بھائی محمد فاضل صاحب عثمانی الہ آباد میں ملازم ہوگئے اور آپ ان کے ساتھ رہنے لگے، بھائی کی موجودگی کی وجہ سے گھر کی یاد بھی ستانے کم ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، اور یہیں سے ۱۹۵۰ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ کلاس میں پاس کیا، اسی زمانہ میں محمد فاضل صاحب پاکستان روانہ ہو چکے تھے جس کی وجہ سے آپ کو فاضل صاحب کے دوست صدیق صاحب کے یہاں قیام کرنا پڑا۔ اس دوران میں آپ کے ماموں بشیر احمد صاحب عثمانی پانچ روپیہ ماہانہ دیا کرتے تھے ونیز آپ کے بڑے ماموں فیاض الحسن صاحب کے فرزند محمد باقر صاحب مبلغ دس روپیہ ماہانہ دیا کرتے تھے۔ اس زمانہ کشاکشی سے گذر کر واصل صاحب نے ۱۹۵۲ء میں انٹر کا مرس کا امتحان سیکنڈ کلاس پاس کرلیا اب یونیورسٹی کی تعلیم کا مسئلہ تھا آپ کے دونوں بھائی محمد فاضل صاحب و محمد عادل صاحب پاکستان چلے آئے تھے۔ اس موقع پر بھی محمد باقر صاحب عثمانی نے خلوص و محبت سے اپنے یہاں ٹھہرایا۔ آپ کے بھائی محمد عادل صاحب آپ کی برابر مالی امداد کرتے رہے اور قیام و طعام کا انتظام محمد باقر صاحب عثمانی کے یہاں رہا۔ الہ آباد کے اس دوران قیام آپ کو زندگی کے جن تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا وہ ناقابل بیان ہیں۔ اور اکثر خود واصل صاحب کو کہتے سنا کہ یہاں رہ کر مجھے فائدہ بھی

ہوا اور نقصان بھی فائدہ ہوا تو اس مجسمہ صدق و صفا، خلوص و مروت کے اخلاق و کردار سے جس کا نام نامی اسم گرامی محمد باقر عثمانی تھا۔ لا نقصانات وہاں کے قیام میں جو ہوئے اپنے ضمیر کی گھٹن، احساس کمتری اور چڑچڑے پن کا طبیعت میں اضافہ تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ نقصانات احسان کے بوجھ سے دب گئے ہیں لہذا ان کا تذکرہ ضروری نہیں۔[له]

اس جگہ اگر ان لکچرار کا جنھوں نے واصل صاحب کے بی۔ کام سے ایم۔ کام کے دوران دامے درمے سخنے جو امداد کی تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ احسان فراموشی ہوگی۔ ایم کام کی تعلیم کے دوران جے ایس ماتھر صاحب اور استھانا صاحب نے وہ سلوک کیا جو صرف رشتہ داروں ہی سے ممکن تھا۔ جے ایس ماتھر صاحب نے آپ کی ایم کام کی سال بھر کی فیس ادا کی، آپ اپنی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جن حضرات کے ممنون ہیں، ان کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۹۵۴ء میں بی کام اور سنہ ۱۹۵۶ء میں ایم کام کا امتحان پاس کیا۔

ہر ہندوستانی مسلمان کی طرح آپ نے بھی نہ صرف اپنا مستقبل ہی تاریک محسوس کیا بلکہ مسلمانوں کا ہندوستان

له نوٹ: علاوہ ازیں محمد باقر صاحب عثمانی کے یہاں قیام کے دوران جو نقصانات ہوئے ان کا اظہار نہیں کرتے بلکہ بار احسان کا تذکرہ رہتا ہے۔

میں قیام ایمان واگہی کی سلامتی کے منافی سمجھ کر ہجرت کی اور ۰ سہر جو ١٩٥٥ء کو سرزمین پاکستان پر قدم رکھا۔ واصل صاحب اپنا سفر پاکستان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں اپنے وطن عزیز رشید مئی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ رہا تھا تو وہ دن میرے لئے قیامت خیز دن تھا۔ میں اپنے وطن عزیز سے جدا ہو رہا تھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جسم بغیر روح کے رہ گیا ہے۔ میرے بچپن کے دوست اسمٰعیل، اسحاق، رمضان حسام اور رحمت مجھے دور تک چھوڑنے آئے۔ امیر غریب سب سے رخصت ہو کر میں اپنا باغ، اپنے کھیت کھلیان تالاب، گلیاں اور دوست احباب کو الوداع کہہ کر مصحفی لکھنوی کا یہ شعر پڑھتا ہوا اشک بار چل پڑا۔

جب اسیر دام ہو کر ہم چلے سوئے قفس
دور تک مڑ مڑ کر اپنا آشیاں دیکھا کئے

پاکستان آنے کے بعد بھی اس تشنۂ علم کی پیاس نہ بجھی۔ آپ نے معاشیات اور اردو میں کراچی یونیورسٹی سے سیکنڈ کلاس ایم۔ اے کیا اور اب وحید الہ آبادی پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

واصل صاحب کی شادی آپ کے ماموں زاد بھائی امیر احمد صاحب کی دختر نیک اختر عشرت جبیں سے ہوئی۔ آپ کو اپنی والدہ سے بے پناہ محبت ہے۔ افسوس کہ

۱۹۶۲ء میں آپ ان کے سایہ سے بھی محروم ہوگئے۔ ہر جمعہ آپ اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دیتے ہیں۔

حال ہی میں آپ نے اپنی والدہ کی یاد میں ایک کتاب "ماں" شائع کرائی جس کی علمی و ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی۔

شعر و شاعری کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا اور کیوں نہ ہو آغوش مادر ہی سے وحید الہ آبادی کے اشعار سنتے رہے اسی وقت سے آپ کو وحید الہ آبادی کے سینکڑوں شعر یاد ہوگئے تھے۔ طبیعت کی موزونیت نے آپ کو بھی شعر کہنے پر مجبور کیا۔ آپ نے سب سے پہلی غزل ۱۹۴۶ء میں کہی اور اپنے کالج کے استاد عابد علی صاحب عابد کو دکھائی انھوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد باقاعدہ اصلاح حضرت نوح ناروی جانشین داغ سے لینی شروع کی۔ حضرت نوح ناروی کی اصلاح نے حوصلے بلند کر دیئے۔ اس جگہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ شاعری کے لئے محرک کی ضرورت ہے اور جب تک کوئی محرک نہ ہو شاعری مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً عشق و عاشقی ہی وہ محرک ہے جو شاعر بنا دیتا ہے۔ واصل صاحب کی شاعری کا محرک بھی یہی کچھ ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ وہ کون تھا جس نے واصل صاحب کو شاعر بنا چھوڑا، لیکن میں نامۂ اعمال کے صفحات الٹنے کو تیار نہیں کیونکہ ؎

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں

مگر ایک واقعہ بیان کرنے سے بھی احتراز نہ کروں گا کہ ایک زمانہ وہ تھا

جب واصل صاحب چڑھا ہوا پائجامہ پہنتے تھے۔ سر منڈا ہوا تھا۔ اور ریش مبارک بھی سینہ تک بڑھی ہوئی تھی۔ رمضان کا زمانہ تھا مسواک کا استعمال بھی کثرت سے تھا مگر کسی کی کافر نگاہ یہ کہنے پر مجبور کر گئی ؎

حم اک نظر   دیکھ لو شوخی سے ادا سے
ایمان اگر جاتا ہے جانے دو بلا سے

یہی نہیں بلکہ ان بیتے ہوئے لمحات کی یاد بھی انھیں بے چین کئے رہتی ہے اور پھر کہہ اٹھتے ہیں ؎

ہاتھ آ کر ہاتھ سے جاتے رہے
دو حسین لمحے جو تڑپاتے رہے

شاعری کی ابتدا میں آپ بھی نئی تحریکوں سے متاثر رہے، اور کمیونسٹ تخیل کے زیر اثر کچھ اشعار زرداروں کے خلاف بھی کہے لیکن یہ دور مختصر تھا۔ آپ کے بھائی محمد فاضل کی توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف کمیونسٹ خیالات ہی سے توبہ کی بلکہ قاری حبیب احمد صاحب مدظلہٗ سے بیعت کر لی۔ قاری صاحب شاہ وصی اللہ علیہ حکیم الامت کے خلیفہ ہیں۔

شاعری میں بھی داخلیت کا عنصر اجاگر ہونا شروع ہوا۔ مرید ہونے کے بعد سے واصل صاحب کا عجیب حال ہے۔ ایک طرف تو بزرگانِ دین مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ وصی اللہ صاحب مرحوم، مولانا عبدالغفورؒ اور مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی سے متاثر ہیں، دوسری طرف مزامیر کی آواز اور راگ راگنی بہ سر وسے بغیر بھی نہیں رہ سکتے ان تمام چیزوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت آپ کا دل انتہا

حساس ہے جو صرف سوز و گداز ہی سے متاثر ہوتا ہے بلکہ راگ و رنگ سے بھی کما حقہٗ لطف اندوز ہوتا ہے۔ وطن سے چونکہ بے انتہا محبت تھی اس لئے وہاں کے پنگھٹ کا حال بھی نظم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ کہتے ہیں۔

پنگھٹ

شام کو نکلا تھا میں ٹہلنے
دیکھتا ہوں اک جبین رہا لے

لے لیا رستہ پنگھٹ پر کا
بھول چلی سب دُکھڑا گھر کا

چال تھی اس کی اٹھلائی سی
اس کی کمر کچھ بل کھائی سی

دو دو مل کر پانی بھرنا
رہ رہ کر انچل کا ڈھلکنا

اس کی کمر کا ہائے لچکنا
یاد پڑا اک بھولا سپنا

اس کی جوانی کی رنگینی
جیسے بھولی بسری کہانی

حسن کی پیکر تھی وہ رنگیلی
جان کی دشمن تھی البیلی

ہائے وہ کالے بال کی چوٹی
پیٹھ پر جیسے ناگن لوٹی

دیکھ رہی تھی جان رہی تھی
رہ رہ کر پہچان رہی تھی

دیکھ کر پنگھٹ پر کا جھمیلا
دل نے مچایا اک واویلا

چھین لیا دل ماہ جبیں نے
لوٹ لیا اس ماہ مبیں نے

پنگھٹ کی رنگین فضا تھی
کتنی شوخ وہ ماہ لقا تھی

ہر اک ناز و ادا کو دیکھا
اس کی شرم و حیا کو دیکھا

دل ہے کہ ظالم امڈا جائے
نینوں سے برکھا برسائے

دیکھا اس کی بھر گئی گگری — چوٹ لگی اک دل پہ گہری
جانے کو تیار ہوئی ہے — پنگھٹ سے منہ موڑ رہی ہے
ایک بہت بھاری سی گگری — ناز و ادا سے سر پہ رکھ لی
اس کی لچکتی جائے کمریا — دیکھ لے ظالم اک نجریا
چل دی وہ اپنی لے کے گگریا — دیکھتے رہ گئے اس کی ڈگریا
ہائے وہ کیا اب مجھ سے ملیگی — ہائے وہ کیا اب یاد کرے گی

یاد میں اس کی دل روتا ہے
کیا اس پہ بھی اثر ہوتا ہے

پاکستان آنے کے بعد نوح ناروی صاحب سے خط و کتابت رہی لیکن اس قدر دوری نے نوح صاحب سے ہی مجبوراً کہلوا دیا کہ میاں پاکستان ہی میں حفیظ صاحب کو دکھا لیا کرو۔ استاد کے حکم کی تعمیل میں آپ نے حفیظ صاحب جالندھری سے رجوع کیا مگر حفیظ صاحب عدیم الفرصت ہیں جس کی وجہ سے اصلاح میں تعطل رہا۔

۱۹۵۷ء میں آپ کو ایک ایسا رہنما ملا جو غالب دوراں، آتش زماں، فخر یگانہ فدائے مظہر جانِ جاناں اور رشید ائے فانی بدایونی ہے وہ استاد وقت بحر فصاحت و بلاغت امتیاز الشعراء آبروئے دہلی حضرت تابش دہلوی ہیں، ان کے لب و لہجہ کا تیکھا انداز چٹکیلا پن او

میر و فانی جیسا سوز و گداز واصل صاحب کی کشش کا سبب بنا۔ واصل صاحب کا مزید بیان ہے کہ ان کے شعر ہیں کہ ابروئے دوست غزل ہے کہ زلف گرہ گیر، مصرعے ہیں کہ شعور گ جاں انداز بیاں کی تیزی دریا کی روانی کو شرماتی ہے اور ندرت ادا لوگوں کے دلوں کو گرماتی ہے ہر لفظ بحر بندش مکمل خیالات کی بلندی چرخ چنبری سے مہ و انجم توڑتی ہے۔ مزاج میں داخلیت کا عنصر پہلے ہی سے جنم لے چکا تھا۔ اور استاد دہلی نے لکھنؤ کی خارجیت کو آپ کے مزاج سے بالکل ہی خارج کر دیا۔ علم و دانش کی تلاش آپ کو نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، حسرت، جوش ملیح آبادی ڈاکٹر اسلم فرخی۔ اے ڈی اظہر غرض سینکڑوں جگہ لئے پھری، ہر ایک نے آپ کو خلوص و محبت کی نظر سے دیکھا۔

ایک زمانے میں آپ کو فٹ بال کا بھی شوق رہا اور اس میں بھی آپ کی نظر فٹ بال کے بہترین کھلاڑی ہونا مکرر بہ جبی۔ ایک نوجوان بنگالی جو اخلاق اور خلوص سے ملے واصل صاحب کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا واصل صاحب کا گہرا دوست بن گیا وہ الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ واصل صاحب سے ہنوز خط و کتابت رہتی ہے۔

آپ کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن کچھ کا تذکرہ ضروری ہے۔ انجم الحسن نہ صرف دوست بلکہ پیر بھائی بھی ہیں، احمد دین، انوار احمد غنی الاکرم، سبز واری، رشید الدین، نسیم احمد اور غوث محی الدین، شمس مسعودی قابل ذکر ہیں۔

رشتہ داروں میں جن سے واصل صاحب زیادہ متعلق رہے وہ سید نفیل احمد نقوی، سید خادم حسین اور خود راقم الحروف اور والد بدرالحسن صاحب عثمانی ہیں

آپ کو نہ صرف پڑھنے لکھنے کا شوق ہے بلکہ کتابوں کے جمع کرنے کا بھی بے انتہا شوق ہے۔ آپ کی لائبریری میں کم وبیش ۴ ہزار کتابیں ورسائل ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو ہمیشہ سے ہی رہا لیکن پچھلے پانچ چھ برسوں میں تحریک تیز سے تیز تر ہو گئی۔ اب تک آپ نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں۔

۱۔ شجرہ عثمانی۔ کرار سید مئی ۱۹۶۴ء

۲۔ Accounting Problems ۱۹۶۶ء
For First Year. ۱۹۶۷ء

۳۔ " " " " For IInd Year

۴۔ سخنوران قصبہ کرلا ۱۹۶۸ء

۵۔ شبلی بلاد اسلامیہ میں زیر طبع

۶۔ شجرہ عثمانی پاک و ہند۔ زیر طبع۔

۷۔ Whos Who in Librarianship

۸۔ شبلی نقادوں کی نظر میں تالیف

۹۔ مشانہ مجاہت (مقدمہ) ۱۹۶۸ء

۱۱۔ مستقبل ادیبوں کی نظر میں۔ ۱۹۶۸ء (۱۲) ماں ۱۹۷۶ء
آپ کی غزلوں کا مجموعہ کا نی عینہ ہے اس کے علاوہ آپ نے نظمیں
بھی لکھی ہیں نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہے

تنویر کی دعوت پر

کیوں بلانے کی مجھے آپ نے زحمت کی ہے۔
میرے جذبات سے یہ کھیل تماشہ کیا
ایک ناکام محبت کو یہ دعوت کیسی
ایک بار زمانے کو بلا دا کیا

پیاس سے تکتی رہیں آس کی نازک کلیاں
آپ کے لطف وکرم کی کبھی بارش نہ ہوئی
آپ نے توڑ دیا عہد محبت لیکن
میرے جان وفا میں کبھی جنبش نہ ہوئی

آج کیا بات ہے کیوں آپ نے عزت بخشی
اپنی محفل میں بلا کر مجھے رسوا نہ کریں
آرزوؤں کی سسکتی ہوئی لاشوں کی قسم
آپ للّٰہ محبت کا اعادہ نہ کریں

کوئی شکوہ نہ شکایت نہ گلہ ہے مجھکو — شوق سے آپ کریں دعوت اغیار کریں
ہاں مگر ساتھ میں غیروں کے بلا کر مجھکو — اس طرح اب تو نہ رسوا سر بازار کریں

اب خوشی کے نہیں نغمات لبوں پر میرے
اور اب دل میں اُمنگوں کا نہیں جوش و خروش
یہی دل جس میں تھیں لاکھوں ہی امیدیں کل تک
آج مایوس ہے، برباد شکستہ، خاموش

بے کفن حزن میں لتھڑی ہوئی امید کی لاش
یاد آتی ہے تو اے دوست لرز جاتا ہوں
آپ کی بزم میں آنے کو تو آ سکتا ہوں
لیکن انجام محبت سے میں تھراتا ہوں

آج کیا بات ہے میں آپ کو یاد آیا ہوں
اپنی محفل میں مجھے آپ نے دعوت دی ہے
میں تو حیران ہوں اے جانِ جہاں جانِ حیات
حسن نے عشق سے ملنے کی جسارت کی ہے

نالۂ طائرِ قفس

آ گیا آموں میں بور — کوئلیں کرتی ہیں شور
پی کہاں کا شور ہے — کون تجھ پر زور ہے
میری خواہش ہے یہی — اور گذارش ہے یہی

چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

جھومتی ہیں ڈالیاں — ہنستی ہیں پھلواریاں

ہاں بہار آئی مگر بڑھ گیا دردِ جگر
رحم فرمائے گا کب دم نکل جائے گا جب
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

آ گئی بادِ بہار کر رہی ہے بے قرار
۳۔ اک دلِ برباد ہے اور چمن کی یاد ہے
اپنا پیارا گھونسلا مجھ کو یاد آنے لگا
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

کھیت میں کھلیان میں جاں اور پہچان میں
۴۔ ذکر ہوتا ہے مرا تجھ کو کہتے ہیں برا
دیکھ اب بھی جان جا مجھ کو تو پہچان جا
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

میں سراپا انتظار ہو رہا ہوں بے قرار
۵۔ یا مجھے تو چھوڑ دے یا تو بازو توڑ دے
تا کہ مٹ جائے امنگ آرزوؤں سے ہوں تنگ
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

دیکھ طوطوں کی قطار جا رہی ہے جوئبار
میں تن تنہا یہاں کرتا ہوں آہ و فغاں
۶۔ اب تو میرے حال پر کچھ تو آخر رحم کر
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

دیکھ آنسوؤں کا دھواں　　موڑ دے گا تیلیاں
قید و بند مٹ جائے گی　　تجھ کو بھی شرم آئے گی
۷۔ اس لئے اب جان جا　　بات میری مان جا
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

پھر نشیمن بس گئے　　سو رہے ہیں چہچہے،
دوستوں کی ٹولیاں　　کرتی ہیں رنگ رلیاں
۸۔ رقص میں طاؤس ہیں　　ایک ہم محبوس ہیں
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

کمسنوں کی ٹولیاں　　کرتی ہیں اٹکھیلیاں
چھا گئی کالی گھٹا　　آتی ہے ٹھنڈی ہوا
۹۔ جاگ اٹھی آرزو　　ہے چمن کی جستجو
چھوڑ دے صیاد اب تو چھوڑ دے

اک ہمارے ہی دل پہ ہے نہیں اثر تنہا،
چھٹ کے آپ بھی ہم سے روئے عمر بھر تنہا

جس طرف سے گزرے تھے ساتھ ساتھ وہ میرے
اب کبھی نہ ہو یارب اس طرف گذر تنہا

آج ان کی محفل سے اس طرح سے نکلے ہیں
آنکھ اداس دل ویران سب سے بے خبر تنہا

دیکھیے تو ہر اک سے سلسلے ہیں رشتے ہیں
سوچیے تو دنیا میں ہے ہر اک بشر تنہا
آج دیدۂ دل سے کیا سلوک ہو یا رب
ان کے سینکڑوں جلوے اور ادھر نظر تنہا
رہگذار ہستی کا دیکھ کر یہ سناٹا
سوچتا ہوں میں داخل آ گیا کدھر تنہا

مجھے اپنی زندگی میں غم ہجر دکھ نہیں ہے
ترا غم رہے سلامت کوئی اور غم نہیں ہے
لب غیر سے بھی نکلیں مرے واسطے دعائیں
مری بے کسی پہ لیکن تری آنکھ نم نہیں ہے

ملیں ترے غم میں وہ لذتیں مرے قلب کو مری جاں کہ
کبھی سمجھ میں نہ آ سکا یہ فراق ہے کہ وصال ہے

بہت رنگیں ہے دل کی داستاں بھی
پھر اس پر اپنا اندازِ بیاں بھی
بھروسہ اپنے پائے شوق پر رکھ
بھٹک جاتا ہے میر کارواں بھی

قفس والوں پہ کیا بیتی نہ جانے
نہیں آتی اب آوازِ فغاں بھی

بے خودی میں جہاں میں نے سر رکھ دیا
وہ کہیں آپ کا آستاں تو نہیں

کون کہتا ہے کہ ہم ان کے طلبگار نہیں — ہاں مگر یہ ہے کہ رسوا سرِ بازار نہیں

وجدی

ناصرالدین نام ۔ وجدی تخلص کرتے ہیں ۔ مولوی ضیا الدین احمد فخر پسر مولوی مسیح الدین احمد ولد مولوی فصیح اللہ فاضل کے فرزندِ ارجمند ہیں ۔ سلسلۂ نسب شیخ اسمٰعیل فاروقی سے ملتا ہے ، نہایت ذہین ۔ طباع ۔ خوشگوار خوش خلق نوجوان ہیں ۔ شریف خاندان کی جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں وہ آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں ، آپ ایک بے مثال شاعر کے فرزند ہی نہیں بلکہ ایک بڑے باپ کے بیٹے بھی ہیں یعنی ضیا الدین احمد جوشن جج کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے بڑی سنجیدہ اور متین شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے ۔ اعزہ و اقارب کا بڑا خیال کرتے تھے وجدی کا قیام حیدرآباد میں ہے ۔۔ آپ کے چار بھائی اور ہیں مگر

کسی کو بھی شعر و شاعری کا شوق نہیں ۔ آپ کا رجحان بچپن سے ہی اس طرف تھا اور جو کچھ بھی موزوں کرتے تھے اپنے والد صاحب کے سامنے برزمن اصلاح پیش کرتے تھے ۔ بڑے زود گو اور خوشگو شاعر ہیں کبھی کبھی اپنے مکان پر محفل شعر و سخن منعقد کرتے ہیں ۔ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے نادر خیالات ۔ اور چست بندشوں سے کام لے کر اردو ادب کو اپنے رشحات قلم سے مالامال کرتے ہیں ۔ نمونہ کلام یہ ہے ۔

تجلی کا طالب اگر ہم بار بار ہوگا — سحر ہوگئی ہے وہ بیدار ہوگا
پرستش کا جس دن نہ پندار ہوگا — تلاش شبیں میں در یار ہوگا
تغافل برتتے ہو اچھا برت لو — کسی دن تغافل بھی بیکار ہوگا
کہاں تیری محفل کہاں شکوۂ غم — وہاں تو نشہ یار ہی پیار ہوگا
میرے سر میں آئے ان یہ تاثیر ہوگی — جہاں بھی جھکے گا در یار ہوگا
مرا ضبط ہی سن چلا ہے فغاں اب — محبت کا شاید یہ شاہکار ہوگا

بلاتے ہو وجد میں اگر آ گئے وہ
نگاہیں اٹھانا بھی دشوار ہوگا

کتنی آخر تباہ ہے دنیا — ایک ادنیٰ سی آہ ہے دنیا
شوق دیدار تھا ازل میں گناہ — اور سزائے گناہ ہے دنیا
تیرے قدموں سے جو چھو گئی کبھی — یہ وہی خاک راہ ہے دنیا
ہاں کرم ساقی شراب ازل — تشنۂ لا الٰہ ہے دنیا

تو جہاں ہے وہیں جی پہنچے گی ۔ نالۂ بے پناہ ہے دنیا
تم نے کیا پھیر لی کرم کی نظر ۔ میری تیرہ و سیاہ ہے دنیا
ہائے فریاد اپنی اے وجدی
آپ ہی خود تباہ ہے دنیا

مجھے تیرے سوا آئے نظر کیا ۔ کوئی ہے دل میں تیرا جلوہ گر کیا
زمانے بھر کو بسمل کرنے والے ۔ میری جانب بھی اٹھیں گی نظر کیا
مجھے اپنا بنا کر بھول جانا ۔ بتا یہ ظلم اے بیداد گر کیا
مرا دل روٹھ جاتا ہے تجھی سے ۔ ہوا ہے ان کو منظور نظر کیا
شب غم اک بلا کی تیرگی ہے ۔ مٹا دے گی اسے میری سحر کیا
اسی کا نام شاید زندگی ہے ۔ بھڑکتا ہے مرے دل میں شرر کیا
میں اے وجدی سراپائے نظر ہوں
مجھے کہتے ہو ناکام نظر کیا

وہ مست ہے جھکا ہوا جام شراب پر
ہے آفتاب جلوہ فگن آفتاب پر

یا اذن دیجئے مجھے دیدار کا حضور کا
یا ناز کیجئے نہ رخ لاجواب پر
مرتا ہوں ان کی تجلی پہ کیا نثار
جاں تو نکل چکی تھی ادا سے حجا[illegible]

وحشی ہوں دور فکر عذاب و ثواب سے
کیا گفتگو کروں گا عذاب و ثواب پر

عشق کے قصوں کی خواب افزائیاں
حسن کو آنے لگیں انگڑائیاں

میں ہوئے شوق کے جھونکوں میں مست
مجھکو کیا پروائیاں پچھوائیاں

لی جو تونے نہ گر معبودِ عشق
میرے کس کام آئیں گی رعنائیاں

ہو مبارک ان کو شورِ بزمِ ناز
میری مونس ہیں مری تنہائیاں

یہ بھی بن جائیں نہ تمہیدِ ستم
دور ہی رکھیئے یہ کرم افزائیاں

یہ حسینانِ جہاں وحشی جو ہیں
ہوگی ان سے ہی بہشت آرائیاں

اب مجھکو دیکھئے ہمہ تن یادِ یار ہوں
یعنی جہانِ عشق کی اک یادگار ہوں

لے جا رہا ہے کھینچ کے اک جوشِ اضطراب
مجھکو نہ روکئے کہ میں بے اختیار ہوں

اک تیرا اضطراب ہے دونوں جگر کے پار
وہ بیقرار ادھر ہیں ادھر بیقرار ہوں

میں کیا ہوں ایک پیکرِ صد حسن و عشق
پھر کیوں نہ اپنے آپ پہ وحشی نثار ہوں

دم آخر مجھے نہ ترساؤ
پاس آتے ہوئے نہ گھبراؤ

کٹی جاتی ہے ستم سے دنیا
یوں نہ گردن جھکا کے شرماؤ

زندگی بن گئی ہے دل کی تڑپ
خوب تڑپاؤ خوب تڑپاؤ

جب مری بات ہی نہیں سنتے
اے تمناؤ جاؤ مر جاؤ

دلِ ناداں بڑا ہی ضدی ہے
یہ نہ مانے گا لاکھ سمجھاؤ
آج تک تو رلا چکے ہو مجھے
اب تو آؤ ذرا ہنسا جاؤ
اب تو مٹنے پہ ہم ہیں خود تیار
تمہیں آؤ ہمیں مٹا جاؤ
کیسے چپ چپ اداس بیٹھے ہو
کچھ تو اپنی زبان سے فرماؤ
بےبسی میں وہ قضا کے آئیں گے
اب تو وجدی ذرا نہ گھبراؤ

انہیں عادت سے کب مہلت مجھے خلوت سے کب فرصت
جو وہ مختارِ مطلق ہیں تو میں معمورِ تنہائی
چمک اٹھو اگر تم برق سیمائے محبت ہو
زمانہ کہہ اٹھے مجھ کو کلیمِ طورِ تنہائی
اسے مغموم کر آئی لب اطیش الٹ آئی
جب ان کی بزم میں پہنچی بھی تو لائے دورِ تنہائی
مرا غم خانہ اے وجدی ہے اک کاشانۂ عبرت
کہ بے آباد ہونے پر بھی ہے آبادِ تنہائی

کوئی بھی پیار میں ڈوبی ہوئی نظر نہ ملی
یہ وہ لطیف سی شے تھی جو پھر بہ ہر نہ ملی
وہ اک نگاہِ کرم وہ نگاہِ اول دوست
تمام زندگی ڈھونڈھا کئے مگر نہ ملی
ہم آج حشر کے میدان میں بھی پکار آئے
کہیں جناب وجدی مرحوم کی خبر نہ ملی

کہیں تو اب کیا کہیں دل کہاں ہے
یہ اک قصہ ہے یہ اک داستاں ہے

ادا کسی بھول سے چہرے پہ کیسی
شکایت کیا نصیب دشمناں ہے

نہ جانے ڈھائے کیا رندوں پہ آفت
سیہ بدلی بلائے آسماں ہے

تمنا سر بستہ موہوم امیدیں
اکیلے ہم نہیں اک کارواں ہے

ابھی ہے غیر ممکن ترک الفت
جواں ہے دل طبیعت بھی جواں ہے

کبھی جس پر نشیمن تھا ہمارا
وہ شاخ گل چمن میں اب کہاں ہے

مسلماں ایک دن وحدی بنے تھے
اسی سے اب وہ کافر بدگماں ہے

یہ مختصر سی کیفیت کوئے یار ہے
ہر ذرہ اس زمین کا دل بے قرار ہے

غبار آرزو کہ ادب کا ہے یہ مقام
دل کو نہ دل سمجھ یہ حرم کا دیار ہے

پھرتا ہوا میں حقیقت عریاں بنا ہوا
گویا مرا وجود مری تار تار ہے

اک دن وہ تھے کہ مجھکو تمہارا تھا انتظار
اک دن یہ ہیں کہ تم کو مرا انتظار ہے

ان کی وفا پہ کوئی بھروسہ کرے گا کیا
جنکی جفا کا بھی تو نہیں اعتبار ہے

بے اختیاریوں میں ہے مضمر کشود کار
بے اختیاریوں پہ کسے اختیار ہے

وحدی جو دیکھتا ہوں وہی ہے جمال دوست
اور جو بھی سن رہا ہوں وہی ذکر یار ہے

وحید

دنیائے شعر و ادب میں بے شمار نغمے گونجے مگر کچھ مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو گئے اور کچھ ہمیشہ نئے رسیلے تر و تازہ اور انوکھے رہے، جب کبھی کسی نے ان نغمات کو چھیڑا سوز و کیف کی ملی جلی لے کانوں میں گونج اٹھی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ تازہ نغمہ ابھی ابھی چھیڑا گیا ہے، اسی طرح جب کبھی یہ شعر نظر سے گذرا ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

تو ایسا محسوس ہوا کہ شعر اسی چاشنی، کیفیت اور نشتریت کا حامل ہے جس سے دیدہ و دل کو ایک گونا گوں سکون حاصل ہوتا ہے، بیشتر حضرات کو اس کا علم نہیں کہ یہ شعر اکبر الہ آبادی کے کامل الفن استاد حضرت وحید الدین محمد وحید الہ آبادی کا ہے، اس معمار ادب نے انیسویں صدی کے اواخر میں اپنی شاعری کا سکہ جمایا تھا۔ الہ آباد، پٹنہ کی گلیوں میں بچے بچے کی زبان پر ان کے اشعار ہوتے تھے، اگر کوئی "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" پڑھتا تو کوئی "محبت بھی ہوا کرتی ہے، دل بھی دل سے ملتا ہے" الاپتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ اور امیر جیسے استاد فن بھی مشق شاعری کر رہے تھے، داغ دہلی، امیر لکھنؤ اور وحید الہ آباد میں اردو ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف تھے مگر شومیٔ قسمت سے وحید کی عمر نے وفا نہ کی تو

وحید کا دیوان ہی آج تک منظر عام پر آسکا یہی وجہ ہے کہ اتنا بڑا شاعر گمنامی کے غار میں دفن ہو کر رہ گیا

حضرت وحید کی موت کا حادثہ اردو ادب کا ایک ناقابل فراموش المیہ ہے ۔ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۹۲ء کو جب کہ مولانا وحید روزے سے تھے اور دوپہر کے وقت مکان میں آرام فرما رہے تھے کہ یکبارگی شور و غل ہوا کہ آگ لگ گئی ۔ حضرت وحید اپنا دیوان نکالنے کو کوٹھری میں گئے اور دھوئیں اور آگ کی وجہ سے ان کو راستہ واپسی کا نہ مل سکا اور دو دن قبل رمضان کے بیٹھ گئے ۔ آخری اوقات میں انہوں نے ایک وصیت نامہ دیوان کی دفتی پر تحریر فرمایا کہ اسے کسی اچھے شاعر کو دکھا کر شائع کیا جائے ۔ مگر آج تک وہ دیوان نہ چھپ سکا ۔

وصیت نامے کی نقل یہ ہے

"ہر کام کا بھروسہ خدا کی ذات پر ہے "

وصیت نامہ

بعد السلام علیکم کے ظاہر ہو کہ اس دیوان پر نظر ثانی نہیں ہوئی ۔ اور غلطی کثرت سے ہیں جو صاحب اس کے چھپوانے یا شہرت دینے کا قصد کریں لازم ہے کہ کسی اچھے شاعر کو دکھا لیں اس میں کچھ مضائقہ نہ کریں ۔

متاع نیک ہر دو کاں کہ باشد

آئندہ اختیار مردہ بدست زندہ

وحید الدین محمد عفی اللہ عنہ بقلم خود رقم نمود

حضرت وحید الدین الہ آبادی نے اپنا نام خود اپنے قلم سے وصیت نامہ میں جو انہوں نے اپنے وصال کے وقت تحریر فرمایا تھا) وحید الدین محمد وحید لکھا ہے ۔ یہ مولوی امیر الدین عرف مولوی امیر اللہ میاں متخلص بہ شاغل کے منجھلے فرزند ارجمند تھے ، شاغل کا سلسلۂ نسب شاہ اسمٰعیل فاروقی سے ملتا ہے جو مرزا ہمایوں بادشاہ کڑہ تشریف لاکر مقیم ہوئے ، ان کا تفصیل تذکرہ تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۱۲۱ پر ہے ۔ مولوی وحید الدین کا سلسلۂ نسب تاریخ عثمانی کڑا رشیدی میں بھی پایا جاتا ہے ۔ وحید الدین محمد وحید محلہ مولویانہ میں پیدا ہوئے ۔ خاندان مولویانہ اپنے علم و فضل و طہارت نسبی کی وجہ سے کڑا ہی میں ممتاز نہیں رہا بلکہ قرب و جوار میں بھی مشہور تھا ۔ زین العابدین مولانا وحید کے حقیقی بھائی بڑے بزرگ ، صوفی اور تہجد گذار انسان تھے مولوی رفیع الدین جو مولانا وحید کے چچا زاد بھائی تھے لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور اپنی سخاوت داد و دہش کی بنا پر مشہور تھے ۔ وحید نے جب آنکھ کھولی تو اپنے والد محترم کو شاعر پایا جو شاغل تخلص کرتے تھے اور مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے ، اپنے چچا فصیح اللہ قائل کو بھی ایک اچھا شاعر پایا ، اس ادبی و علمی فضا نے انہیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا ۔ شروع میں عربی فارسی میں مہارت تامہ حاصل ہو گئی جو آئندہ ان کو شعر و شاعری میں بہت مفید ثابت ہوئی ۔ شعر گوئی کے شوق نے انہیں بہت کچھ پڑھنے کا بھی موقع دیا ۔ عالم عنفوان شباب میں ہی وہ عبدالقادر رنگی سے مرید ہو گئے ۔ ان کے مرشد نے ایک دن فرمایا کہ تم نے الشعراء کی سورہ بھی قرآن میں دیکھی ہے ۔ اچھے

پیر کے اس اشارہ پر انہوں نے اس وقت تک کا کہا ہوا سارا کلام دریائے گنگا میں غرق کر دیا اور بالکل خاموش رہنے لگے مگر موزوں طبیعت کب رکتی ہے۔ ایک دن کوئی شعر گنگنا رہے تھے کہ ان کے پیر طریقت تشریف لے آئے اور اصرار کیا کہ وہی پڑھو جو ابھی پڑھ رہے تھے انہوں نے شعر پڑھ دیا۔

کوئین کا دل جس پہ نہ نادیدہ فدا ہو
بے پردہ وہ حسن اسلامی نظر آ جائے تو کیا ہو

پیر نے دریافت کیا یہ کس کا شعر ہے، مولانا وحید آداب بجا لائے اور فرمایا کہ فدوی کا ہے۔ اس پر ان کے مرشد نے گلے لگا لیا اور کہا کہ تم شعر کہا کرو۔ وحید میاں نے پھر شعر کہنے شروع کر دئے جیسا نان طبیعت میں ایسی روانی آئی کہ سخت سے سخت زمینوں میں دو غزلہ اور سہ غزلہ کہہ ڈالیے

مولانا وحید الدین کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ شہید ہوئے تو ان کی عمر تریسٹھ سال کی تھی اور ان کا سال انتقال ۱۸۹۴ء ہے اس طرح سے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۳۱ء قرار پاتی ہے

اس زمانے میں ایک بزرگ مولوی بشیر علی بشیر جن کا تعلق خاندان علوی سے تھا اور جو اس وقت کے بہت پڑھے لکھے آدمی مانے جاتے تھے ان سے وحید نے ابتدا میں کچھ اصلاح لی۔ سید علی اثیر کا تذکرہ صدرالدین ح نے بھی اپنی کتاب سخن شعرا میں کیا ہے۔ بشیر صاحب دیوان شاعر تھے مگر اب ان کے دیوان کی کوئی نقل نہیں ملتی۔ البتہ دو چار شعر یاد ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں

کہہ رہی ہے موت ہر دم ہر گھڑی بالائے سر
غافلو آتا ہے وقتِ ناگہاں بالا ئے سر

اے رہروِ مسالکِ محمد — افسوس یہ حسرت و دعا ہے
تربت پہ بشیر کے جو گذرے — تکبیر کی اس سے التجا ہے

ایک شعر میں خود وحید اپنے استاد کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

اب ہم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو
فیض بشیر سے یاں کیجئے تو کیا نہیں ہے

وحید کے نام کے متعلق بھی بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے یہاں تک کہ رام بابو سکسینہ نے غلام حسین وحید لکھا ہے۔ جو سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ شان الحق حقی نے میر وحید لکھکر تحقیق کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ نہ وہ میر تھے نہ غلام حسین بلکہ وہ تھے مولوی وحید الدین محمد وحید فاروقی وہاں تو تذکرہ ہو رہا تھا وحید کے سلسلۂ تلمذ کا۔ بشیر علی بشیر کو آتش لکھنوی سے تلمذ اور وحید الہ آبادی کو اوّل اوّل تو بشیر سے ہی تلمذ حاصل تھا۔ لیکن بعدہ انہوں نے آتش لکھنوی سے بھی چند غزلوں پر اصلاح لی تھی جس کا ثبوت اکبر داناپوری کے "تجلیات عشق" سے ملتا ہے اس طرح سے وحید کا تعلق مصحفی مکتبۂ خیال سے تھا۔ مولانا عبدالحئی نے اپنی مشہور تصنیف "گل رعنا" میں تحریر فرمایا ہے کہ انہوں نے مصحفی کا زمانہ پایا ہے حالانکہ

مصحفی کا انتقال سنہ ۱۲۴۰ھ میں ہوا جب وحید کی پیدائش ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ان کا یہ تحریر کرنا محل نظر ہے یا کتابت کی غلطی ہے کیونکہ متن میں خود ان ہی کا قول ہے کہ جب میں تحصیل علم کیلئے الہ آباد گیا تو وہاں پہنچ کر دیکھا کہ وحید میاں کی شاعری کا غلغلہ بلند ہے یوں تو منشی غلام غوث بیخبر۔ مولوی غلام امام شہید۔ محمد جان حسرت، حکیم خلیل الدین خلش وغیرہ سبھی اپنے اپنے رنگ میں خوشگو سمجھے جاتے تھے مگر وحید میاں کا نام بہت وقار اور عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ان سے سہو سا ہی ہے اور وحید میاں کو مصحفی کا ہم عصر کہنا درست نہیں ہے ... ، اپنے زمانے میں تمام دیار و امصار میں میاں وحید الدین کا ایسا غلغلہ اور شہرہ بلند تھا کہ اس وقت کے اکثر شعراء نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان میں سے اکبر الہ آبادی، بے نظیر شاہ، اکبر دانا پوری، ناقب عظیم آبادی۔ شاہ مبارک حسین، مبارک عظیم آبادی عزیز الدین حیدر، افسر الہ آبادی۔ سردار علی وصفی لکھنوی اور بابو دیوکی نندن لال نیر۔ قابل ذکر ہیں۔

اکبر دانا پوری نے اپنی ایک رباعی مطبوعہ "جذبات عشق" میں یوں تحریر فرمایا ہے

شاگرد وحید کے ہیں دونوں اکبر
ہم مشق بھی ہم دونوں رہے ہیں اکثر
لیکن قسمت کا تماشا ان پر یہی ہوا
پتھر پتھر ہے اور جوہر جوہر

ایک غزل کے مقطع میں بھی اکبر داناپوری نے استاد کی مدح اس طرح کی ہے۔

شاعر ہے داغ اور ہے استادِ فن امیر
اکبر وحید قبلۂ اہلِ کمال ہے

بے نظیر شاہ نے یوں اعتراف کیا ہے۔

انہیں کا ہے یہ فیض اے ذوالمنن | دیا تونے ایسا جو استادِ فن
لقب جس نے رحمت سے پایا وحید | نہ پھر کیوں ہو عالم میں یکتا وحید
نثار محمد وہ قطب زمن | وحید یگانہ خدائے سخن

باقر عظیم آبادی اپنی کتاب "سرمایہ عشق" کے صفحہ ۵۶ - ۵۷ پر یوں رقم طراز ہیں۔

جو شہر دہر میں مشہور ہے الٰہ آباد
قریب اس کے کڑا ہے یہ مقام وحید
میں شاعری میں ہوں شاگرد انہیں کا اے باقر
مجھے بھی فخر ہے اس کا کہ ہوں غلام وحید

امداد امام اثر نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف کاشف الحقائق میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ ان کا (وحید یاں) دیکھنا کار ثواب اور باعث خیر و برکت ہے" لہٰذا کیف ۔

مولانا وحید کی شہرت الہ آباد سے عظیم آباد تک پہنچی اور بعض کے مشتر حضرات آپ کی دید اور کلام کے مشتاق ہوئے مولانا وحید پٹنہ تشریف لے گئے وہاں آپ کی بڑی خاطر و مدارات ہوئیں، بیشتر شعرا آپ کے شاگرد

ہوئے۔ اکبر دانا پوری۔ باقر عظیم آبادی، شاہ مبارک حسین مبارک، شاہ لال انور، آصف حسین آصف، نجم الدین نجم آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے

پٹنہ کی گلی گلی میں مولانا وحید کے اشعار پڑھے جاتے تھے عالم نے کہا ہر شخص کی زبان پر مولانا وحید کے اشعار رہنے لگے۔ بڑے بڑے معرکے عظیم آباد میں ہوتے اور وحید اوران کا گروہ سرخرو ہوتا۔ ۱۲۹۹ھ میں داغ دہلوی عظیم آباد تشریف لے گئے۔ اور مولانا وحید کے شاگرد باقر عظیم آبادی کے یہاں مسکن گزیں ہوئے۔ کیونکہ باقر عظیم آبادی کے بھائی احد داغ سے بہت مراسم تھے۔

باقر عظیم آبادی نے ایک دن دوران گفتگو اپنے استاد وحید کا یہ شعر داغ کو سنایا۔

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر دوش کے بیٹھے ہیں
جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

داغ نے بہت تعریف کی اور بڑی دیر تک یہی شعر پڑھتے رہے لوگوں نے استاد کو محظوظ ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ طے کر لیا کہ داغ کی آمد کے اعزاز میں جو مشاعرہ ہو رہا ہے اس کا مصرع طرح یہی ہو۔ داغ نے بھی اس طرح میں غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے۔

مجنوں تنق ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو دہ یوں بن تے بیٹھے ہیں

مولانا وحید شروع جوانی میں بڑے رنگین مزاج اور شوق وچلبلی طبیعت کے مالک تھے۔ لکھنؤ بھی آپ کا جانا اکثر ہوتا تھا۔ ایک شعر میں یوں فرماتے ہیں

بتان لکھنؤ میں کیا وحید اسرار دیکھا ہے۔
یہ کیوں جاتے نہیں سوئے الہ آباد کیا باعث

اسی لکھنؤ کا واقعہ ہے ایک بار مولانا چوک سے گزر رہے تھے کہ ایک پری پیکر بارجہ میں بیٹھی ہوئی خربوزوں کی پھانکیں اتار رہی تھی۔ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا اور کہا۔

مصروف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے
رکھ لیجئے گا دل بھی ہمارا تراش کے

یہ سن کر ماہ وش نے مولانا کو دیکھا اور آدمی بھیج کر بلا بھیجا۔ مولانا تشریف لے گئے۔ اس نے بڑی خاطر کی اور اپنے گانے کیلئے مولانا سے کئی غزلیں لکھوا لیں۔ مولانا وحید کا ایک اور واقعہ بہت مشہور ہے۔ ایک بار آپ لکھنؤ تشریف لے گئے اور واپس آنے کی جلدی تھی۔ وہاں کے معتقدین اور احباب نے زور دیا کہ ایک مشاعرہ میں شرکت فرما کر جائیں۔ مولانا نے پہلے تو معذرت چاہی مگر احباب کے اصرار پر وہ راضی ہو گئے مگر اس شرط پر کہ ان کا کلام پہلے ہی سن لیا جائے، بیگم صاحبہ جن کے یہاں مشاعرہ تھا فرمانے لگیں کہ مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔ بہرکیف مصرع دیتی ہوں۔

اس پر ضیم کریں میں کلام کا اندازہ کروں گی ۔

دور سے آئے ہیں مشتاق تماشہ ہو کر

مولانا نے برجستہ جواب دیا

ہم سے پردہ نہ کرو شاہد رعنا ہو کر

بیگم صاحبہ نے یہ سنتے ہوئے بے محابا پردہ الٹ دیا ۔ مولانا سے معافی کی خواستگار ہوئیں اور کلام کی مشتاق ۔

الہ آباد میں شاگردان ناسخ کو شاگرد آتش مولانا وحید کا یہ عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا اور مولانا وحید پر لاطائل و بے بنیاد اعتراضات کرتے محلہ دریاآباد کے ایک مشاعرہ میں مولانا نے ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا ۔۔

تم زرگل کا پہن کر آج توڑا پاؤں میں

بلبل شیدا کو دکھلاؤ تماشہ پاؤں میں

اس پر اعتراضات کی بوچھاریں شروع ہوئیں "بلبل شیدا" کو پاؤں میں تماشہ دکھلانے پر لوگوں کو سخت استعجاب تھا ۔ مولانا نے اس کا جواب دیا ہی تھا کہ اتنے میں اکبر الہ آبادی اٹھ کھڑے ہوئے اور بیساختہ پڑھ دیا ۔

استادیٔ وحید میں جس کو کلام ہو

تیار اس سے بحث کو اکبر ہے آج کل

اسی پر محفل درہم برہم ہو گئی ۔ اور مولانا وحید اور ان کے گروہ نے

ایسی نافہم مجلس میں بیٹھنا گوارہ نہ کیا اور واپس چلے گئے۔ اکبر الہ آبادی نے تمام عمر اپنے استاد کا بہت احترام کیا۔ جب کبھی مولانا کڑے سے تشریف لاتے اکبر ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔ کوٹھیوں کی سیر کرتے، مشاعروں میں شرکت فرماتے اور اچھی اچھی غزلیں کہتے اور استاد سے اصلاح لیتے۔ حضرت وحید الہ آبادی پر راقم الحروف اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کر رہا ہے جس میں تفصیلی تذکرہ بعد میں آئے گا۔ "ازیں مشتے از خروارے" کے مصداق حضرت وحید کے چند اشعار بطور نمونہ دے کر خموشی اختیار کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں... علی حسنین زیبا نے ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ ان کے دیوان کا انتخاب مرتب کیا تھا۔ جو انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوا تھا۔ آج کل نایاب ہے تاہم چند کتب خانوں میں اس کے چند نسخے اب بھی محفوظ ہیں ان میں انجمن ترقی اردو کراچی اور کراچی یونیورسٹی شامل ہیں۔

پھر ساقی میں وحید آیا جو ذکرِ مے کشی
میں نے اشکوں سے لبالب جام صہبا کر دیا

بہار گل میں پر کترے تو اس کی کیا شکایت ہے
خزاں میں کون سی خاطر مری صیاد کرتا تھا

جب قدم ان کے گھر میں رکھا تھا
کیا کہوں کیا نظر میں رکھا تھا

اس کی مژگاں کو دیکھتا تھا فقط   زخم تو خود جگر میں لگا تھا

ابھی نام خدا جوبن دکھانا بھی نہیں آتا
اکڑ کر پاؤں رکھنا سر اٹھانا بھی نہیں آتا

نہ تھے جب اس قدر بیخود تو کیا کچھ کہتے سنتے تھے
اب اشک آنکھوں میں بھر لانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا

ذرا سے رنج پر تم کوئے جاناں سے چلے تھے
وحید ان سے قیامت تک جدا تم کو نہ ہونا تھا

دم آنکھوں میں ہے ہر دیار کب سے   وہ دم بھر جو حسرت دکھاتے تو لگتا
جو تھی حالت نزع شکام رخصت   وہ دم بھر ٹھہرتے نہ جاتے تو لگتا

کب سے اٹکا ہوا دم حسرت دیدار میں تھا
دیکھئے جب مری آساں ہوئی مشکل تو گیا
اب شہادت نہ ہو قسمت میں تو کیا غم ہے وحید
ہمہ تن شوق میں تا کوچہ قاتل تو گیا

اچھا ہوا آنکھیں جو ہوئیں بند دم نزع
اس وقت تو پالیں سے نہ جاتے تجھے دیکھا

جنازے پر مرے شاید وہ آجائیں تو کہہ دینا
لبوں پر جان تھی جس وقت تم کو یاد کرتا تھا
محبت اس کو کہتے ہیں جو تاریخ سفر دیکھی
انہیں آئیں تھیں جس دم ہچکیاں میں یاد کرتا تھا

کچھ کہہ کے اس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا
وہ شب کو بے حجاب جو محفل میں آ گئے
کیا نور تھا کہ شمع کو پروانہ کر دیا
اس دل کی ہے بہار و خزاں انکے ہاتھ میں
گلشن بنا دیا کبھی ویرانہ کر دیا
یہ نہ پوچھو مجھے الفت نے دکھایا کیا کیا
کچھ جواب اس کا نہیں آنکھوں میں آنسو کے سوا

اے دل تجھے دنیا ہے تو جی کھول کے رولے
دنیا سے نہ بڑھ کر کوئی ویرانہ ملے گا۔

مجبور ہیں گے دھیان اشکوں سے ہم ہجر میں دگر
خالی جو تہیں مے کا پیمانہ ملے گا

باغ میں غنچہ ابھی تھا خندہ زن کیا ہو گیا
بوئے گل کیا ہو گئی رنگ چمن کیا ہو گیا
لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہو گا
جلوۂ شمع شبستان چمن کیا ہو گا

کس کیلئے ہے خواب ہو کیوں جاگ رہے ہو
دشتہ تو کہو دیدہ بیدار تم اپنا

اٹھا لیجا ہیں گلشن سے کدھر ہم آشیاں اپنا
ہوا ہے عین فصل گل میں دشمن باغباں اپنا
پلک کو دے کے جنبش پھر گئی ہے جو آنکھ ان کی
ہوا پر اڑ گئی کشتی اٹھا کر بادباں اپنا
حلاوت سے مزے سے لطف شیرینی سے مملو ہے
زباں اپنی سخن اپنا کلام اپنا بیاں اپنا

چلتے ہیں ہم بھی سوئے تیں چھا گئی گھٹا   ساقی شراب پیکے پہنچ آ گئی گھٹا

اس طرح نقش آئینۂ دل ہو گئے ہیں آپ
ہم جس طرف گئے ہیں مقابل ہوئے ہیں آپ

اضطراب قیس ہو جاتا نگاہوں میں سبک
دیکھتا کوئی اگر محمل میں لیلیٰ کی تڑپ

رات بھر کوئی جز حسرت شریک غم نہیں
صبح دم بادِ صبا آتی ہے لیکر بوئے دوست

افسانۂ دردِ جگر پوچھا کسی نے کچھ اگر
رہ جاتا ہوں کرکے نظر افسردہ خاطر کی طرح

آیا تھا کب بت خانے سے کتنا زمانہ ہو گیا
بھولی نہیں اب تک مجھے اس سوچ کا فرق گیا

جانے نہ پائے ہاتھ سے رنگ اپنا عمر بھر
نیرنگیٔ زمانہ سے کیا کام ہے وحید

کیوں اس قدر ہے صاحب محمل کو اضطراب
شاید کوئی ہو اپس محمل تڑپ کے سرد

جاں آئی ہے ہونٹوں پہ محبت میں کئی بار
ہم مر کے بچے ہیں تری فرقت میں کئی بار

کس گل کے پسینے کی اڑا لائی ہے خوشبو
ہر گام پہ گلزار میں گرتی ہے صبا رقصاں

قطرہ جائے گی اب اپنی ما سوا کی طرف
خراب ہو کے بہت آئے ہیں خدا کی طرف

کرتا ہوں ترے کوچے کے چلنے کا میں جب قصد
تب دو قدم آگے مرے چلتا ہے مرا دل

اس دن سے کوئی شعر نہیں درد سے خالی
جس دن سے مرے ساتھ غزل خواں ہے مرا دل

کس طرح کا رکھتے ہیں خموشی میں بیاں ہم
غنچے کا دہن ہیں کبھی سوسن کی زباں ہم

جو بات ہے اس کی نگہ ہوش ربا میں
وہ غمزہ ہوشربا کو نہیں معلوم

وہ مجنوں ہوں کہ اکثر اشتیاق دید لیلیٰ میں
حباب اشک ہو کر پردۂ محمل میں جاتا ہوں

دل کو روندے ہوئے پاؤں کے تلے جاتے ہیں
ان سے کہہ دے کوئی آگے جو چلے جاتے ہیں

مرغان باغ کس لئے گھبرائے جاتے ہیں
اب دیکھیے بہار کے دن آئے جاتے ہیں

ہم ان کیلئے اک مدت سے بے صبر بھی ہیں بے تاب بھی ہیں
کیا پوچھتے ہو افسانۂ غم بے چین بھی ہیں بے خواب بھی ہیں

کیا ان سے وقت نزع کہوں داستان دل
باقی اب ایک دم ہے گلے تمر تبر کے ہیں

ہم پر تو جو کچھ گذری گذری عمر فرقت میں
کیا جانے وہاں تم پر کیا ہو گی محبت میں

چھوڑ کر ساری خدائی کو جو میں نے تمہیں چاہا
آپ کیوں مجھ سے ہم یاد کہیں کے نہ ہوئے

اپنے در پر مجھے رہنے کی جگہ دے کے کہا
اب نہ کہیئے گا خبردار کہیں کے نہ ہوئے

در گذرے خلد سے تیرے در کی زمین تو ہے
شکر اس کا ہے کہ اپنا ٹھکانا کہیں تو ہے

پھر صبا نے گیسوئے مشکیں ترا وا کر دیا
پھر سر شوریدہ کو پابند سودا کر دیا

اب تو گلزار میں یہ بھی نہیں ہو تا ظاہر
آشیاں مرغ خوش الحاں کا یہاں تھا کہ نہ تھا

ستم جن کے لئے جی سے گذرے ان کو تو کچھ خبر بھی نہ ہوئی
کہیئے تو وحید اپنے جی کا بے فائدہ کیوں نقصان کیا

جو اٹھا موج آب کی مانند — دم میں بیٹھا حباب کی مانند
کوئی دم ہم بھی بحر ہستی میں — مہماں ہیں حباب کی مانند

اسے تو آپ ہی میں ڈھونڈھ اگر اے دل طلب کچھ ہے
اسی انسان میں سب کچھ تھا اسی انسان میں سب کچھ ہے

تصور اپنے عاشق کا خیال ان کو محبت کا
فقط کہنے کی باتیں ہیں نہ جب کچھ تھا نہ اب کچھ ہے

اس نے پھر کھولی ہے زلف آج صبا آئی ہے
میں نے اڑتی سہی اس بات کی بو پائی ہے

ایک دن سیر چمن ہمراہ عاشق کیجئے — گل کو بھی کچھ چھیڑیئے بلبل کو بھی دق کیجئے۔

جن دنوں میں حضور کم سن تھے — کیا زمانہ تھا اور کیا دن تھے

ان کا بھی کوئی حمید تسکین نہیں اب یاد
کیا منتشر ذہن میں اپنے حواس ہیں
احوال کچھ نہ پوچھئے مرغان باغ کا
رخصت بہار گل کی ہے سب اداس ہیں
محو امید سر سے قدم تک میں اس قدر
ہم خود لب پہ ٹوٹے ہوئے دل کی آس ہیں

یوں تک شمع جو داغ فراق رکھتے ہیں
وہ جلنے پر بھی ترا اشتیاق رکھتے ہیں۔

کرتا ہوں جو میں ہاتھ سے ان کے کبھی مس پاؤں
کس ناز سے فرماتے ہیں وہ چھوڑ یئے بس پاؤں

کیا گوشۂ عزلت کا ہوں پابند اسیری
پھیلانے نہ دیگا مجھے یہ کنج قفس پر

اب خاک پہ اس کی تو مناسب ہی نہیں چلنا
میں آنکھیں بچھاؤں تو رکھے ان فرس پاؤں

اس موسم گل تک تو رہائی نہیں
زنجیر میں بے طور پھنسے اب کے برس

دو دن کو بھی تقدیر اگر راہ پر آتی
جاتے نہ کبھی منزل مقصد کو ترس پاؤں

کیا چھلکتی ہے خاک راہ صحرائے غم یا
اس دشت میں اس ان کے جاتے ہیں سبد پاؤ

لازم تو یہی ہے انہیں کر دام سے آزاد
صیاد اسیروں کے نہ پر باندھ نہ کس پاؤں

بہتر ہے نہ آلودگی لذت دنیا
کیچڑ میں نہ اس ان کے جا یں کہیں پھس پاؤں

دشوار وحید ان کی محبت کی ہے منزل
اس کوچے میں رکھ سکتے ہیں اہل ہوس پاؤں

شوق ہے کون سی منزل کا الٰہی ایسا
کس طرف قافلہ یاروں کے چلے جاتے ہیں
خاک میں کس کو ملایا کسے پامال کیا
اس سے کیا کام ہے وہ چال چلے جاتے ہیں

قطعہ

پسِ فنا جو کسی نے مرا سیہ ذکر کیا
کہ یاد اس کی تمہیں اب بھی یاد ہے کہ نہیں
تو بولے جائیں گے اک روز فاتحہ پڑھنے
کہیں کچھ اس کا نشانِ مزار ہے کہ نہیں

اے طائران گلشنِ تصویر سچ کہو
کیوں رہ گئے ہو کھولے منقار ہو کہاں
آئی ہے کس کے دستِ حنائی کی یاد تمکو یاد
کیوں مضطر ہے ہو دیدۂ بیدار ہو کہاں

شوق میں کیسے اڑے جاتے ہیں کوچے یار کو
ہو گئی شاید پرِ پرواز پیدا پاؤں میں

کیا تعجب ہے جو مر کر بھی نہ ہوشیار ہوں میں
ساقیا بادۂ توحید سے سرشار ہوں میں

ہے مرا رنگ طراز چمن دہر کہاں
شکل تصویر ہوں میں نقش بدیوار ہوں میں

پھر کیے تیغ و برہمن مری خاطر اے دوست
اور تو کیا ہے محبت کا گنہگار ہوں میں

لب ساحل ہوں میں لیکن نہ ہوا تا کبھی تر
عین دریا ہوں مگر تشنۂ دیدار ہوں میں

منتظر یار کے آنے کا جو رہتا ہوں وحید
چشم بے خواب ہوں میں دیدۂ بیدار ہوں میں

دل کا اور داغ دل کا کیا نشاں بتائیں ہم
دیکھ تو یہ بستی ہے وہ چراغ جلتے میں

ہر مرغ چمن کو ہے تمنائے اسیری
جس دن سے وہ ہم پیشۂ صیاد ہوئے ہیں

جہاں میں جن کے دل پر ہجر کا گذرا ہے کچھ صدمہ
وہ اکثر اس غزل کے شعر سن سن کر تڑپتے ہیں

وہ آرزو ہوں کہ آتی نہیں کبھی لب پہ
کبھی جو دل سے نکلے وہ مدعا ہوں میں

جس روز سے ہوں آپ کے آنے کا منتظر
اس دن سے مثل دیدہ پر انتظار ہوں

شبنم کی طرح سے چمن دہر میں رہے
مدت گذر گئی ہے کہ میں اشکبار ہوں

ہے میرے دم سے گور غریباں کو اک فروغ
داغ جگر سے اپنے چراغ مزار ہوں

وہ دل ہوں میں کہ غیر کی جس میں جگہ نہیں
وہ چشم ہوں کہ وقف رہ انتظار ہوں

وہ شمع ہوں کہ بزم میں اب صبح ہوں مہماں
وہ شعلہ ہوں کہ داغ وہ روزگار ہوں

نہ وہ مستی چشم ہے عربدہ جو نہ وہ سر ہے خواہش جام و سبو
نہ وہ اپنی ہے بادہ کشی لب جو کہ خیال یار تو رہا ہی نہیں

پتہ ملتا نہیں کچھ بھی ترا اے شعلہ رو تب تک
برنگِ شمع جل جانے کو ہر محفل میں جاتا ہوں

کرتے ہیں جو کچھ بیان بے وفا کس سے کہیں
کون سنتا ہے ہماری اے خدا کس سے کہیں

مدتوں سے لوٹتے ہیں بستر اندوہ پر
دردِ دل کی کون لائے گا دوا کس سے کہیں

حال دل کہنے کو جب پوچھا تو فرمانے لگے
جس سے چاہو کہہ نہ دو کہتے ہیں کیا اس سے ہم

آپ تو اوروں سے بھی کر لیتے ہیں مطلب کی بات
ہم کہا چاہیں تو اپنا مدعا کس سے کہیں

تو نے دروازے پہ ان کی خاک تک نے نہ دی
اپنی بربادی کا قصہ اے صبا کس سے کہیں

وہ ادھر آرام کرتے ہیں ادھر باد صبا
لے اڑی ہے نکہت زلف دوتا کس سے کہیں

آپ نے تو کہہ دیا ہم سے نہ کہیئے حال دل
تو فرما دیجئے آخر بھلا کس سے کہیں

سب تو بیگانہ نظر آتے ہیں ہمکو اے وحید
کس کے آگے رو دیں حال آشنا کس سے کہیں

دکھلا رہے ہو لطف بہار و خزاں ہمیں
گل ہو تمہیں چمن ہو تمہیں باغباں ہمیں

وفا

لالہ شیو کمار نام وفا تخلص کرتے تھے، خاندان کے ایک فرد تھے۔
آپ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، شاہ و خراں میں خواجہ عشرت لکھنوی نے ان کا تذکرہ کیا ہے، دیوان طبع ہوا تھا مگر آج کل نایاب ہے۔
نواب آصف الدولہ کے عہد میں آپ وقائع نگار رہے تھے۔ اور وہاں سے راجہ کا خطاب بھی پایا تھا۔ تاریخ پیدائش اور مزید حالات سے آگاہی نہ ہو سکی البتہ وفات ۱۸۰۵ء بتایا جاتا ہے۔ آپ کا ذوق شاعری بہت بلند تھا۔ میر تقی میر سے تلمذ رکھتے تھے۔ میر و سودا کے زمانے میں آپ نے شرکت بھی مشاعروں میں کی اور اچھی غزلیں کہیں۔ وفا کا تذکرہ بعض تذکرہ نگاروں نے شعرائے لکھنؤ کے ضمن میں کیا گیا ہے یہ قطعی غلط ہے۔
راجہ صاحب بڑے حسین و جمیل وجیہہ و شکیل۔۔۔ اسلامی تہذیب کے دلدادہ تھے، اس خاندان میں اب کرا میں کوئی نہیں نمونہ کلام یہ ہے:

مشتعل رات وہ آتش تھی میرے سینے میں
کہ نہ رکھا گیا ہاتھ اپنے جگر پر اپنا

مدینہ گنبدیں نہ یہ بھی تو ہوا ہائے نصیب
کہ کبھی دور ہی سے دیکھنا ہو جائے نصیب
پہنچیں یہ ہاتھ جو اپس نگارین پہ سرے
ہم نشین میں نے بھلا ایسے کہاں پائے نصیب

یاد

سید یاد حسین رضوی نام۔ یاد تخلص۔ خواجہ نرولی کے فرزند بہت زندہ دل آدمی تھے۔ کلام تسرلفیانہ ہو اکرتا تھا۔ بہت خوشگو شاعر تھے۔ آپ کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ آپ کے اکلوتے فرزند سید اولاد حسین عرف للو میاں کراچی میں مقیم ہیں۔ نمونہ کلام کے سلسلہ میں ایک قصہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ممتاز حسین مرحوم ساکن نرولی حتی کبھی زمینداری ختم سب چک کی صورت میں تھی۔ مثلاً دو چک تاج ملاحان۔ دو چک جلالپور، دو چک شکارپور، وغیرہ اپنی انگلیوں میں انگشتریاں (انگوٹھیاں) پہنتے تھے اور ان کے دو فرزند سید عنی اور محمد سبطین تھے۔ یہ اپنے کاشتکاروں پر ظلم اور ہے لگان کے سلسلہ میں سرسری (نالش لگان) بہت کیا کرتے تھے۔

چنانچہ یاد مرحوم نے ممتاز حسین کی شان میں ایک زیارت اسلام کہا جس کے چند مصرعے یہ تھے اور اس میں مندرجہ بالا تمام باتوں کی طرف اشارے ہیں:۔

اَلسَّلَامُ عَلَیکَ یَا ھَالِکَ الجُلُوت   اَلسَّلَامُ عَلَیکَ یَا تَاجَ المُلُوک

اَلسَّلَامُ عَلَیکَ یَا کَثِیرَ السَّرسَرِی   اَلسَّلَامُ عَلَیکَ مُزَیَّن بِہ الکَشتِی

اَلسَّلَامُ عَلَیکَ یَا دُلَدَ السِّبطَین   اَلسَّلَامُ عَلَیکَ . . . .

آپ کے پوتے سید اختر مہدی آرڈی ننس ڈپو ڈرگ روڈ کراچی میں ملازمت کرتے ہیں یاد کے حالات کے سلسلے میں آپ کو تحریر کیا گیا ہے مگر اختر مہدی کا پیدائش کے قبل سے یاد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وجہ سے کچھ تفصیلی معلومات نہ ہو سکیں تاہم یہ علم ہوا کہ یاد انتہائی خلیق، ہردلعزیز اور وضع دار انسان تھے۔ ان کا زیادہ تر کلام غیر مطبوعہ تھا اور اب ان کے ورثا کے پاس بھی محفوظ نہیں ہے ہندوستان میں پاکستان کی منتقلی میں کہیں گم ہوگیا بہرکیف ان کی شاعری کے چرچے وقت کے ملیں تھے نعتیں حمد اور منقبت پیہ اطراف واکناف میں زبان زد خاص و عام ہوئیں۔

بڑے خوبرو اور وجیہہ متشکل آدمی تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے داد دیتے اور داد وصول کرنے کے علاوہ اپنے گھر پر بھی شعر و شاعری کی محفلیں منعقد کرتے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

اختتامیہ

حمید

سید حمید اللہ نام حمید تخلص کرتے تھے، آپ کے والد ماجد سید مولوی حبیب اللہ کاظمی کا شمار بڑے رؤسا میں ہوتا تھا۔ شجرہ نسب تاریخ کڑا مانکپور، کے صفحہ ۱۴۷ پر درج ہے۔ قصبہ میں شعر و شاعری کے چرچے آپ کے زمانے میں بہت بلند ہو رہے تھے آپ نے بھی اس سے اپنے آپ کو

بغیر متاثر ہوئے نہ رکھا اور مشاعروں کیلئے غزلیں لکھیں شرکت کیں مشاعروں
میں شرکت کی اور داد تحسین حاصل کی ان کے فرزند سید اسد اللہ کاظمی
موجودہ دور میں الہ آباد کے مشہور وکلا میں ہیں۔ بڑے صاحب اخلاق
اور ذی مروت انسان ہیں۔ مگر آپ کے پاس والد مرحوم کا کوئی نمونہ کلام
نہیں ہے۔ کڑا میں آج تک ان کا مکان اپنی وسعت اور رفعت کا اپنی
مثال آپ ہے

حمید کو شعر و شاعری کا شوق تھا مگر کوئی دیوان مرتب نہیں کر
سکے۔ لوگوں کے تحویل حافظہ سے استفادہ کر کے صاحب موصوف کے
چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاریخ وفات ۴ جمادی ۱۴۰۸ھ بتائی
جاتی ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے

ان کی یادوں کی شمعیں فروزاں رہیں — رات بھر مثل پروانہ جلتے رہے
زندگی کا کریں ذکر کیا دوستو — یونہی گرتے رہے اور سنبھلتے رہے

رقم

مولوی احمد حسن نام رقم تخلص کرتے تھے۔ مولوی احسان اللہ فاروقی
کے فرزند ارجمند تھے آپ کا سلسلۂ نسب شاہ اسمٰعیل فاروقی سے ملتا ہے جن
کا تذکرہ تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ ۲۸ پر پایا جاتا ہے۔ آپ کا خاندان
مولویانہ شعر و شاعری کی فضا سے گونج رہا تھا اسی ماحول سے متاثر ہوکر

آپ نے بھی بچپن سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی لینی شروع کی یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی تاریخ ولادت اور وفات کیا ہے مگر خاندان میں آپ کے اشعار و قصے کہانیاں اب بھی مشہور ہیں۔ شعر تحت اللفظ پڑھتے تھے اور قصبہ کے مشاعروں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے اور داد وصول کرتے تھے۔ "تذکرۂ نادر" جس میں کڑا کے اور کئی شعرا کا تذکرہ ملتا ہے آپ کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔ اس کتاب سے نقل کر کے ذیل کے اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔

نہیں رخ زلف عنبر فام سے بند | یہ تڑکا نور کا ہے شام سے بند
نہ بالوں سے چھپا چہرے کو کافر | نہ کر اسلام کو اسلام سے بند
نہ دیتا ہو نہ دو بوسے لبوں کے | زباں کو یہ کرو دشنام سے بند
وہ مےکش ہوں جو میخانے میں جاؤں | کرے ساقی بھی خم کو جام سے بند

رقم کس کا تصور ہے یہ تم کو
جو کی ہے آنکھ خاص و عام سے بند

رقم فی البدیہ شعر کہنے میں مہارت رکھتے تھے، ایک بار تحصیل سراتھو میں ایک

تذکرہ نادر ـ مرتبہ سید مسعود الحسن ادیب ـ کتاب دین دیال روڈ لکھنؤ ۱۹۵۷ء، مصنفہ کلب حسین خاں بہادر نادر قیمت ۸ روپے کراچی یونیورسٹی

صـ ۴۳، ـ ـ ـ ۸۰ و صـ ۱۶۴

ایک تحصیلدار شیعہ مذہب کا آیا تھا۔ اور سنیوں سے بہت کد رکھتا تھا۔ اتفاق سے رقم کا کوئی مقدمہ اس کے اجلاس پر ہوا اور وہ حاضر ہوئے۔ بیانات وغیرہ ہو رہے تھے کہ دوپہر کے وقت کھانے کے وقفہ میں سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رقم تنہا رہ گئے۔ تو انہوں نے اجلاس پر ایک بیاض دیکھی جس پر ایک شعر یہ لکھا تھا۔

بر ہر بیاض کانہ بود ذکر مرتضےٰ لعنت برآں بیاض و اہلِ بیاض ہم

رقم کا فاروقی خون جوش میں آیا اور ان کی بدیہہ گوئی نے ان کی رفاقت کی اور برجستہ چار مصرعے اسی وقت ضم کر کے اس بیاض پر نیچے کر جلدی سے کھسک گئے۔ وہ مصرعے یہ تھے۔

نیب ہر بیاض بود حمد کبریا ہم بود نعت عترت و اصحاب راتما
زندیقیان مولد لعنت بہ افترا ناکردہ عزت مرتبہ گوینہ بے حیا
برہر بیاض کاں نہ بود ذکر مرتضےٰ لعنت برآں بیاض و اہل بیاض ہم

ایک اور تحصیلدار کریم بیگ تحصیل متھرا میں تعینات ہوا اس کے جسم پر سفید داغ تھے اور وہ بہت بد زبان تھا اکثر اوقات شرفاء کو بھی ایسے بیہودہ الفاظ کہہ دیا کرتا تھا۔ روساء کرام قریب وجوار اس سے تنگ آچکے تھے۔ رقم کو بھی اس کی بد زبانی اور بد خلاقی کی اطلاع پہنچ گئی۔ اس سے متاثر ہو کر انہوں نے جس شاعرانہ رعایت کے ساتھ ایک

قطعہ قلمبند کیا ہے اس سے ان کی جودت طبع کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

زبان کو روک شریفوں کا یہ کلام نہیں
سمجھ سمجھ کہ زمیندار ہیں غلام نہیں
چلے گا ایک طرح پر نہ ابلق ایام
کریم بیگ دہن میں ترے لگام نہیں

اس قطعہ میں" ابلق ایام" اور اس کے سفید داغ کی مناسبت بھر "جائے گا" اور لگام" کا ربط "" زبان" اور دہن کے اجزا ایسے خوبی سے استعمال کئے گئے ہیں کہ صاحب ذوق حضرات اس چھوٹے سے قطعہ کی بلاغت کا لطف ضرور لیں گے۔

ایک بار ایک تحصیلدار سراتھو منجھن پور کی تحصیل میں تعینات ہو صاحب کو چوہے مارنے کا خبط تھا۔ گاؤں گاؤں اور جگہ جگہ چوہے مارنے کیلئے لوگ بھیجے جاتے۔ دوائیاں ڈالی جاتیں اور چوہے مارنے کی مہم سر کی جاتی اس حرکت سے رقم نے بھی اثر لیا اور ایک شعر لکھا۔

بچنا اب چوہوں کا موسی کی قسم دشوار ہے
اب سر تحصیل منجھن پور چوہے مار ہے

چوہے کو دیہات میں موس بھی بولتے ہیں اسی مناسبت سے رقم نے موسی کی قسم کھا کر چوہے مارنے کی حرکت کا اظہار بڑے لطیف

راقم کے دو بھانجے۔ ابو نصر اور ابو سعید تھے جن کا تذکرہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے۔ ایک بار کسی بات پر ان لوگوں سے ناراض ہو گئے اور ایک شعر قلمبند کر دیا جو خاندان میں آج تک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ شعر یہ تھا۔

طیش میں منہ سے کیوں نہ کف نکلے
بھانجے دونوں ناخلف نکلے

راقم الحروف کے ماموں بدرالحسن صاحب عثمانی اکثر اوقات اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے تجیداں یہ شعر پڑھ دیا کرتے ہیں اور اسی طرح یہ شعر نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا آ رہا ہے اور ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ان کا ترمیم شدہ شعر یہ ہے۔

طیش میں منہ سے کیوں نہ کف نکلے
بھانجے سارے ناخلف نکلے

سیار

۱ سید علی نقی نام سیار تخلص کرتے تھے آپ سید محمد تقی بن سید نثار علی بن سید غلام کریم بن سید محمد شاہ رئیس کڑا تھے۔ آپ کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ جد مکرم سید نثار علی کڑا سے دلی بھاگ گئے تھے جن کا تذکرہ مرغوب کے ذکر میں کر دیا گیا ہے۔ انہیں سید نثار علی کی ولادت

میں سید علی نقی تھے جنہوں نے چاند پور میں سکونت اختیار کر لی تھی چونکہ آپ کا خاندان جلال بخاری سے تعلق تھا۔ اسی واسطے شعر گوئی کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ بہر خلوص اور ماہر فن مرثیہ خواں تھے۔ یہ تو علم نہ ہو سکا کہ یہ فن انہوں نے کس استاد سے حاصل کیا تھا چونکہ ان کا قیام زیادہ تر اودھ اور اس کے نواح میں رہا اور بسلسلۂ ملازمت محکمہ پرمٹ میں انسپکٹری کے عہدہ پر زیادہ تر اسی علاقے میں رہے اس لئے قوی خیال ہے کہ اساتذہ لکھنؤ ہی سے کسی کے شاگرد بھی ہوں گے آخر عمر میں پنشن یاب ہو کر چاند پور ضلع بجنور میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور تا دم آخر وہیں رہے۔ ان کی مرثیہ خوانی اس خوش اخلاقی سے ہوتی تھی کہ سامعین بلا متاثر ہوئے نہ رہ سکتے تھے۔ آپ کبھی کبھی رنگ تغزل میں بھی اگر طبع آزمائی فرماتے تو اس میں بھی ان کا رجحان محبت اہلبیت بیان سے جدا نہ ہوتا۔ بعارضۂ شدت خونی بواسیر جان بر نہ ہو سکے اور آخر بوقت رحلت یا علی یا علی کہتے ہوئے دنیا سے گذر گئے۔ تقریباً ستر سال کی سن میں۔ ۸ راگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۲ شعبان ۱۳۲۳ھ کو انتقال کر کے اپنے خاندان کے قریب دفن ہوئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

مجھے الفت ہے محبوب خدا سے — کوئی افضل ہے کب خیر الوری سے

محمد باعث ایجاد عالم — ہے شامل خلق سے حاصل خدا سے

علی کا رتبہ وال خیر البشر ہے — علی آگاہ شان مصطفیٰ سے

شفیع المذنبین ذات محمد — مجھے کیا خوف ہے اور جزا سے

لدائے کوچہ خیر الوریٰ ہوں — غرض کیا ہے کسی شاہ اگدا سے
الٰہی کر کوئی ساماں ایسا — ملوں میں روضۂ شاہ ہدیٰ سے
محمد کا ثنا خواں خود خدا ہے — زباں ہے لال سید کی ثنا سے

نعت

محمد سا نہیں کون و مکاں میں — نہیں ایسا کوئی ہر دو جہاں میں
محمد آدم و حوا کے ہیں فخر — جواب ان کا نہیں کون و مکاں میں
ملائک حکم احمد کے ہیں تابع — تھے جبریل آپ کے خادم جہاں میں
خدا نے کی تھی یوں مہماں نوازی — گئے فخر دو عالم لامکاں میں

ظہور احمد مرسل سے سید
پڑا تھا لرزہ کسریٰ کے مکاں میں

محو ہیں ہم عشق میں گلفام کے — ہم نہیں پابند ننگ و نام کے
دیر سے مطلب نہ کعبے سے غرض — عبد ہیں ہم مالک صمصام کے
ناصحا مت کر نصیحت اس قدر — ہم نہیں تابع ترے احکام کے
دل میں کی ساقی کی الفت نے جگہ — کیا کریں غور کریں مئے کے جام کے

"حدائق مرغوب" از مرغوب نقوی ۔ مطبوعہ حکیم پریس کراچی

ملاحت روئے جاناں پر دلِ شوریدہ مائل ہے
نگہ دزدیدہ دلبر سے رگِ جاں میری گھائل ہے

نقیرِ دل سے طلبگار طلبگاری جو رہتا ہے
یہ بندہ بھی اسی کی بخشش و رحمت کا مائل ہے

کیا پیدا نہ ہمسر جس کا خالق نے دو عالم میں
وہ محبوبِ الٰہی کا وصی نیکو خصائل ہے

رخ روشن کی ہے ضیا را اس
جس کی ضو سے قمر بھی شرمائے

نہ جانبر ہوگا بیمار محبت دردِ فرقت سے
لیا یہ وصل کی امید پر اس نے سنبھالا ہے

طاہر نقوی

سید محمد طاہر نام طاہر تخلص کرتے ہیں۔ سید محمد متین متین کے فرزند ارجمند ہیں اور تاحال کڑا میں مقیم ہیں۔ آپ کے والد سید محمد متین اپنی بدیہہ گوئی کی بنا پر آج تک قرب وجوار کڑا میں مشہور و معروف ہیں۔ نمونۂ کلام اور حالات زندگی کیلئے کئی خطوط کڑا لکھنے پڑے مگر جواب سے ہنوز محرومی۔ شعر سخن کا ذوق بچپن سے ہی ہے جو کچھ کہا کرتے

سے تھے زیادہ تر والد صاحب کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے پیش کرتے ۔ اب آپ کا رجحان شعر و شاعری کی طرف اس قدر نہیں ہے تاہم کبھی کبھی مصرعے موزوں کرنا غالباً یعنی اب بھی آپ کے جملہ مشاغل میں سے ہے ۔ نظم گوئی سے طبیعت بیزار نہیں ہوئی ہے اور اکثر اوقات لوگوں کی وفات پر آپ نے قطعۂ تاریخ لکھی ہے سید زوار حسین عدیل کی وفات حسرت آیات پر بھی ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے ۔

کس کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں کون دنیا سے اٹھا
کس کے غم میں آج گریاں ہر جوان و پیر ہے
جستجو کرتا ہے کیوں اس کی جہاں میں اسے یہ کہہ
گلشن فردوس میں زوار کی جاگیر ہے

ظہیر

سید کبیر الدین احمد نام ظہیر تخلص کرتے تھے آپ کا نام نامی تذکرۂ گیا اور تذکرۂ شعرائے زمانہ کی فہرست میں آتا ہے ۔ آج تک گیا میں آپ کا نام لوگ بڑی عزت و احترام سے لیتے ہیں ۔ آپ کے والد ماجد شاہ سید نصیر الدین احمد بڑے بزرگ تھے شاہ صاحب کا سلسلہ نسب تاریخ گیا ملکیور کے صفحہ ۱۲۳ پر موجود ہے شاہ صاحب نے ظہیر کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ رکھی عربی فارسی کی تعلیم گھر پر ہی دلائی ۔ اپنے فرزند کو شاہ صاحب بڑا ذی علم صاحب کمال اور جاہ و حشم والا دیکھنا چاہتے تھے ۔ ظہیر نے اپنے والد کی خواہش کے مطابق علم و فن میں

کمال حاصل کیا کتابوں سے آپ کو بڑا شغف تھا ۔ بڑی نایاب و نادر کتابیں جمع کر کے آپ نے اپنا کتب خانہ ترتیب دیا تھا جس میں زیادہ تر علم و ادب پر کتابیں پائی جاتی تھیں ان میں فارسی عربی کی بے شمار ایسی کتابیں تھیں جن کا صرف واحد نسخہ ان کے اس کتب خانے میں تھا اطراف و اکناف میں آپ کے کتب خانے کا تذکرہ آج تک پایا جاتا ہے آپ کے علمی مذاق کا غلغلہ اب بھی بلند ہے ۔

چھریرا بدن میانہ قد گندمی رنگ اور کتابی چہرہ آپ کا حلیہ تھا ۔ صورت سے زہد و تقدس کے آثار نمایاں تھے ۔ شعر و شاعری کا ازحد شوق تھا اردو فارسی ہر دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ اس زمانے کے نوجوان شعرا میں اکثر آپ سے اصلاح لیتے اور مشورۂ سخن کرتے تھے آفتاب احمد گوہر نے بھی اپنی چند غزلوں پہ اصلاح لی ہے ۔ آپ کو علم و عروض اور فنِ شاعری میں مہارت حاصل تھی ۔

افسوس ہے کہ آپ کے دونوں فرزند عمادالدین عماد اور رتن ابھی حال ہی میں انتقال کر چکے ہیں ۔ اس وجہ سے نمونۂ کلام کچھ زیادہ دستیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہی حالات سے مزید آگاہی ہو سکی ۔ راقم الحروف نے حتی الوسع بڑی کوشش کی ۔ مگر زمانہ نے کلام دینے سے گریز کیا ۔ اور مایوسی میں ہی راہ نجات نظر آئی ۔ امید ہے کبھی مستقبل میں اگر آپ کا کلام منظر عام پر آیا تو ارباب علم و ہنر کی نگاہوں کی ٹھنڈک ہوگا ۔

آپ کی وفات ۱۸ رجب ۱۹۴۲ء بتائی جاتی ہے ۔ انتقال کے بعد آپ کے لڑکوں نے آپ کے اس علمی ذخائر کو بیلوں کی دوکان کی نذر کر دیا ۔ کچھ کتابیں دیمکوں کی غذا بنیں اور کچھ دریائے گنگا میں غرق کر دی گئیں ۔ کڑا اور اہل کڑا نے ایسی علمی و ادبی کتابوں کے اکثر ذخائر کا یہی حال دیکھا ہے مستقبل کا مورخ جب

اس پر قلم اٹھائے گا تو یہاں کے لوگوں کی ناقدری ۔ ناہنی اور کوتہ نظری کا تذکرہ بڑے بے دریغ انداز میں کرے گا ۔

اوّل تو گذشتہ پچاس سال میں صحیح معنوں میں کوئی ٹھوس قسم کا تحقیقی کام کیا ہی نہیں ہوا اور جو کچھ ہوا بھی ۔ وہ اسی طرح لوگوں کی بے احتیاطی اور بے توجہی کا شکار ہوکر دریا برد اور امتداد زمانہ کے ہاتھوں ناپید ہوگیا ۔

بے بسی سر بگریباں ہے تباہی پہ مری
آپ بھی اپنی نگاہوں سے کچھ ارشاد کریں

ہم نے جن کے لئے یہ عمر گنوائی اپنی
ان کا یہ حکم ہوا ہے نہ ہمیں یاد کریں

فیاض

سجاد علی نام فیاض تخلص کرتے تھے آپ کے والد ماجد سید بیدار علی بیدار تھے جن کا تذکرہ صفحہ نمبر ۹ پر موجود ہے آپ کا سلسلہ نسب سید جلال بخاری سے ملتا ہے جن کا تذکرہ تاریخ کڑا مانکپور کے صفحہ نمبر ۱۳۴ پر پایا جاتا ہے ۔ بیدار خود ایک قادر الکلام شاعر تھے ۔ فیاض کی تعلیم پر انہوں نے خاص توجہ رکھی اور یہ کوشش کی کہ عربی و فارسی میں اسے خاطر خواہ دستگاہ حاصل ہو ۔ دیامن۔

سے نے بھی بڑی آسانی سے اس میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اکثر اوقات اپنے والد محترم سے ہی اصلاح لیا کرتے تھے۔ والد کی توجہ نے بیٹے کی جودت طبع پر قلعی کا کام کیا اور انہیں محفل شعر و سخن میں کافی داد ملنے لگی۔ آپ کا نمونہ کلام زیادہ تو نہیں مل سکا صرف ایک شعر دستیاب ہو سکا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

ہم تام نہ لیں گے کبھی اس راہ گذر کا
دل میں مگر آپ آکے پکارا نہ کریں

آپ کے برادر بزرگ سید پرورش علی سحر کا سکہ الٰہ آباد سے لکھنؤ تک بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے ان کے ساتھ الٰہ آباد کے اکثر مشاعروں میں بھی شرکت کی ایک بار دریاآباد کے ایک مشاعرے میں آپ کی غزل پر لوگوں نے کچھ شک کا اظہار کیا۔ اسی وقت مصرعہ طرح دیا گیا۔ اور برجستہ فیاض نے گرے لگا کر ۹ اشعار کی ایک غزل مرتب کر دی۔ یہ غزل تو اس وقت دستیاب نہیں ہو سکی۔ البتہ دوسرے اشعار نمونہ کلام میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

روح بے چین ہے دل محو غم آرائی ہے
آج پھر اس بت طناز کی یاد آئی ہے

آج تک دیدہ و دل میں اسی آہٹ پہ لگے
جس نے تاحشر نہ آنے کی قسم کھائی ہے

خواجہ کڑک ابدالؒ

بادشاہوں اور شہنشاہوں کی حکومت لوگوں کے جسم و جان تک محدود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بادشاہت کے ساتھ ہی ساتھ ان کا نام بھی دنیا سے اُٹھ جاتا ہے۔ علاؤالدین، بابر، اکبر اور شاہجہان سب اپنے عہد کے مشہور و معروف بادشاہ بلکہ شہنشاہ گزرے مگر آج کوئی شخص بھی نہ ان کے مزاروں پر حاضری دیتا ہے اور نہ فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ اس کے برعکس بزرگانِ دین کی حکومت لوگوں کے دلوں اور روحوں پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مادی منفعت نہ ہونے کے باوجود لوگ بزرگانِ دین کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں۔

خواجہ کڑک ابدالؒ کے وصال کو تقریباً ساڑھے چھ سو برس گزرے۔ لیکن اب بھی ضلع الہ آباد میں سب سے بڑا عرس ان ہی کا ہوتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ غوث علی شاہ صاحب[1] نے بھی اپنے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ "اثنائے راہ میں شاہ کڑہ کا مزار آیا اس پر حاضری دینا ضروری تھا لہٰذا بروز پنجشنبہ مزار پر حاضر ہوا" ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ گو اس دنیا سے گزر گئے لیکن ابھی تک ان کی بادشاہت باقی ہے اور باقی رہے گی۔

تواریخ کے مطالعہ سے خواجہ کڑک ابدال کی صحیح تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا لیکن لوگوں نے خواجہ صاحب کی عمر جو بتائی ہے وہ ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے اگر اس بیان کو درست مان لیا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب

[1] تذکرہ غوثیہ

نے سنہ ۱۲۳۰ھ اور سنہ ۱۲۶۸ھ کے درمیان اس دنیائے فانی میں قدم رنجہ فرمایا۔ آپ بخارا کے رہنے والے ہیں آپ کا نام کتب تواریخ میں مختلف آیا ہے تاریخ آئینہ اودھ اور تاریخ کڑہ مانک پور میں آپ کا نام سید احمد تحریر ہے اور کڑے میں جو آپ کے برادر زادگان ہیں ان کی تحریروں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ بعض نوشتوں میں آپ کا نام کڑک اللہ بھی لکھا ہے۔ در اصل یہ آپ کا تخلص تھا اور لوگوں نے اسے آپ کا نام خیال کر لیا بعض جگہ آپ نے خواجہ بھی تخلص فرمایا ہے۔ بعض مورخوں نے آپ کو شاہ کڑک لکھا ہے۔ یہ آپ کی عرفیت تھی۔ کڑک در اصل ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے آواز بلند کے ہیں چونکہ خواجہؒ بحالت جذب شور وغل کیا کرتے تھے اس لئے قرب وجوار کے لوگ آپ کو شاہ کڑک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سید احمد البخاری و سید محمد البخاری دو بھائی سوداگری کے سلسلے میں شہر مراد سے ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے۔ یہ راہ رو کیا جانتا تھا کہ ہندوستان کا سفر نہ صرف سامان کی خرید و فروخت تک محدود رہے گا بلکہ نقد دل و جان کا سودا ہو جائے گا سر زمین کڑہ البتہ قدم پکڑے گی کہ نہ صرف یہیں کے ہو رہیں گے بلکہ یہاں کے باشیوں کی خیر خواہی بھی ان کے سپرد ہو گی جب آپ ہندوستان میں داخل ہوئے اور موضع بہر ولی ضلع الہ آباد پہنچے تو شیخ محمد اسمٰعیل صاحبؒ کی نظر

ؔ شیخ محمد اسمٰعیل قریشی سہروردی برادر زادہ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی ہیں

فیض اثر نے سید احمد کی حالت ہی بدل دی۔ نہ سید احمد سوداگر سے اور نہ ان کی سوداگری وہ تو مشاہدۂ حق ہی میں ہمہ تن غرق رہنے لگے اور بادۂ توحید کا وہ نشہ چڑھا کہ آخر وقت تک مدہوش رہے پیر طریقت کے حکم سے کڑہ جانے سکونت بنایا اور وہاں کی ولایت پر سرفراز رہے۔

آپ اکثر حالت جذب میں رہتے تھے اور کبھی کبھی سلوک میں بھی ہوتے تھے بحالت جذب ڈنشی، برہنہ رہا کرتے تھے مگر قاضی رکن الدین کڑوی سے اپنا ستر چھپا لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ایک یہی مرد ہے آپ کے بھائی سید محمد کی اولاد نے آصف الدولہ کے عہد میں شیعہ مذہب اختیار کر لیا بعض حضرات کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید خواجہ کڑک بھی امامیہ مذہب کے پیرو تھے لیکن تواریخ میں تواتر سے آپ کے سنی المذہب ہونے کا تذکرہ ہے و نیز آپ کے برادرزادگان کے آصف الدولہ کے عہد میں شیعہ مذہب اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ آپ کو سرزمین کڑہ اور باشندگان کڑہ سے والہانہ عشق تھا۔ آپ کی کرامات زبان زد خاص و عام ہیں۔ آپ کے مرید اسمٰعیل لاہوری نے آپ کے حالات اور آپ کی کرامات کی حکایات تحریر کی ہیں جسے حسین دوست سنبھلی نے اپنے تذکرہ حسینی[1] بن محمود سے حسین دوست سنبھلی نے روایات یوں تحریر کی ہیں۔

روایت ہے کہ ایک بار ایک مسافر نے دیکھا کہ ایک جوان اونٹ پر سفر کر رہا ہے۔ اور اپنے ہاتھ میں سانپ کا کوڑا لئے ہوئے ہے یہ مسافر اس جوان کو

---

[1] تذکرہ حسینی مصنفہ حسین دوست سنبھلی طبع ۰۷۵ء تصنیف ۱۱۶۳ھ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ۔

دیکھ کر خوف زدہ ہوا۔ جوان نے آواز دی کہ خوف زدہ نہ ہو تو اگر کسی کا قصد نہ کرے تو وہ بھی تیرا قصد نہ کرے گا مسافر ٹھہرا ہو گیا نوجوان نے دریافت کیا کہ اے مسافر تو کہاں جائے گا۔ مسافر نے جواب دیا "ہندوستان جاؤں گا" جوان نے کہا جب تو کڑہ پہنچے تو خواجہ کڑک کو میرا سلام کہنا۔ مسافر جب کڑہ پہنچا تو اسے اس جوان کا پیام وسلام یاد آیا خواجہ کو تلاش کیا لوگوں نے بتایا کہ مسجد کے اوپر خواجہ تشریف رکھتے ہیں جب مسافر مسجد میں آیا تو دیکھا کہ خواجہ کے جسم کے حصے الگ ہیں۔ اس نے چاہا کہ اُتر آئے ناگاہ اُٹھے بی بی کا سبز[1] سلام کسی کا کیوں نہیں کہتا کہ وہ ابھی تک خودنمائی رکھتا ہے اور خدا تک نہیں پہنچا۔ اس جوان نے سلام عرض کیا اور لوٹ آیا۔"

دوسری روایت ہے کہ ایک روز ایک عمر رسیدہ شخص خواجہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میری لڑکی بالغ ہو چکی ہے اور مفلسی کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتا۔ خواجہ اس وقت حالت جذب میں تھے کہنے لگے میں نے تیرے لئے آفتاب گروی کر دیا تا کہ جب تک تیری ضرورت کے نوسو درہم تجھے نہ ملیں آفتاب نہ نکلے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مخلوق ہم نفس وہ درازی شب سے چلا اُٹھی اور اس بابت خواجہ کے پاس دوڑ کر آئی اور عرض کیا کہ یہ رات کیسی ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ کچھ ایسی ترکیب کرنی چاہیے کہ سورج نکل آئے خواجہ نے کہا میں نے نوسو درہم پر

---

[1] "لے بی بی کا سبز" خواجہ کا تکیہ کلام تھا۔ بزرگوں نے اس کی یہ توضیح کی کہ "بی بی" کے معنی دنیا کے ہیں اور "سبز" اسیر کا مخفف ہے یعنی اے دنیا کے اسیر

اس بڑھے کے واسطے سورج گروی کر دیا وہ اس کے لئے کہیا کہ وہ تمہاری مشکل آسان ہو جائے گی۔ غرض گذار اس بڑھے کا ہاتھ پکڑ کرلے گئے اور نوسو درہم سب نے مل کر ادا کر دیا اور بڑھے کو رقم ملی تھی کہ سورج طلوع ہو گیا۔

تیسری روایت ہے کہ ایک روز ماہ صیام میں خواجہ ترک بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ایک بدھے یہ منظر دیکھا اور بدھے قاضی کے پاس پہنچے اور انتہائی غصہ میں کہا کہ خواجہ ترک ہر سپہرہ رمضان کو شراب پیتے ہیں جب کہ رمضان کے مہینہ میں دن کے وقت کھانا پینا حرام ہے آپ جیسے قاضی متدین کے شہر میں تشریف رکھتے ہوئے انہیں منع نہیں فرماتے۔ قاضی چند دانش مندوں کو ساتھ لے کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تبلیغ کی نیت کی کہ اتنے میں خواجہ نے قاضی کو دیکھتے ہی شراب کا پیالہ بھرا اور قاضی کو پیش کیا اور کہا لیجئے کسی کو خواجہ کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ قاضی بھی ہیبت سے انکار نہ کر سکے اور گھبراہٹ میں خواجہ کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا اور سوچنے لگے کہ اگر نہیں پیتا ہوں تو نہ جانے خواجہ کی زبان سے میرے لئے کیا صادر ہونا ہے اور اگر پیتا ہوں تو قاضی ہوں۔ رمضان کا مہینہ ہے خلاف شرع کروں تو کیسے آخر کار پیالہ اپنے کپڑوں پر پھینک لیا اور واپس آ گئے جب قاضی گھر آئے کپڑے اتار کر پھینک دیئے اور کنیز کو دھونے کے لئے کہا۔ جب کنیز نے طشت میں کپڑے رکھے تو گلاب کی بُو نے اس کا دماغ معطر کر دیا۔ اس نے اس پانی کو پی لیا اور صاحب کشف ہو گئی۔ نیز غیب کی باتیں بتانے لگی جب قاضی

¹ قاضی موصوف خاندان قاضی احمد محتسب عثمانی سے تعلق رکھتے تھے اور عہدہ قضاۃ پر مامور تھے

نے اس کا یہ حال دیکھا تو کہا ظرف کچا تھا راز فاش کر دیا اسی وقت نمکین پانی پلا کر قے کرا دی اور کنیز اصلی حالت میں آگئی۔

چوتھی روایت ہے کہ جب علاؤالدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کرا کے اپنی حکومت کا اعلان کرنے میں کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ خواجہ کی خدمت میں بہت سا زر و جواہر اور خلعت بھیجی خواجہ کو علاؤالدین کا یہ تحفہ اچھا نہ معلوم ہوا اور علاؤالدین کو دریا کنارے لا کر کہا کہ دیکھو دریا جو اس وقت بہہ رہا تھا۔ زر و جواہر سے بھرا پڑا تھا۔ خواجہ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو زر جواہر کی ضرورت ہوتی تو دیکھو زر و جواہر اس طریقہ پر یہاں موجود ہیں۔ علاؤالدین خفیف ہوا۔ اور خاموش ہو گیا۔

پانچویں روایت ہے کہ ایک بار خواجہ بھولا چمار کے گھر تشریف لائے اور شراب پینے کے لئے مانگی۔ بھولا چمار نے عرض کیا کہ حضور لکڑی نہیں ہے خواجہ کو جذب آگیا۔ اور بھٹی میں اپنے پیر لگا دیئے جو مثل مشعل کے جلنے لگے۔ بھٹی روشن ہو گئی بھولا چمار نے شراب کشید کی اور دونوں نے پی

چھٹی روایت ہے کہ جب جلال الدین خلجی کا ارادہ کڑے آنے کا تھا تو وہ دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی درخواست عرض کی۔ نظام الدین اولیاء نے کہا کہ اچھا ٹھہرو میں خواجہ سے جو کڑہ کے صاحب ولایت ہیں دریافت کر کے بتاتا ہوں۔ آپ نے اپنے قاصد سراج الدین کو تیلی اور خرقہ دے کر روانہ کیا۔ قاصد گیا اور خواجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ تحائف پیش کئے اور سلام عرض کیا۔ خواجہ اس وقت شراب کی بھٹی کے پاس بیٹھے تھے بھٹی کی طرف

اشارہ کرکے فرمایا خرقہ اس میں ڈال دو اور قینچی واپس لے جاؤ۔ قاصد لوٹ کر پر نظام الدین اولیاءؒ سے جلال الدین سے کہلوایا کہ خواجہ نہیں مانتے آپ کو خلیفہ ہے۔ جلال الدین خلجی نے خرقہ اور قینچی بھیجنے کی وجہ دریافت کی تو نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر وہ میرے تابع ہوتے ہیں اور میری بات مان لیتے ہیں تو قینچی سے بغیر تراش کر خرقہ پہن لیں گے۔ ادھر پھر نظام الدین اولیاءؒ نے قاصد کو بھیجا کہ جاؤ اور میرا خرقہ واپس مانگ لاؤ جب دوبارہ قاصد خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی تو خواجہ نے کہا بھٹی سے نکال لو۔ قاصد نے بھٹی میں دیکھا کہ بہت سے خرقے پڑے ہیں اس نے شناخت کرکے اپنا دیا ہوا خرقہ نکال لیا اور آداب بجا لایا اور واپس ہوا

خرقہ کی اس روایت کو تاریخ گڑہ مانک پور صفحہ ۱۱۶ میں عبداللہ قیس نے بھی لکھا ہے اور نظام الدین کے بدلے غلطی سے قطب عالم بختیار اوشی لکھ دیا ہے نقل ہے کہ قطب عالم بختیار اوشی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خرقہ اپنے دست مبارک سے تیار کرکے خواجہ صاحب کے واسطے قصبہ کڑہ بھیجا تھا اس وقت خواجہ صاحب شراب کی بھٹی کے سامنے بیٹھے تھے خدام نے خرقہ نذر گزرانا خواجہ صاحب نے خرقہ کو دیکھ کر حکم دیا کہ بھٹی میں جھونک دو اور ایسا ہی ہوا۔ جب خرقہ لانے والے خدمت میں قطب عالم بختیار اوشی کے پہنچے اور سب ماجرا بیان کیا تو یہ سن کر قطب صاحب موصوف نے دوبارہ آدمیوں کو واسطے واپس لینے اس خرقہ کے خواجہ صاحب کے پاس بھیجا۔ جب ان قاصدوں کی حضوری روبرو خواجہ کڑک ہوئی تو آپ نے ارشاد کیا بھٹی آتش افروختہ کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنا خرقہ نکال

لوچنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خرقہ صحیح وسالم پایا گیا۔"

غالباً اسی روایت کو اخذ کر کے حافظ اسحٰق صاحب نے روایت لکھ دی ہے اور صرف قطب عالم کی جگہ قطب الدین تحریر کیا ہے۔ حافظ اسحٰق صاحب نے جو روایت "صد سالہ تاریخ کرڑہ" (منظوم) میں لکھی ہے درج ذیل ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۶ "تاریخ صد سالہ کرڑہ)

منقول ہے کہ خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لئے ایک خرقہ بھیجا قاصد جس وقت خرقہ لے کر پہنچا تو خواجہ صاحب بھٹی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے خدام نے خرقہ نذر گزرانا۔ انہوں نے اسے لے کر بھٹی میں پھینک دیا اور قاصد سے فرمایا کہ ع

خواجہ نہ پوشید گے خرقہ

" اس نے واپس ہو کر جو معاملہ پیش آیا تھا خواجہ قطب الدین صاحبؒ سے عرض کیا۔ آپ نے سن کر پھر قاصد کو واپس کیا اور کہا کہ جاؤ خواجہ کرڑک سے اپنا خرقہ واپس مانگو وہ پھر آیا اور خواجہ صاحب سے خرقہ واپس مانگا آپ نے اس سے کہا جا اور بھٹی سے نکال لے مگر پہچان کر اپنا ہی خرقہ لینا وہ بھٹی کیطرف گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے خرقے وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے فعل پر بہت نادم ہوا۔"

مندرجہ بالا روایتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ اسحٰق صاحب نے اس پر کوئی تحقیق کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی بجز اس تبدیلی کے کہ قطب عالم کی جگہ قطب الدین تحریر کر دیا۔ اور تاریخ کرڑہ کی روایت پر اکتفا کر لیا۔ اور اگر

وہ ذرا بھی تحقیق سے کام لیتے تو انہیں آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ اوش سے تعلق رکھنے والے قطب نام کے صرف ایک ہی بزرگ گزرے ہیں جن کا نام قطب الدین بختیار اوشیؒ ہے۔ دہلی میں اس نام کے اور کوئی بزرگ نہیں گزرے قطب الدین بختیار اوشیؒ کا وصال ۶۳۳ھ میں ہوا اور اس وقت تک خواجہ صاحب نے اس دنیائے فانی میں قدم رکھا ہی نہ تھا۔

اور اب جب کہ اسمٰعیل لاہوریؒ جو کہ اس عہد کے بزرگ ہیں اور خواجہ صاحب کے مرید خاص ہیں۔ ان کی تحریر کردہ روایت حسین سنبھلی سے نقل کردی ہے جس میں نظام الدین اولیاء کا نام تحریر ہے تو اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کیونکہ نظام الدین اولیاء جلال الدین خلجی اور علاء الدین خلجی کے عہد کے ہی بزرگ ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خرقہ والی روایت قطب الدین بختیار اوشیؒ کے نام غلط منسوب کر دی گئی ہے اور جو انداز ان دونوں روایتوں کا ہے اس سے قطب الدین بختیار اوشیؒ کی توہین ہوتی ہے جو خود اپنے زمانے کے قطب الاقطاب تھے اور نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت منسوب ہے اس میں اس قسم کی کوئی اہانت نہیں ہے۔

اس وقت دو پرانی کتابیں زیر نظر ہیں ایک تو تذکرہ حسینی اور دوسری کتاب ملفوظات خواجہ کرک۔ تذکرہ حسینی میں محمد اسمٰعیل لاہوری جو خواجہ صاحب کے مرید خاص تھے ان کی تحریر کردہ حکایتیں درج ہیں۔ البتہ ملفوظات خواجہ کرک تقریباً خواجہ صاحب کے وصال کے چار سو برس بعد تحریر کی گئی۔ تذکرہ حسینی آج کل انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور ملفوظاتِ

خواجہ کرڑک مجھے محمد رفیع صاحب نقوی سے جو آج کل مصطفےٰ آباد میں مقیم ہیں موصول ہوئی تھی اس جگہ ملفوظات کے حصول اور واپسی کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ جناب رفیع صاحب نقوی کے پاس ملفوظات خواجہ کرڑک ہے تو میں نے انہیں تحریر کیا کہ میں ایک تذکرہ سخنوران قصبہ مرتب کر رہا ہوں اس میں اس کی شدید ضرورت ہے تو صاحب موصوف نے فرمایا یہ کتاب نایاب ہے مگر تمہارے حلفیہ بیان پر کہ واپس کر دوگے بھیجوں گا اور اس سلسلہ میں انہوں نے میری کافی سے زیادہ رہنمائی بھی فرمائی۔ میں ان کے اخلاق سے انتہائی مرعوب رہا۔ میری ماموں بدرالحسن صاحب عثمانی جب ہندوستان سے پاکستان آنے لگے تو انہوں نے ان کے ہاتھ یہ کتاب بعد وصولی تحریر روانہ کی۔ میں نے اس خستہ کتاب کی عمدہ سی جلد بندھوا دی تاکہ محفوظ رہے اس دوران میں خواجہ کرڑک ابدال کا تذکرہ مختلف تواریخ سے بھی جمع کرتا رہا ادھر تقریباً چار پانچ ماہ سے رفیع صاحب کا تقاضا شدید اختیار کرتا گیا۔ میں نے انہیں لکھا کہ اگر کتاب آپ کے کہنے کے مطابق ڈاک سے روانہ کی گئی تو ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے اور ایک بار پھر لکھا کہ میں بہ حلف شرعی کہتا ہوں کہ کتاب آپ کی ہے اور آپ ہی کی رہے گی۔ میرا کبھی بھی اس پر کوئی حق نہ ہوگا۔ آپ جس شخص کے ہاتھ کہیں میں روانہ کر دوں۔ اور ان کے مطمئن ہونے کی غرض سے یہ بھی لکھ دیا کہ میں نے کتاب کی نقل بنوا دی جو لائبریری میں محفوظ ہے اور ایک میرے پاس ہے اس لئے کتاب کی میرے لئے چنداں ضرورت بھی

نہیں ہے لیکن نہ جانے انہیں کیوں یہ خیال پیدا ہو کہ میں کتاب غصب کرنا
چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے برادرِ نسبتی کو خط لکھا کہ واصل سے کتاب وصول کرلو
اور اگر کوئی بات ہو تو قانونی چارہ جوئی کرو۔ رفیع نقوی صاحب کا یہ خط اور
کتاب کی وصولی کا اجازت نامہ لے کر ان کے برادرِ نسبتی کے پیغامبر سبحان بھائی
میرے پاس آئے۔ میں خود ان کے برادرِ نسبتی جو پیر کالونی میں مقیم ہیں) کے گھر گیا۔
اور ان سے بھی وہی بات کہی جو میں نے رفیع نقوی صاحب کو لکھی تھی۔ انہوں
نے رفیع صاحب کا خط دکھایا۔ جب میں نے رفیع صاحب نقوی کے خط میں
قانونی چارہ جوئی کی بابت پڑھا تو کچھ تو ہنسی آئی اور کچھ غصہ۔ ہنسی اس لیے
آئی کہ واقعی آدمی کتابوں کے بارے میں اس قدر بے اعتبار ہوتا ہے اور غصہ
اس بات پر کہ میرے ہر بار کے حلفیہ وعدے کے باوجود انہوں نے ایسا خیال فرمایا
رہ گیا مقدمہ تو اس کے بارے میں کیا کہوں ان کے برادرِ نسبتی خود وکیل ہیں اور
بخوبی جانتے ہیں کہ اس مقدمہ میں کیا ہوتا اور کیا واقعی مقدمہ کتاب واپس دلا
سکتا ہے۔ اس سب کے باوجود میں نے ان سے رفیع صاحب کا اجازت نامہ
اور خود ان کی تحریر وصول کر کے وہ کتاب انہیں دے دی۔ اب جب کتاب
کی واپسی کی اطلاع رفیع صاحب کو موصول ہوئی تو انہوں نے مجھے لکھا کہ ایسی
(ایک نہیں بلکہ میرے کتب خانہ کی تمام کتابیں تم پہ نثار ہیں اور بخدا مجھے کوئی ایسا
گمان بھی نہ تھا۔ بہرحال دو خطوط ان کے ہی ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اعتبار
کروں تو کس پر۔

خیر یہ تو درمیان میں قصہ معترضہ کے طور پر آ گیا اب آپ ملفوظات خواجہ

کوڑک سے خواجہ صاحب کے متعلق مندرجہ ذیل روایتیں سنئے۔

روایت نمبرا۔ ایک روز خواجہ شیخ ضیاء الدین کی خدمت میں بیٹھے تھے شیخ نے کہنا شروع کیا کہ مسعود علی عرف سجن لاہوری نے کیا تم سے وصیت کی تھی بولے ہاں یاد ہے مگر ایک وقت پر موقوف ہے۔ اب اُٹھئے تا کہ سجن لاہوری کے مکان پر چلیں اور جو کچھ نصیب میں ان کے ہے وہ عطا کریں۔ ہر دو بزرگ سجن لاہوری کے گھر گئے ان کے گھر میں خواجہ علاء الدین ایک بزرگ، عالم زاہد اور عابد رہتے تھے جو حکمت اور نجوم میں بھی مکمل دست گاہ رکھتے تھے باہر آئے اور دونوں بزرگوں کو بعد تکریم و تعظیم بٹھایا۔ خواجہ نے کہا سن آج ہی کے دن تمہارے باپ نے ضیاء الدین کی خانقاہ میں مجھے پہلو میں بٹھایا اور تمہارے متعلق وصیت کی تھی۔ کچھ یاد ہے اور جانتے ہو کہ کیا کہا تھا اور دین کے کام میں وہ کیسا آدمی تھا۔ دین میں مسعود بخت تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے لڑکے علاء الدین اور سراج الدین کو شفقت کی نظر سے دیکھیں۔ اور بہت سی نعمتیں جو عطا ہوئیں ہیں ان میں سے کچھ دیں تو سنو کہ بہت سی نعمتیں جو عطا ہوتی ہیں ان میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ دین کے کام میں مقام حاصل کیا جائے۔ اب تمہیں چاہیئے کہ ہر رات سو رکعت نفل پڑھو کیونکہ پسر وہ ہیں جو اپنے والد کی پیروی کریں۔ اور عمل شیخ بہاء الدین کے ملفوظات کے مطابق کریں اور وہ خود فقیہہ حکیم آدمی ہیں کہنے کی ضرورت نہیں ایک چلّہ اس کے مرقد کے برابر ادا کرو اور دیکھو کہ شیخ کی برکت سے کام نکل آئے گا اور تجھے ولایت مل جائے گی اور جو کچھ ہم سے چاہے گا پورا ہو جائے گا اور ہم اس میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔ تیرے باپ

کی افکار سے کے مطابق اس کا مقصد ہے کہ تمہیں صاحب ولایت کر دیں۔

روایت نمبر ۲۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شب برات میں خواجہ گڑک شہر کے دروازے سے باہر بیٹھے ہوئے یہ فرما رہے تھے۔

الٰہی۔ الٰہی۔ الٰہی۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ یا حی یا قیوم یا دائم یا فرد یا وتر یا احد یا صمد یا م۔ لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد یا اللہ یا اللہ یا اللہ رحمۃ اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۴ ملفوظات خواجہ گڑک)

روایت نمبر ۳۔ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز خواجہ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص دو کبوتر لئے ہوئے جا رہا تھا خواجہ نے دریافت کیا کہ یہ دونوں کبوتر کہاں لے جا رہا ہے اس نے کہا کہ میں ایک عورت رکھتا ہوں اور یہ اس کے لئے لے جا رہا ہوں۔ خواجہ نے کہا کہ کبوتروں کا عورتوں کے پاس رکھنا منع ہے کیونکہ وہ انڈا دینے کے زمانے میں مستی کے عالم میں زیادہ بھی کھیلتا ہے اور عشق کے لوازم کا اظہار بے پناہ کرتا ہے عورت اسے دیکھے گی۔ تو زیادہ خواہشمند ہو گی یعنی اس کام میں زیادہ دلچسپی ہو گی اور خود مرد گھر سے زیادہ باہر رہتا ہے بر مرد غلام اور خواجہ سرا گھر میں رہتے ہیں۔ اس شخص نے یہ کلمات سن کر دونوں کبوتر ذبح کئے اور سیخ پر انہیں بھون کر خواجہ کی خدمت میں پیش کیا خواجہ صاحب وہ تمام مجلس نے اسے کھایا (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۴ ملفوظات

خواجہ کرڈک

خواجہ کرڈک ابدال صاحب کی بہت سی کرامات جو کرڈہ میں سینہ بسینہ چلی آرہی ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔

۱۔ روایت ہے کہ خواجہ صاحب عالم جذب میں دریائے گنگا میں پیر لٹکائے بیٹھ جاتے تھے اور جو بھی سائل ان کے پاس جاتا اور جو چیز طلب کرتا آپ اسے دریا سے نکال کر دے دیتے۔ ایک روز ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض گزار ہوا کہ حضرت میری عاقبت بھی بخیر فرما دیجئے۔ یہ سننا تھا کہ خواجہ صاحب کا جذب جاتا رہا، دریا سے پاؤں نکال لئے اور رونے لگے وہ شخص دریافت کرنے لگا کہ حضرت میں تو ایک تمنا لے کر حاضر خدمت ہوا تھا آپ اسے پورا کرنے کے بدلے خود اتنے بیزار ہوگئے۔ خواجہ کرڈک نے فرمایا رونے کی وجہ یہی ہے کہ جسے اپنے انجام کی خبر نہیں دوسرے کے لئے کیا کرسکتا ہے۔

۲۔ روایت ہے کہ خواجہ صاحب بازار میں جہاں تشریف فرما ہوا کرتے تھے اس جگہ ابھی تک ایک چبوترہ بنا ہوا ہے جس پر ہر سال سعیدی کی جاتی ہے اور یہیں پر عموماً ترکاری والے جنہیں کنجڑے کہتے ہیں بیٹھا کرتے تھے مشہور ہے کہ خواجہ صاحب ایک کنجڑن سے بے انتہا مذاق کیا کرتے تھے ایک روز وہی کنجڑن بازار سے روتی ہوئی گذر رہی تھی۔ خواجہ صاحب نے حسب عادت اس سے مذاق کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ آج صبح اس کے شوہر کو دریا کنارے نالے میں سانپ نے کاٹ لیا ہے اور وہ وہاں مرا

پڑا ہے اس بدبخت کو ابھی اطلاع ملی ہے اور یہ وہیں جا رہی ہے۔ خواجہ
صاحب یہ سن کر اس کے ساتھ چل پڑے جب جائے واردات پر پہنچے تو دیکھا
کہ وہ واقعی مرا پڑا ہے۔ کمبخت رو رو کر اس کی لاش پر گر پڑی۔ آپ نے بڑھ
کر لاش کے ایک ٹھوکر لگائی اور کہا اٹھ کیوں مذاق کرتا ہے۔ خواجہ صاحب کا اتنا
کہنا تھا کہ وہ اٹھ بیٹھا اور خواجہ صاحب واپس لوٹ آئے

۳۔ روایت ہے کہ خواجہ صاحب کو کڑا اور اہل کڑا سے انتہا سے
زیادہ محبت تھی۔ ایک مرتبہ کڑا کا ایک شخص بے روزگاری سے پریشان ہو کر
نوکری کی غرض سے دہلی پہنچا وہاں بھی حالات سازگار نہ ہو سکے اور غریب الوطنی میں
حد سے زیادہ پریشان ہوا۔ ایک روز وہ دہلی میں نظام الدین اولیاء کی خانقاہ
میں شب کے وقت پہنچا اس خانقاہ سے بعد نماز عشاء لوگ نکال دیے جاتے
تھے۔ یہ شخص ایک چٹائی میں لپٹ کر کونے میں کھڑا رہا۔ رات کا کچھ حصہ گزرنے
کے بعد اس نے دیکھا کہ فراش آیا اور اس نے فرش لگانا شروع کیا اور انتظامات
سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی کی آمد کا انتظار ہو رہا ہو۔ اتنے میں ایک شخص
بزرگ صورت صدر نشین ہو آ بیٹھے اور کچھ لوگ بھی ان کے اطراف میں بیٹھ گئے
تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا شخص جو ننگ برہنہ تھا اور بڑی بڑی آنکھوں
سے رعب کا اظہار ہو رہا تھا دروازے سے داخل ہوا ان بزرگ نے
اٹھ کر وارد سے معانقہ کیا اتنے میں اس شخص نے کہا "بوئے وطن می آید"
تو جواب میں ان بزرگ نے کہا کہ خواجہ یہاں تو بعد عشاء کوئی نہیں رہتا۔
تم خود دیکھ لو خواجہ صاحب تلاش کرتے ہوئے جب اس کونے میں پہنچے

اور چٹائی کھینچی تو وہ شخص سامنے تھا خواجہ صاحب نے پوچھا کیا چاہتا ہے
اس نے کہا حضرت گھر جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا آنکھ بند کر، جیسے ہی اس
نے آنکھ بند کی اور دوبارہ کھولی تو وہ کڑہ میں اپنے مکان کی پشت پر موجود تھا
اس شخص کو تازندگی افسوس رہا۔ یہاں آنے والے کہتے ہیں کہ وہ دوسرے بزرگ
خود خواجہ نظام الدین اولیاء تھے۔

قاموس انشاء یہ جلد دوم صفحہ ۳۰ پر ملا نظامی بدایونی نے خواجہ کڑک
ابدال کی روشن ضمیری کا قصہ یوں تحریر کیا ہے کہ "شاہ کڑک اولیاء اللہ میں
سے تھے۔ کڑہ مانک پور ضلع الہ آباد میں رہتے تھے وہیں ان کا مزار مرجع خاص
وعام ہے۔ آپ نے سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کا زمانہ پایا تھا۔ اس
وقت علاء الدین صوبہ الہ آباد کا حاکم تھا۔ اس نے فیروز شاہ سے بغاوت اختیار
کر لی تھی ۱۲۹۶ء میں یہ سن کر کہ بادشاہ اس کو سزا دینے کے لئے آرہا ہے وہ
اپنی فوج کے ساتھ دریائے گنگ کو عبور کر کے کڑا مانک پور پہ خیمہ زن ہو گیا
اور سب سے پہلے شاہ کڑک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے اس
کو دیکھ کر فی البدیہہ ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جو تیرے مقابلہ
کے لئے آرہا ہے اس کا دھڑ کشتی میں ہوگا۔ اور سر دریائے گنگا میں جا پڑے گا
چند گھنٹوں کے بعد یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

اس واقعہ کو تاریخ فرشتہ اور تاریخ مانک پور نے بھی نقل کیا ہے۔ قصہ
دراصل یہ تھا کہ جب علاء الدین دیوگری سے فتح یاب ہو کر واپس کڑہ لوٹا تو بہت
ڈرا کہ چچا سے اجازت نہیں لی تھی اور اسی خوف سے دہلی حاضر نہ ہوا۔ لوگوں

نے جلال الدین کو سمجھایا کہ علاء الدین بغاوت پر کمربستہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر علاء الدین کے پیغام بر کے کہنے کو جلال الدین نے صحیح خیال کیا اور خود علاء الدین سے ملنے کی غرض سے دہلی سے روانہ ہوا۔ علاء الدین کو جب جلال الدین کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ خواجہ کڑک کی خدمت میں حاضر ہوا اور اعانت کا طلب گار ہوا۔ خواجہ صاحب اس وقت حالتِ جذب میں تھے۔ آپ نے بے اختیار یہ شعر پڑھا ؎

ہر کہ بر آید بر سر جنگ
تن در کشتی سر در گنگ

جلال الدین جب کشتی سے کڑہ پہنچا اور علاء الدین سے بغل گیر ہوا اور کہا کہ تو مجھ سے ڈرتا ہے حالانکہ ابھی تک تیرے پیاب کی بو میرے دامن سے آتی ہے۔ اتنے میں علاؤ الدین کے ساتھیوں میں سے ایک نے جلال الدین پر تلوار کا وار کیا۔ جلال الدین کشتی کی طرف بھاگا۔ اور جیسے ہی کشتی میں پہنچا شمشیرِ خوں آشام ایک بار پھر چکی اور ساتھ ہی جلال الدین کا سر دریائے گنگا میں جا گرا۔ یہ مقام جہاں سر دریا میں غائب ہو گیا "گم راہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ ادھر جہاں سے ملاحوں نے تلاش کر کے جلال الدین کا تاج برآمد کیا۔ وہ علاقہ ملاحوں کو معافی میں دے دیا گیا اور اس علاقہ کا نام تاج ملاحاں پڑا۔ یہ دونوں مقامات کڑے میں دریائے گنگا کے کنارے اب بھی موجود ہیں۔

علاؤ الدین بعد قتل جلال الدین خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواجہ کی پسندیدہ چیز کھچڑا اور شربت پیش کیا۔ خواجہ نے تنکے میں ایک کھچڑا لگا کر سر کے اطراف گردش

دی اور خواجہ نے برجستہ پڑھا ؎

مرحبا اے بادشاہ دہلوی — گشت مغلوب تیرا خصم قوی
من ترا دادم سریر و سلطنت — بر زدہ بر نہاک تاج نعمت

دہلی پہنچ کر علاؤالدین نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ تو اس نے قاصد کے ہاتھ خواجہ کرک کی خدمت میں تحائف بھیجے اور دہلی آنے کی دعوت دی آپ نے تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ رباعی لکھ بھیجی ۔ ؎

قانع شدہ ام بخشک نان و نرہ — میلم نبود بلبوسے ریاں و برہ
دہلی و سمرقند و بخارا و عراق — ایں جملہ ترا باد مرا یاد کرہ

خواجہ کرک ابدال کے و صال کا واقعہ بھی عجب بیان کیا جاتا ہے۔ اسمٰعیل لاہوری تو آپ کے مرید ہیں۔ انہوں نے یوں تحریر کیا ہے ؎

" ایک روز خواجہ اور دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی شراب لے کر آیا۔ اور خواجہ کو شراب پیش کی۔ خواجہ نے فرمایا کہ میں نے شراب سے توبہ کر لی ہے اس وہ دن ہے جب خواجہ کو مست ہونا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اپنی ہمت کو نہ بھولنا۔ یاد رہے کہ کرشا موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو حملہ بلاؤں سے محفوظ رکھے گا۔ پھر خواجہ نے نعرہ مارا۔ اور سورۂ اخلاص پڑھنی شروع کی۔ اور یہاں تک پڑھا کہ آپ کا منہ زرد ہو گیا۔ اور خواجہ کل من علیہا فان ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام پڑھنے لگے سالار جو آپ کا خادم خاص بھی تھا۔ دریافت کرنے لگا کہ یہ رونا کس بات کا ہے خواجہ نے جواب دیا کہ یہ خوف ہے۔ کہ نامعلوم میرا انجام کیا ہو گا۔

؎ از تذکرہ حسینی ۔ ص ۔ پھرا ۔ ماس بیس کو بلایا جاتا ہے

آخر ۲۰ رجب المرجب سنتہ [illegible]ھ کو رات کے پچھلے پہر ملت محمدیہ کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ آپ کے وصال کی تاریخ ایک شاعر نے یوں لکھی ہے ۔

کرده رحلت ز عالم فانی — رفت در جنت وبد آرامید
در سر داست رحمان فزال — لاجرم باد ذ وصال حشید

آج آپ کے انتقال کو تقریباً ساڑھے چھ سو برس گذر رہے ۔ لیکن آج بھی کرڈہ میں آپ کا عرس نہایت شاندار انداز میں ہر سال ۲۰ رجب المرجب کو منایا جاتا ہے ۔ اور قرب وجوار سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آپ کے عرس میں شرکت کی غرض سے آتے ہیں

خواجہ کڑک ابدال صاحب کا عرس بھی عجیب انداز میں ہوتا ہے ۔ ۲۰ رجب المرجب کو بعد نماز عصر مزار شریف پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے ۔ اور فاتحہ سے قبل گاگر چڑھائی جاتی ہے ۔ گاگر مٹی کا سادہ چھوٹا برتن ہے جس کی شکل مٹکے سے ملتی جلتی ہے ۔ لیکن اس میں ٹونٹی نہیں ہوتی ۔ فاتحہ کے بعد سجادہ نشین کے پگڑی باندھی جاتی ہے اور وہ ایک گاگرا اپنے سر پر رکھتا ہے ۔ تمام اہل محفل بھی گاگرا اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیتے ہیں ۔ اور مزار شریف سے باہر نکل کر دریائے گنگا کی طرف چلتے ہیں ۔ جہاں خواجہ صاحب عالم جذب میں پہروں بیٹھے رہتے تھے ۔ اس جلوس کے آگے آگے قوال گاتے جاتے ہیں یہ جلوس بازار سے ہوتا ہوا گزرتا ہے اور لوگ یہیں سے منگرا شنکر (جو گنگا کی سنگت کی ہوتی ہے) جمع کر لیتے ہیں ۔ اور جلوس کے ساتھ دریا کے کنارے ۔

مغرب کے قریب پہنچتے ہیں۔ یہاں پر لوگ اگاگر میں دریا سے پانی بھر لیتے ہیں۔ اور وہی منگرا شکر گھول دیتے ہیں اور مغرب کی اذان کے بعد دریا کے کنارے کی مسجد ہی میں خواجہ صاحب کا فاتحہ اس شکر کے شربت پر کرتے ہیں اور نماز مغرب پڑھ کر گھر واپس لوٹتے ہیں اور بعض درگاہ واپس چلے جاتے ہیں پھر ۱۳ رجب کا چاند دیکھ کر نماز عشاء سے پہلے غسل مزار مبارک ہوتا ہے اور صندل لگایا جاتا ہے۔ اس کے بعد چادریں چڑھانا شروع ہوتی ہیں۔ بعد نماز عشاء قوالی شروع ہوتی ہے۔ نیاز کے لئے گوشت اور روٹی پکنا شروع ہوتی ہے اور رات بھر قوالی کی محفل گرم رہتی ہے۔ صبح نماز فجر سے قبل قوالی ختم کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد قل ہوتا ہے۔ پھر فاتحہ کرنے کے بعد تبرک تقسیم ہوتا ہے اور لوگ نماز فجر پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب کے مزار کے اطراف بازار لگ جاتا ہے اور یکم رجب المرجب سے تقریباً تین روز تک یہ میلا لگا رہتا ہے۔

خواجہ صاحب کے بزرگ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ حالانکہ بعض روایات پر گماں گزرتا ہے کہ شاید یہ فرضی ہوں لیکن جہاں تک ان کے کلام کا تعلق ہے اور انجام بخیر کی روایات ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ درحقیقت وہ بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں۔ تاریخ خورشید جاہی مصنفہ محمد امام خاں میں بھی خواجہ صاحب کا تذکرہ صفحہ نمبر ۱۵۴ اور نمبر ۱۵۵ پر ملتا ہے۔
آئین اکبری میں ابوالفضل نے بھی آپ کے حالات تحریر کئے ہیں جس کا ترجمہ مولوی فدا علی صاحب طالب نے کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ

"خواجہ کرمک ابدال عظیم المرتبت تارک دنیاؤں سے ہیں اپ دائم ظاہر سے کنارہ کش زندگی بسر کرتے تھے۔"

خواجہ صاحب کا کلام تو کافی تھا لیکن جو تواریخ میں درج ہے اسکے علاوہ باقی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس سے قبل جو اشعار آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار بھی فارسی ہی میں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کا بیشتر کلام فارسی ہی میں ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے ؎

آنکس کہ ترا ساخت جہاں را چکند | فرزند و عیال و خانماں را چکند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشے | دیوانہ تو ہر دو جہاں را چکند

اندر طلب دوست چو مردانہ شدیم | اوّل قدم از وجود بیگانہ شدیم
او علم ہمی شنید لب پر بستم | او عقل ہمی خرید دیوانہ شدیم

در رشتۂ بندگی خطا ہا کردیم | با دوست چو دشمناں جفا ہا کردیم
چندانکہ ہمہ خلق جہاں کردہ گناہ | من ظالم نفس خویش تنہا کردیم

ما طبل جفا نہ دوش بے باک زدیم | عالی علمش بر سر افلاک زدیم
از بہر ملکے منبجۂ میخوارہ | صد بار کلاہ توبہ بر خاک زدیم

یکدست مصحف ودگر دست بجام | گر نزد حلال آیم گر نزد حرام
مائیم دریں گنبد نے پختہ نہ خام | نے کافر مطلق نہ مسلماں تمام

خواجہ کرک ابدال رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا تخلص بعض جگہ خواجہ اور بعض جگہ گرگ اللہ فرمایا ہے

اور ایک شاعر نے خواجہ کی سیر والی روایت نظم کرتے ہوئے خواجہ کے دونوں تخلص استعمال کئے ہیں وہ دونوں شعر مندرجہ ذیل ہیں ۔

چنیں نقل گویند مردان راہ | کہ یک روز سلطان دیں گرگ شاہ
کہ بود خواجہ ابدال گرگ خداست | مراد ایما رہبر و رہنماست

اعزاز۔

سید اعزاز حسین نام۔ اعزاز تخلص کرتے تھے۔ عارف حسین عارف مشہور تاریخ گو کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ اپنے والد بزرگوار کے ہی شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام میں کچھ محفوظ نہیں رہا۔ صرف ایک مقطع کا علم ہو سکا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔

تمہیں اعزاز کیا کہنا ہے شاعر خاندانی ہو
کہو پھر کیوں نہ دعویٰ سے گھرانہ ہے سخنور کا

اکبر

فضیل الدین نام۔ اکبر تخلص کرتے تھے۔ والد ماجد سید فضل علی کا قیام زیادہ تر قصبہ دارانگر میں رہتا تھا۔ اس لئے آپ کی ولادت ۳ محرم الحرام سنہ ۱۲۴۷ھ دارانگر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم عربی و فارسی کی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ علمی استعداد کافی تھی مگر کبھی بیوی اور کبھی بچوں کے غم نے موصوف کو بہت زیادہ رنجیدہ کر دیا جس کی وجہ سے آپ کی شاعری میں غم و اندوہ کے جذبات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آپ کے آباؤ اجداد کا آبائی وطن قصبہ کرڈاہی تھا جہاں پر اب مولوی فرید الدین کی کوٹھی ہے پہلے وہاں اکبر کے مورث اعلیٰ کا مکان تھا۔ اکبر کے پوتے سید انیس حیدر کے قول کے مطابق اپنے مکان کی جگہ اکبر علی نے بغیر کسی معاوضہ کے مولوی فرید الدین کو دے دی تھی۔ آپ کے کلام کا معتد بہ حصّہ

مثنوی کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

سید انیس حیدر کے حوالے سے اکبر کے درج ذیل شعر بدیہ ناظرین ہیں!

کبھی شاعری کا نہ تھا مجھ کو ذوق ۔ نہ اس فن کو سیکھا نہ تھا اس کا شوق
ہے ہمشیر زادہ مرا نورِ عین ۔ سرورِ جگر میر حیدر حسین
قرابت کا ہے اس سے یہ سلسلہ ۔ پھوپھی کا نواسہ مرا بھانجا
فن شاعری میں یگانہ ہے یہ ۔ حقیقت میں فردِ زمانہ ہے یہ
کہا مجھ سے کچھ شعر تم بھی کہو ۔ مضامین کو جمع یکجا کرو

فن شاعری اک ہے دریائے شور ۔ یہاں منھ کی کھاتے ہیں سب غوطہ خور
نہ استاد تھا اور نہ تھا راہبر ۔ بھلا کس کی قوت سے ہوگا گذر
نہ میں ہوں شناور نہ میں غوطہ خور ۔ کروں میں بھلا کون برتے پہ زور

فراقِ پسر

ارے ہائے گل میرا کمھلا گیا ۔ میرا چھولن شاداب رجھا گیا
انیس اور مونس نہ غمخوار ہے ۔ یہ کوہِ الم اور تن زار ہے
مجھے سیر گلشن کی بھاتی نہیں ۔ کوئی بزم و مجلس خوش آتی نہیں
ترے غم میں بیٹھا ہوا میں اسیر ۔ نہ دولت رہی اب ہوا میں فقیر

انور

سید انور حسین نام۔ انور تخلص۔ سید جعفر حسین جعفر کے منجھلے فرزند تھے۔ عرصے سے آپ مجذوب ہو گئے تھے۔ کبھی ایک جگہ قیام نہیں کیا

کبھی حیدر آباد دکھن میں کبھی آلہ آباد میں اور کبھی کرا میں مقیم رہتے تھے۔ آپ کے ہزاروں مرید تھے شاعری بھی کرتے تھے۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۲ء مطابق ۲۶ر جمادی الاول ۱۳۸۲ھ بروز جمعہ الہ آباد میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی قبر مریدین کے لئے زیارت گاہ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

کس سے اب دل کا مدعا کہیئے ۔۔۔ غم کا اب کیسے ماجرا کہیئے
اک جہاں اب مرا مخالف ہے ۔۔۔ آپ بھی اب مجھے برا کہیئے
کب سنی دل کی داستاں تم نے ۔۔۔ کس توقع پہ مدعا کہیئے

انور

شیخ حبیب حسین نام۔ انور تخلص۔ امیر حسین کے لڑکے۔ نوعمر شاعر ہیں آپ کا کلام آپ کے درخشندہ مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ کی ولادت یکم دسمبر ۱۹۴۴ء بتائی جاتی ہے۔ درس قرآنی مکتب اور اردو انگریزی اسکولوں میں حاصل کی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

جس کو کچھ بھی شعور جام آیا ۔۔۔ بس وہی رند شاد کام آیا
تیری فرقت میں جو گرا آنسو ۔۔۔ بس وہی زندگی کے کام آیا
زندگی کا بدل گیا عنوان ۔۔۔ ان کی نظروں کا جب سلام آیا
موت نے مجھ کو زندگی بخشی ۔۔۔ جب مرے لب پہ تیرا نام آیا
دونوں عالم لرز اٹھے اس دم ۔۔۔ بے خودی میں جو تیرا نام آیا
کوئی شکوہ نہیں مجھے تم سے ۔۔۔ تم کو کیونکر خیال خام آیا

سکوت شب میں مجھے یاد جب تری آئی　　فضائیں جھوم میں بہاروں نے بھی سلام کیا

اپنی گلی میں مجھکو بلایا نہ کیجئے　　نظریں ملا کے دل کو چرایا نہ کیجئے
دل میں اتر نہ جائے کہیں مضطرب نگاہ　　مڑ مڑ کے آپ مجھ کو اشارہ نہ کیجئے

تیرے دل میں انور یہی آرزو ہے　　مدینہ کی شام و سحر دیکھ لیتے

جعفر

سید جعفر حسین نام جعفر تخلص کرتے تھے۔ آپ الہ آباد کلکٹریٹ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے بالآخر ترقی امینی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے آپ کا سنہ پیدائش اور وفات نہیں معلوم ہو سکا البتہ آپ کے فرزند سید انور حسین انور کا انتقال ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ہوا جس سے ان کے عہد کا قیاساً اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نمونۂ کلام ایک مقاصدہ کے سالانہ گلدستے سے قصیدہ کے چند شعر کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

ناصر ہر در رہے فاتح خیبر حیدر　　فضل خالق سے رہے معرکوں میں در حیدر
انھیں دونوں میں ہوا مطلع ہستی ہو زدں　　باعث نظم دو عالم میں پیمبر حیدر
دل میں ان کا جو تصور ہے تو ان کا بھی خیال　　ساتھ احمد کے ہیں اس کعبہ کے اندر حیدر
بادۂ حب علی آج پلا دے ساقی　　بیخودی میں بھی کہہ دوں نعرۂ حیدر حیدر
مدرہنے کی نہیں تیغ زباں اے جعفر　　کھول دیں گے مری تقدیر کے جوہر حیدر

حیدر

سید حیدر حسین نام۔ حیدر تخلص۔ سید ضامن علی خواجہ کڑکی کے فرزند ہیں۔ آپ کی ولادت ۳ شعبان ۱۳۵۲ھ کو ہوئی۔ بہ سلسلۂ ملازمت ضلع دیوریا میں طویل عرصے تک مقیم رہے کلام محفوظ نہیں ہے۔
مشتاق مصطفیٰ آبادی اور اعمال الدین اعمالؔ سے شرف تلمذ حاصل ہے ایک قصیدہ کے صرف تین شعر دستیاب ہو سکے ہیں۔

امیر شہر علم ہے وزیر اس کا باب ہے
علی ولی اسی کا ہے جو عمل کتاب ہے

حرم میں ہے ولادت علی ہے مقصد خدا
رسول کا وزیر ہے ازل سے بے جواب ہے

رسول آئے دیکھنے تو فاطمہ کی گود میں
ہمک رہا ہے بت شکن بتوں میں اضطراب ہے

حافظ

سید محمد اسحٰق نام۔ حافظ تخلص سید خلیل احمد کے فرزند ارجمند ہیں آپ کے دادا سید شاہ محمد علیم الہ آبادی۔ بڑے قادر الکلام شاعر گذرے ہیں جو وحید الدین وحیدؔ کے ہم عصر تھے۔ کڑا کے اکثر زعما اور مقتدر حضرات کی تاریخ وفات آپ ہی کے نتیجۂ فکر کی مرہون منت ہے حافظ نے بارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اس کے بعد تین سال تک قرأت سیکھی اور عربی و فارسی علوم حاصل کئے۔ آپ نے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک۔ ایونگ کرسچین کالج سے ایف۔ اے۔ اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) اور ایم۔ اے کیا۔
آپ جنوری ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کو بچپن ہی سے

شعر وسخن کا شوق رہا۔ اکثر و بیشتر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور بڑے پُر سوز انداز میں اپنی غزلیں سُنا کر مشاعروں کو گرماتے جب آپ انٹرمیڈیٹ میں کرسچین کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو وہاں فی البدیہہ شعر کہنے کا مقابلہ ہوا۔ اس میں آپ اول آئے۔ غزل کا مطلع یہ تھا

نہ سہتے ان بتوں کے جور اور بیداد کیا کرتے
کمندِ زلف سے دل تو نہ تھا آزاد کیا کرتے
ہم اپنے کعبۂ دل میں بتوں کی یاد کیا کرتے
صنم خانہ بنا کر زندگی برباد کیا کرتے

سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے صد سالہ تاریخ کرہلا (منظوم) مع مختصر حالات اکابر لکھی جس کے نسخے مختلف درس گاہوں اور لائبریریوں میں موجود ہیں سنہ ۱۹۱۲ء میں آپ نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سفر دہلی اختیار کیا اور وہاں گورنمنٹ آف انڈیا سنٹرل بورڈ آف ریونیو میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ جب آپ دہلی سے شملہ تبدیل ہوئے تو وہاں بھی اکثر مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی غزلیں سناتے رہے۔ شملہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں آپ نے بھی اپنی غزل ریڈیو پر پڑھی۔ غزل یہ تھی۔

اے اجل تیرا ہی رستہ عمر بھر دیکھا کئے
داستانِ زندگی کو مختصر دیکھا کئے
بزم میں ان مست آنکھوں کا اثر دیکھا کئے
دیدۂ حیرت سے ہم کیفِ نظر دیکھا کئے

ہوگیا دل کو یقین تکمیل غم کا ہوگیا — اپنی اک اک آہ کو جب بے اثر دیکھا کئے
جب قفس سے آشیاں جلتا ہوا آیا نظر — اس طرف دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کئے
ایک قطرہ بھی لہو کا جب نہ دل میں رہ گیا — آنسوؤں کے تار میں خونِ جگر دیکھا کئے
جو بہاروں میں نہ اڑ کر آشیاں تک جا سکے — ہائے کس حسرت سے وہ بے بال و پر دیکھا کئے
وہ نیاز بندگی سے عمر بھر غافل رہے — جو پرستش گاہ میں دیوار و در دیکھا کئے
کیا خبر مجھ کو کہاں لے آیا ذوقِ دردِ عشق — حسن کے جلوؤں کو فردوسِ نظر دیکھا کئے

انقلابِ دہر کی حافظ ہیں یہ نیرنگیاں
عالمِ ہستی کو ہم زیر و زبر دیکھا کئے

ایک قطعہ حافظ نے عظیم آباد کے مشاعرے میں پڑھا جو سامعین کو بہت پسند آیا۔

زیبِ محفل آج ہیں جوہر شناسانِ ادب
اس طرح فرطِ محبت سے مرا دل شاد ہے
کھینچ لایا ہے یہاں مجھ کو فقط ذوقِ سخن
ورنہ صدہا کوس شملے سے عظیم آباد ہے

یہ مشاعرہ فروری ۱۹۴۴ء میں پٹنہ عظیم آباد میں ہوا تھا۔ یہاں جو غزل پڑھی اس کا مطلع یہ تھا۔

دلوں کی کہانی نظر کی زبانی — نہاں کب رہا کوئی سرِ نہانی

آپ منشی امیر احمد مینائی کے سلسلہ تلامذہ میں ہیں۔ حضرت شفق عماد پوری سے اصلاح لیتے تھے۔ غزلوں کے علاوہ آپ نے نعتیں، سہرے، اور دوسری اصنافِ سخن پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ مرثیہ کربلا آپ کی بڑی یادگار اور مشہور نظم ہے

جو صد سالہ تاریخ کڑا (منظوم) میں شائع ہوئی ہے۔ ناظرین کے لئے اس نظم کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کڑا

اے کڑا جنت نشاں جولاں گہ دریائے گنگ — دیکھ کر موجیں بھی تجھ کو شکل آئینہ تھیں دنگ
اک دھارا ایسا کنارِ آب آتا ہے نظر — ہندوؤں کی راجدھانی کی جو دیتا ہے خبر
مہوشوں کی صبح کے اشنان کی تھی اک بہار — گلرخوں کی شام کی تفریح بھی تھی یادگار
نیّرِ اسلام اتنے میں جو چمکا ہند پر — ہو گئے پُر نور اس خطے کے بھی دیوار و در
سر بکف ہو کر مجاہد آ گئے جب اسلام کے — ہند میں سکّے بٹھائے اپنے اپنے نام کے
آتے ہی اسلام کے بدلا ورق پلٹی ہوا — گونج اٹھی چار سو اللہ اکبر کی صدا
سیر حاصل بن گئی اس کی زمیں تھا یہ نظام — غربت و افلاس کا رخصت ہوا دنیا سے نام
اے کڑا اے راحتِ جانِ عزیزانِ وطن — اے کڑا اے صبحِ خندانِ گلستانِ وطن
اے کڑا علمِ شریعت کا تو گہوارہ رہا — تیرے ہی آغوش میں علمِ طریقت بھی پلا
واہ تھا کس شان کا خواجہ کڑک کا آستاں — تھا علاؤالدین خلجی جن کے در کا پاسباں
یہ تونگر دل کے خواجہ گو بظاہر تھے فقیر — نسبت باطن سے تھے لیکن امیروں کے امیر
قطب دین و خواجگی مولانا ہر دو اولیا — بحرِ عرفاں کے شناور تھے وہ خاصانِ خدا
اور بھی تھے اولیاء اللہ کے اکثر مزار — اتنی صدیوں بعد جن کا ٹھیک مشکل ہے شمار
بھائی مولانا وحید الدین کے زین العابدین — تھے جو غازی پور میں منصف بڑے حامی دیں
قادری سے بیعت کر کے مستعفی ہوئے — یادِ حق سے ہو کے واصل سوئے جنت چل بسے

دیوگڑھ سے جب یہاں پہنچا علاؤالدین شاہ ساتھ اس کے تھے بہت محمل و خدم فوج و سپاہ
اس نے حیلے سے بلایا شاہ دہلی کو یہاں بعد قتل اُس کے بنا شاہنشہ ہندوستاں
کاٹ کر سر اپنے عم کا کر دیا قصہ تمام دن شہادت کا تھا شنبہ کے سترہ ماہ صیام
یہ امیروں کا تھا مسکن مخزن جود و سخا کوئی بھی اس جا نہ تھا اس وقت کہنے کو گدا
یہ حقیقت ہے ترے عظمت کی اے دارالامیر حق یہ ہے تو عہد میں اپنے تھا آپ اپنا نظیر
ٹوٹے محلوں کے ہیں باقی جا بجا نقش و نگار کہہ رہے ہیں ان کا مالک تھا کوئی عالی وقار
ہم میں تھی روح عمل حکمت تھی علم و فن بھی تھے شاعر رنگیں نوا تھے زینت گلشن بھی تھے
الغرض ہوتے رہے اس شہر میں اہل کمال علم و فن میں ایک سے اک بے نظیر و بے مثال
دور آخر میں وحید الدین کا سا خوش بیاں ہو گیا ہے جو سخن سنجی میں ممدوح زماں
تھا سخندانوں میں یوں وہ شاعر عالی مقام جس طرح تسبیح کے دانوں میں ہوتا ہے امام
تین شاگردوں میں دو اک نام کے استاد تھے ایک دانا پور اک اکبر الہ آباد کے
تیسرے شاگرد افسر تھے الہ آباد کے شک نہیں اس میں کہ وہ بھی فخر تھے استاد کے
تھے وحید الدین کے ہمعصروں میں اک حضرت علیم خوش بیاں تاریخ گو اور صاحب طبع سلیم
ان کے تصنیفات میں سے تین دیواں ہیں ضخیم دو کتابیں اور ہیں جن میں ہیں تاریخیں قدیم
خاص کر ان کی نظر تاریخ گوئی پر رہی سیکڑوں تاریخیں ہیں دیوان میں ان کے لکھی
بعد امجد تھے مرے یہ اوج فن کے آفتاب اس کڑے میں موت نے ان کو کیا غفراں ماب
عہد میں تھے آصف الدولہ کے راجہ شیو کار مستند شاہی وقائع کے بڑے مضموں نگار
خواجہ عشرت لکھنوی نے تذکرہ میں ہے لکھا شاعران ہند میں ان کا تخلص تھا وفا
ان کا مسکن تھا کڑا اور دستاں ان کا کلام فارسی میں کر چکے تھے اپنا وہ دیوان تمام

ان کو اردو میں بھی تھوڑا سا رہا ذوق سخن ۔۔۔ تیر جیسے ان کے استاد تھے باعلم و فن
پرورش کا لفظ نظم کر کے علی کے نام سے ۔۔۔ جن سے واقف ہی یہاں ہر شخص خاص و عام ہے
اردو [illegible] بھاکا کے اک شاعر پرانے ہو گئے ۔۔۔ جو زبان دانی میں بھی اپنے عہد کے مشتاق تھے
ان کا بھاکا میں تخلص آنور اردو میں سخی ۔۔۔ ان کے دو دیوان ہیں عیب و نقائص سے بری
تھے پرانی وضع کے اک مقتدر نامی رئیس ۔۔۔ سیدھے سادھے نیک دل دردمند و کم نویس
آشتی و صلح سے دن رات رہتا ان کا کام ۔۔۔ تھا محمد یاسین مشہور و معروف ان کا نام
مولوی قائم جو تھے علم شریعت کے امام ۔۔۔ فیض یاب ان سے ہوا کرتے تھے اکثر خاص و عام
عالم و فاضل محدث تھے وہ مفتی و فقیہ ۔۔۔ مرجع خلقت تھے دینی حیثیت سے تھے وجیہ
وعظ میں ان کے اثر یہ تھا کہ ملحد دہریئے ۔۔۔ توبہ کر کے پھر ہمیشہ ان کی صحبت میں رہے
صحبتوں میں وہ سخن کے گرد نہ جاتے تھے کبھی ۔۔۔ نعت میں اشعار برجستہ سناتے تھے کبھی
تین درجوں سے وہ کرتے تھے علاج ہر بشر ۔۔۔ یعنی تھے وہ ذی شرف ویدو حکیم و ڈاکٹر
خاص عزت سے تھا ہر چھوٹے بڑے کا امتیاز ۔۔۔ خلق ایسا جس سے تھے نظروں میں سب کے سرفراز
یہ بزرگوں کے مرے استاد تھے والا صفات ۔۔۔ چہل و شش کی عمر میں تھے جب ہوئی ان کی وفات
روح نے پرواز کی جب جسم سے ہو کر جدا ۔۔۔ رحمت حق نے کہا لبیک اے مرد خدا
ان بزرگوں کے سوا ایسی بھی تھیں کچھ ہستیاں ۔۔۔ تھے نگہباں جن کے انساں اور ملائک پاسباں
شان و شوکت مال و دولت فارغ البالی بھی تھا ۔۔۔ انسے وابستہ تھے جتنے ان میں خوشحالی بھی تھی
جن کی دعوت عام تھی اور فیض تھا جن کا عمیم ۔۔۔ نام ہیں ان کے محمد عسکری عبد الحکیم
خیر کے چشمے جہاں میں جن سے جاری ہو گئے ۔۔۔ رود بر شاد و فرید الدین کریم احمد بھی تھے
اور بھی ان کے سوا دس پانچ گذریں ہستیاں ۔۔۔ جو غریبوں پر رہا کرتی تھیں ہر دم مہرباں

نام اللہ کے ہیں منیر الدین رضی الدین حاج — مولوی فاضل تھے گویا قوم و ملت کے وہ تاج

تھے نبی اللہ بھی اور ہیں حبیب اللہ بھی — وہ بھی تھے اہل کرم اور یہ بھی ہیں مہربھی

رفیع الدین ذکریا ادریس ہیں حسنا دم اہل وطن — ایک تھے رگھوناتھ پنڈت دوسرے مظہر حسن

جو وکیلوں میں تھے سیتاپور کے مرد خدا — وہ حمید الدین بڑے تھے صاحب جود و سخا

تھے فتحپور اور ہسوہ کے وکیل باتمیز — وہ علی با حسن عالی منش ہر دل عزیز

چارہ ساز دردمنداں نیک خو دل کے غنی — سائلوں کے جو سوالوں کو نہ رد کرتے کبھی

کالی پرشاد اک بڑے تھے خادم قوم و وطن — ہوتے تھے سیراب جن سے تشنگان علم و فن

قوم کی جس دم بھلائی کا انہیں آیا خیال — عہد ماضی سے ملایا اپنے مستقبل کا حال

دل جو پھر آیا کٹہرے سے اپنا بستر باندھ کر — چل دیئے بہر وکالت لکھنؤ وہ خوش سیر

پھر الہ آباد میں کل وقف کر کے اپنا مال — پاٹشالہ کی بنا ڈالی بہ ایثار کمال

زائد از چھ لاکھ تھا وہ مال موقوفہ تمام — ہیجدہ صد اور بہتر عیسوی میں لا کلام

علم کی نہریں بہا کر موتیوں سے بھر دیا — دامن امید اپنی قوم کے ہر فرد کا

لکھنؤ میں رہ گئے تھے جد کے جو ہو کر کفیل — خاندان بھر کے تھے اپنے وہ نبیع الدین کفیل

شرع کے پابند حامی علم کے مہماں نواز — طالب علموں پر [illegible] با امتیاز

مولوی امر اللہ جو تھے زین کے مشفق پدر — تھے وکیلوں میں الہ آباد کے وہ نامور

جانتے تھے حکم لاتبذر کا اصلی مدعا — روز جتنا بھی کمایا سائلوں کو دے دیا

متقی و زاہد و عابد تھے پاکیزہ خیال — بندہ تسلیم و رضا تھے وہ نہال باکمال

تھا یہی استھان رہتے تھے جہاں بابا لوک — درس دیتے تھے یہاں وہ رہبر راہ سلوک

اللہ کا استدراج سے واقف ہوئے جب خاص و عام — دی سراتھو کی معانی سننے ان کو تا دوام

تھی زمینداری جو احمد یار کی ہر جا بسیط
پرگنہ بھر میں تھا ان کا دبدبہ سب پر محیط

تھے رئیسوں میں کڑے کے شاہ حسن رکن دیں
خوش مزاج و وضع کے پابند خوددار و حسیں

سیر چشم و اہل ہمت یار باش و حق پسند
دین کے احکام پر سختی سے تھے وہ کاربند

بینی پرشاد اک وکیل نامور تھے جو یہاں
ہو گئے آباد تھے بنوا کے اک کوٹھی کلاں

وہ محب اہل بیت مصطفیٰ تھے لاکلام
کرتے تھے دس دن محرم میں بہت کچھ اہتمام

ذاکروں سے لکھنؤ کے وہ سنا کرتے تھے ذکر
صرف کرنے میں نہ کرتے مال و زر کی کوئی فکر

جاری رکھتے تھے جو دس دن خیر و برکت کی سبیل
جاں نثاری شہ تشنہ دہن کی تھی دلیل

پہلے تھا جب تک الہ آباد میں ان کا قیام
وہ دسہرہ بھی کیا کرتے تھے با صد اہتمام

دل سے تھے وہ عاشق سبط رسول ذی حشم
تھے عزا خانے میں ان کے چاندی سونے کے علم

تیرے فرزندوں کی یہ حالت تھی اے خاک کڑا
جتنی مجھ کو واقفیت تھی اسے میں نے لکھا

ہاں رشید احمد جو میرے ایک تھے مشفق چچا
جو عزیزوں کی محبت میں رہے ہر دم فدا

جذبۂ حب وطن تھا ان کے دل میں موج زن
چاہتے تھے کام سے لگ جائیں سب اہل وطن

اپنے دادا سے بھی بڑھ کر جن کا دسترخوان تھا
رہتے تھے دس بیس مہماں جس پہ ہر صبح و مسا

سال تھا ائیسواں ان کا جب آئی ہے اجل
اس کڑے سے اٹھ گیا پھر خیر و برکت کا عمل

ہم کو بھولیں گے نہیں سیدو میاں جو تھے ظریف
ان کے قصے سیکڑوں منقول ہیں بے حد لطیف

مسجد جامع میں اک حافظ تھے مدت تک امام
روز کا معمول تھا کرتے تھے اک قرآن تمام

رہ گیا ہے اس میں ذکر کامل و اظہر حسن
کیونکہ ان لوگوں نے بالکل کر دیا ترک وطن

ہندو و مسلم میں اس جا تھا نہ پہلے بھی نفاق
شکر ہے اللہ کا اب بھی ہے ان میں اتفاق

اے کڑا باقی کہاں اب تیرا وہ جاہ و حشم
اب کہاں خلجی کہاں ماہی مراتب اور علم

اونچے اونچے ہیں مکاں لیکن مکین ان کے نہیں ۔۔۔ کتنے خورشید درخشاں چھپ گئے زیرِ زمیں
مفلس و قلاش ہیں سب کچھ نہیں ہے روزگار ۔۔۔ دیکھا جاتا ہے نہیں بچوں کا رونا زار زار
ہاں مگر دو چار اب بھی ہیں یہاں سرمایہ دار ۔۔۔ جن سے ڈھارس ہے سنبھل جائیگا اسکا حال زار
دیکھو تو ہے کلبۂ تاریک میں پھیلی ضیا ۔۔۔ بڑھ گئی ہے روشنی صدیق سے اس میں سوا
اور بھی بستی میں ہیں دو تین باقی اہل جاہ ۔۔۔ کچھ نہ کچھ ہو جائیگا جن سے غریبوں کا نباہ
بانیانِ جلسہ میں سے اک ہیں عبد السمیع ۔۔۔ علم و دانش میں ہے جن کا مرتبہ سب سے رفیع
وہ معلم تھے دکن کے عالیہ اسکول میں ۔۔۔ ان کی پنشن ہو گئی عثمان علی کے رول میں
دل میں رکھتے ہیں وطن کا درد وہ روشن خیال ۔۔۔ ساتھیوں میں ان کے سونے میں سہاگہ ہیں جمال
اور بھی ہیں بانی اس کے اک مجید ذی ہنر ۔۔۔ ہے یہ جلسہ سب انھیں لوگوں کی کوشش کا ثمر
ہے دعا حافظ کی تجھ سے اے خدائے بے نیاز ۔۔۔ دے شرف خاکِ وطن کو ہے تو ہی ذرہ نواز
پھر ترقی ہو میسر پھر مدارج ہوں بلند ۔۔۔ بھائیوں کے فیض سے ہو جائیں پھر وہ ارجمند
نظم میں آئے کہاں تک واقعات حسبِ حال ۔۔۔ لکھ دیا جو کچھ وہ ہو مقبول ربِّ ذوالجلال
لغزشیں جتنی ہوئی ہوں اہلِ فن کر دیں معاف ۔۔۔ بے تکلف بن پڑا جو کچھ وہ لکھا صاف صاف
میرے حق میں سب دعا فرمائیں جو ہیں اہلِ دیں ۔۔۔ ختم کر دوں کہہ کے میں آمین ربّ العالمین

آپ نے سلسلۂ طریقت میں مولوی محمد طفیل سے بیعت حاصل کی اور انھیں کے خلیفہ ہوئے۔ ہر سال رمضان المبارک میں کئی قرآن پاک مختلف مساجد میں سناتے ہیں۔ پہلے آپ ریڈیو پاکستان میں بھی قاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ تادمِ تحریر آپ حکومت سندھ میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے پر متمکن ہیں۔ آپ کے چھ فرزند اور تین لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں۔ سلیمان۔ ہارون۔ ابراہیم

یوسف یونس شیب۔ بڑے سلیقہ مند اور مہذب بچے ہیں جو حافظ صاحب کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہے۔

عبید

محمد منظور الحق نام۔ عبید تخلص۔ شیخ محمد امام بخش عبیدی کے بیٹے اور عوام میں شیخ عیدو کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ۵ شوال ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کو بوقت صبح صادق پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم رفاہ عام ہائی اسکول کرڑا (قائم کردہ خان بہادر مولوی سید فرید الدین احمد) میں حاصل کی۔ آپ چند وجوہات کی بناء پر اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ اوائل عمر ہی سے آپ کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ ابتداء میں اپنا کچھ کلام بغرض اصلاح سید شاہ کبیر الدین ظہیر کو دکھایا۔ عبید کو قطعات، رباعیات اور نظموں کے علاوہ غزلوں سے زیادہ دلچسپی تھی اور آپ نے اپنا کلام دیوان کی شکل میں مرتب کر لیا تھا مگر دوسرے اہل کرڑا کی مانند آپ کا کلام بھی زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا اور آپ کا مجموعہ کلام ۱۹۶۴ء میں نذر دیمک ہو گیا۔

آپ فطرتاً خلیق ملنسار اور منکسر المزاج تھے۔ بڑے مہمان نواز اور سیر چشم بزرگ تھے۔ مفلوک الحال لوگوں کی امداد کرنا اپنا اخلاقی فرض تصور کرتے تھے آپ کو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا، چنانچہ آپ نے ایک کتب خانہ "عبیدیہ کتب خانہ" کے نام سے قائم کیا۔ موصوف نے ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۵۶ء کو بوقت دو بجے شب بعارضۂ بند کالرا داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

ادھر ہے شور میخانہ میں تشنہ کام آتا ہے
ادھر ساقی لئے کس شان سے اب جام آتا ہے

جو اس وادی میں جاتا ہے وہی ناکام آتا ہے
سمجھ میں عشق کا میرے یہی انجام آتا ہے

کبھی اک حرف تسکیں کا نہ نکلا منہ سے ظالم کے
اُسے دل ہی جلانے کا فقط اک کام آتا ہے

پرانا بادۂ وحدت کا متوالا ہوں میں اب
کہ ساقی خود لئے ہاتھوں میں اپنا جام آتا ہے

صبا ان کی خبر لا تا ذرا بے چین ہے یہ دل
نہ خط مدت سے آتا ہے نہ کچھ پیغام آتا ہے

اسی امید پہ ہم تشنہ لب میخانہ سے اٹھے
ادھر اب جام آتا ہے ادھر اب جام آتا ہے

کسی عنوان سے دل کٹ ہی جاتا ہے عبید ان کا
لرزتا ہے دلِ عاشق جو وقت شام آتا ہے

مؤثر ہو رہی ہے یاد کس کی شام ہجراں پر
اداسی چھا رہی ہے ہر طرف دیوار زنداں پر

یہی کافی شہادت دے رہی ہیں قتل کی میرے
نظر آتی ہیں جو چھینٹیں مرے قاتل کے داماں پر

مجھے پھر یاد آ جاتے ہیں افسانے جوانی کے
نگاہیں دور رس پڑتی ہیں جب کہ زخم حقدار پر

بہانا چاہتا ہوں نرگسی آنکھوں سے کچھ آنسو
متاعِ زندگی برباد کر کے تیرے داماں پر

لٹا دی جس کی الفت میں متاعِ زندگی اپنی
عبید آتے نہیں بھولے سے وہ گورِ غریباں پر

شمع بالیں بجھ چکی اور چارہ گر بھی اُٹھ گئے
کیوں نہ روتے یہ سماں بیمار ہجراں دیکھ کر

رشتۂ الفت کی کڑیاں ان سے کر لیں منسلک
دشمن دیں جان کر بھی دشمن جاں دیکھ کر

زندگی باد صبا کا ایک جھونکا ہے عبید
درس یہ حاصل ہوا گورِ غریباں دیکھ کر

اللہ ری حوصلہ مری مشت غبار کا
کرتی ہے وہ طواف کسی کے مزار کا

یہ چشم نم باز بصد انتظارِ شوق
افسانہ کہہ رہی ہے کسی غمگسار کا

پھر ناوک فراق کے پہلو میں ہے خلش
پھر لطف آ رہا ہے ترے انتظار کا

کیا پوچھتے ہو حسن کی تم داستاں کو
نازک سا اک فسانہ ہے نازک نگار کا

وہ آرزوئیں میری مٹاتے ہیں اس لئے
اندازہ کر رہے ہیں ابھی میرے پیار کا

دنیا کی شکایت بے معنی احباب کے شکوے لاحاصل
جس دل پہ تھا مجھ کو ناز کبھی وہ دل بھی ہمارا ہو نہ سکا

وہ دل کو جلاتے بھی ہیں روتے بھی ہیں اکثر
تسکین کی صورت نہ ادھر ہے نہ ادھر ہے

آپ کی مجھ پہ کرم فرمائیاں
بن گئیں میرے لئے رسوائیاں

یہ نہ پوچھو دل پہ کیا گذری عبید
جب کہ اس ظالم نے لی انگڑائیاں

وہ ساون کی فضاؤں میں وہ ابر آلودسی راتیں
محبت اور جوانی کی وہ ہر لمحہ نئی گھاتیں
مری خاموشی شب میں وہ پوشیدہ ملاقاتیں
تمہیں بھی یاد آتی ہیں یہ کیا گذری ہوئی باتیں

علیم

شاہ محمد علیم نام علیم تخلص کرتے تھے۔ آپ کا تفصیلی تذکرہ "صد سالہ تاریخ کڑا" منظوم میں جناب سید محمد اسحٰق حافظ نے کیا ہے اسی کا اقتباس یہاں دیا جا رہا ہے۔ علیم شاہ محمد عباس سابق تحصیلدار پھولپور ضلع الہ آباد اور ناظم اور مہتمم بند و بست ریاست بھوپال۔ ساکن محلہ یحییٰ پور الہ آباد کے بیٹے اور مولوی محمد عسکری سابق اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اودھ و نائب مدار المہام ریاست

بھوپال کے خویش تھے۔ آپ کا شمار اہلِ علم میں ہوتا تھا، اچھے شاعر تصور کئے جاتے تھے۔ حضرت وحید کے ہمعصروں میں تھے۔ فارسی میں نواب عبدالعزیز خاں بریلوی اور اردو میں مرزا اعظم علی صاحب سے تلمذ تھا۔ اردو کا دیوان مرتب تھا مگر ان کے لڑکوں کی لاپرواہی کی بنا پر نہ چھپ سکا۔ تاریخ گوئی میں ان کو بڑا ملکہ تھا انھوں نے تاریخ کہنے کے کچھ قاعدے وضع کر کے ایک چھوٹا سا رسالہ "نصیحت مختصر" کے نام سے جو اس کا تاریخی نام بھی ہے چھپوالیا تھا۔ آخر عمر میں انھوں نے میزان الطب کو منظوم کرنا شروع کیا تھا مگر پیک قضا نے مہلت نہ دی اور اسی نامکمل صورت میں ان کے بیٹے مولوی جمیل احمد نے "نسخۂ بے مثل" کے نام سے چھپوا کر مفت تقسیم کیا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

فارسی

بودم چو بیخبر من مینا در آستیں — زاں بر گرفت آتش صہبا در آستیں
اے شانہ پنجہ بر سر زلف سیہ مزن — مارند صد ہزار در اینجا در آستیں
تو اے کلیم ساعدِ زیبا ندیدۂ — برق تجلی است صد اینجا در آستیں
از محتسب مپرس علیم حزیں کہ من — در دست سبحہ دارم و مینا در آستیں

اردو

دشنام کی محو ہے لب اعجاز نما میں — کچھ زہر بھی آمیز ہے دارُوئے شفا میں
لٹکا ہے ابھی دل ترے آویزۂ در پر — اب روح بھی الجھے گی تری زلفِ دوتا میں
نکہت ترے گیسو کی اڑا تو نہیں لائی — پھرتی ہے بھری بادِ سحر آج ہوا میں

کھلنا نہ تھا منظور کسی طرح جو اس کا — ابرو کی لگانی تھی گرہ بند قبا میں
کرتے ترے ہم جلوۂ دنداں کی تمنا
آتا دُرِ مقصود اگر دست دعا میں

قطعۂ تاریخ وحید الدین وحید

قصۂ غمناک می گویم شنو — تاب او از سوز حسرت گر بود
آں وحیدِ نکتہ سنج بے بدل — کز غم او حال دل ابتر بود
ناگہاں در خانہ اش آتش گرفت — کاندر او صد شعلہ یک اخگر بود
از پے دیوان در او جلئے چو رفت — کا در دگر ماضیٔ دا در بود
بود چوں فرط دخاں از آتشش — سوز او کاندر جگر نشتر بود
زود تر از احتقان دم بمرد — رفتنی را پائے او دیگر بود
یازدہ بد صوم از ماہ صیام — زیں قیاس حالت مضطر بود
چوں ز فرط تشنگی مشتاق آب — صایم تشنہ دریں اکثر بود
تشنہ کامی گفت تاریخش علیم — جائے پاکش برلب کوثر بود

قطعہ تاریخ مولوی زین العابدین برادر بزرگ وحید الدین وحید ۱۳۰۹

اولیں روز از ربیع نخست — چوں علیم از قضا رسیدش پیک
مولوی زین العابدیں دردم — گفت با داعی اجل لبیک
جن و انس ملک چرند و پرند — گفت ہر یک بسش سلام علیک

موصوف کے پانچ فرزند تھے۔ حکیم محمد سلیم۔ منظور احمد۔ مولوی محمد خلیل احمد۔ جمیل احمد۔

فدا

فدا حسین عبیدی نام۔ فدا تخلص محمد منظور الحق عرف محمد عبید و حبیبہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ علمی و ادبی دنیا میں فدا عبیدی کے نام سے معروف ہیں۔ آپ ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۸ء بروز سہ شنبہ بوقت صبح صادق تولد ہوئے۔ آپ کا بچپن کڑے کے اسی تاریخی قصبہ میں گذرا جہاں مزارات کی بے شمار تعداد آج بھی موجود ہے۔ اسی کا تذکرہ موصوف نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

اہل وطن سے کہنے کو اک داستانِ غم　　اٹھ اٹھ کے اب بھی آتے ہیں ذرّے مزار کے

آپ کے آباؤ اجداد کی آمد علاء الدین خلجی کے عہد کی بتائی جاتی ہے آپ کا خاندان گدا علی شاہ کے سلسلہ میں بیعت ہے۔ فدا نے درس قرآن اور درس فارسی گھر پر اور ابتدائی تعلیم قصبہ کے پرائمری اسکول میں حاصل کی بعدہ مڈل اسکول دانگر سے ورناکیولر فائنل اکزامینشن پاس کیا اس کے بعد کالا کانکر سے انگریزی زبان کی تعلیم مکمل کی۔ آپ کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور شروع ہی سے مصرعے موزوں کرنا آپ کیلئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ آپ بڑے سوشل اور ہر دلعزیز شخص ہیں۔ اسی باعث آپ کو کورٹ چیں اور دوسری الیکشنوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ آپ ہندی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔

ہندی نظم کا ایک بند نذر قارئین ہے۔

مرے نینن کے درپن کے بھیتر جب جھلک تیری آجاتی ہے

بار پیتم کی جھلک نیننوں میں مرے اُس وقت فدا مسکاتی ہے
چاہا کہ گلے لگ کے روؤں پر ایسی قسمت پھوٹ گئی
کہ پہنچ کے نیّا کنارے پر ساگر میں نین کے ڈوب گئی

آپ کے مجموعہ کلام میں "یاد ہے" "چلے گئے" "بھول جا" قابل ذکر نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ "تصویر سے خطاب" "دوست سے خطاب" "محبت" بھی اچھی نظموں کے انتخاب میں ضرور منتخب کی جا سکتی ہیں۔ آپ کو کتب بینی تصنیف و تالیف کا بہت شوق ہے۔ اور بہت سے غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

نمونۂ کلام

درد دل، پھر دلِ بیتاب میں پنہاں کر دے
زندگی کو مری منت کش درماں کر دے

بیکسی پہ میری اشکوں کی روانی ہے فضول
جب میں جانوں کہ تو مشکل مری آساں کر دے

میں تو کیا سارا زمانہ ترا بسمل ہو جائے
اک اشارہ جو تری ناوک مژگاں کر دے

"کھیلتے رہے"

اک حسن بے پناہ سے ہم کھیلتے رہے
یعنے کہ اک گناہ سے ہم کھیلتے رہے

وہ کھیلتے رہے میری بے چینیوں کے ساتھ
ان کی حسین نگاہ سے ہم کھیلتے رہے

اپنی متاع زیست لٹا کر بہار میں
زلف عنبریں سیاہ سے ہم کھیلتے رہے

جلتی ہی کائنات محبت رہی فدا
اور پھر بھی شب کو آہ سے ہم کھیلتے رہے

رنج و غم، درد و الم، ذلت و رسوائی ہے — ہمنے یہ دل کے لگانے کی سزا پائی ہے
آبلے دل کے ٹپکتے ہیں تیری آمد سے — اے صبا کیا کوئی پیغام نیا لائی ہے

جو امتحان محبت کا تھا خیال تمہیں — اسیر زلف محبت نہیں بنانا تھا

گل سے پوچھو فراق کی باتیں — لے زندگی تباہ کیا

دل اور پریشاں ہوتا ہے

جب صبح کی آمد ہوتی ہے
۱- اور چین سے دنیا سوتی ہے
ناکام تمنا روتی ہے — دل اور پریشاں ہوتا ہے
جب رات اندھیری آتی ہے
۲- ساون کی جھڑی لگ جاتی ہے
بادل کی گرج تڑپاتی ہے — دل اور پریشاں ہوتا ہے
بیتاب نظاروں کی قسمیں
۳ پنچھی کی پکاروں کی قسمیں
گنگا کے کناروں کی قسمیں — دل اور پریشاں ہوتا ہے
اُن گذری ہوئی راتوں کی قسم!

۴۔ اُن پچھلی ملاقاتوں کی قسم!
اُن نازبھری باتوں کی قسم!۔ دل اور پریشاں ہوتا ہے
جب چاندنی راتیں آتی ہیں
اور یاد تمہاری لاتی ہیں
دسا بنا کر جاتی ہیں۔ دل اور پریشاں ہوتا ہے

تصویر سے خطاب

اے سراپا نازِ فطرت، اے سراپا حسن و پیار
آج مچلا ہے نئے انداز سے صبر و قرار
کچھ تمناؤں کی یورش، کچھ محبت کی پکار
مضطرب فرسودہ ارمانوں کی دھندلی یادگار
چاندنی ہر سو بساطِ ارض پہ ہے ضَو فشاں
ایک جانب محوِ لطف رہ رہے ہیں کہکشاں
یہ نسیمِ صبح کی ہر گام پہ اک شوخیاں
نونہالانِ چمن کی فتنہ جو سرگوشیاں
یہ سحر آگیں نظارے، اور فضائے خوشگوار
نور میں ڈوبا ہوا ہر سمت فطرت کا نکھار
بس یہی تو پشکن موسم، یہی گلزار تھا

چاند خود محو تماشائے جمالِ یار تھا
آسماں اک سمت ہلکی روشنی آئی نظر
مری امیدوں کی دنیا ہوگئی زیر و زبر
روشنی آہستہ آہستہ قریں ہوتی رہی
پھر خدا جانے اچانک کس جگہ وہ چھپ گئی
مضطرب آنکھوں میں تھیں کچھ وقت کی بیچینیاں
اور قابل دید تھیں ارمانوں کی بیتابیاں
لاکھ سنبھالنے پہ کچھ دل کو سکوں آتا نہ تھا
اضطرابی بڑھتی جاتی تھی، سماں بھاتا نہ تھا
سلب یہ تھیں آئیں تمنا فرطِ غم سے تھی نڈھال
حسرتوں کا قافلہ بھی ہو چکا تھا پائمال
چاند شرمایا ہوا تھا ابر کی آغوش میں
اور ستاروں کو یہ تھیں فکریں کہ آئیں ہوش میں
مضطرب پنچھی کی وہ دلسوز ہر لحظہ پکار
کیا تمہیں بھی یاد آتی ہیں بوقت انتظار
وہ کہ جن کی ہر ہنسی پہ مسکرا دیتے تھے تم
جس کی محفل میں زمانے کو بھلا دیتے تھے تم
ہر رضا پہ جس کی تم اپنا جھکا دیتے تھے سر
جس کی آمد میں سکوں تم نے نہ پایا رات بھر

آہ ان رنگین نظاروں میں دبے پاؤں ایکبار
لوٹ لی ناکامیوں نے اس کی ہر فصلِ بہار

مخفی

بی بی خاتون جنت نام۔ مخفی تخلص کرتی ہیں۔ آپ کی ولادت / جولائی ۱۹۰[illegible]ء کو ہوئی۔ آپ کے والد سید نبی اللہ بیرسٹر لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور بڑے نامی گرامی وکیلوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ مخفی کی شادی سید حمید اللہ حمید کے ساتھ ہوئی جو مولوی سید حبیب اللہ کے فرزند ارجمند تھے۔ سید حبیب اللہ مولوی نبی اللہ کے حقیقی برادر اور مخفی کے خسر تھے۔ مخفی کے حقیقی بھائی سید ولی اللہ ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سید نبی اللہ اور حبیب اللہ دونوں حقیقی بھائی تھے آپ کا گھرانہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے کڑا میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ لکھنؤ میں بھی نبی بڑے اثر و رسوخ کے آدمی تصور کئے جاتے تھے۔ نبی اللہ کے نام سے لکھنؤ میں اب بھی ایک سڑک یادگار ہے۔ مخفی نے لکھنؤ سے ہی بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ادب سے کافی دلچسپی لینے لگیں۔ مشاعروں کا شوق آپ کو نہیں ہے مگر غزل گوئی سے کافی دلچسپی رکھتی ہیں۔ ماہنامہ آئینہ الہ آباد کے جون ۱۹[illegible] کے شمارے سے مخفی کی ایک غزل بطور نمونۂ کلام پیش کی جاتی ہے۔

برائے سیرِ گلستاں کبھی جو تو نکلے　　تو پیشوائی کی خاطر گلوں سے بو نکلے
اگر دماغ فلک پر نہ ہو حسینوں کا　　کبھی چمن سے نہ آوارہ ہو کے تو نکلے

خدا کا شکر اٹھائی نہ منت لوگوں کی   نہ میرے زخم جگر قابلِ رفو نکلے
یہی تو قتل ہونے پہ تیار ہوں یہ خوف یہ ہے   وہ ڈر نہ جائیں گلے سے اگر لہو نکلے
وہ سینہ چھلنی کیا ناوکوں نے اسے مخفی   کہ دل کے زخم نہ پھر قابلِ رفو نکلے

رسا

سید مولوی محمد نام، رسا تخلص کرتے تھے۔ آپ شاہ علیم کے فرزندِ ارجمند ہیں انسانی ہمدردی صفائی اور نفاست ان کے مزاج میں بہت تھی دینی اور مذہبی کاموں میں بھی ان کو بہت شغف تھا۔ درس قرآن کا اجرا اکثر مسجدوں اور مسلمان بچوں کے لئے انگریزی اسکولوں میں انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شعر و سخن سے بہت دلچسپی تھی۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

مصحف رخ کا ترے فال نگہباں نکلا   یہ غلام حبشی حافظِ قرآں نکلا
نذر دل کرنے کو عشاق ترے ٹوٹ پڑے   ناوک انداز جدھر تو لئے پیکاں نکلا

لطف سے اغیار بیٹھے تیری محفل میں رہے   آرزوئے وصل جاناں ہم لئے دل میں رہے
لاکھ پوشیدہ نظر سے پردۂ دل میں رہے   نور کی صورت عیاں وہ آنکھ کے تل میں رہے
مر مٹا میں عشق کی گمرہیاں میں اتنی بات پر   کچھ مرا بھی تذکرہ بزمِ عنادل میں رہے

عیاں ہو ہی گئی بیتابیٔ دل ان کی نظروں سے
جھجھک کر اٹھ گئے پہلو سے میرے بدگماں ہوکر

کشفی

ابو الخیر نام ۔ کشفی تخلص ۔ حضرت ثاقب کانپوری کے ہونہار فرزند ہیں ۔ آبائی وطن کڑا ہے جہاں آپ کے والد محترم نے اپنے بچپن کا زمانہ گذارا مگر کانپور آنے کے بعد ثاقب کانپوری کہلائے ۔ ابو الخیر کشفی نے ابتدائی تعلیم حسب روایت گھر پر اور پھر مدرسہ میں حاصل کی ۔ گھر کے علمی ماحول سے لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی پیدا ہو گیا تھا ۔ اردو کے عظیم ادیبوں اور شاعروں کی محفلیں آپ کے والد اپنے مکان پر جماتے رہتے ۔ اور اس طرح ادبی ذوق کی نشو و نما ہوتی رہی ۔ جب آپ دسویں جماعت کے طالب علم تھے تو پہلا مضمون رسالہ "زمانہ" میں شائع ہوا جو اپنے وقت کا ایک وقیع رسالہ تھا ۔

آپ نے بی ۔ اے (آنرز) جامعہ سندھ سے ۱۹۵۱ء میں ایم ۔ اے (اردو) جامعہ کراچی سے ۱۹۵۲ء اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی کراچی یونیورسٹی ۱۹۷۱ء میں کیا ۔

کراچی کے مختلف کالجوں اور جامعہ کراچی کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی اور جامعہ اوساکا برائے زبانہائے خارجی میں بھی اردو کی تدریس کی ۔

شاعری سے بنیادی طور پر آپ کو خاص لگاؤ نہ تھا مگر ۱۹۶۲ء کے اپریل میں یکبارگی موزونیت کا جوشش و ولولہ دل میں پیدا ہوا اور بہت جلد ایک مجموعہ مرتب ہو گیا جو "جاگتی راتیں" کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے ۔ اس کے بعد دو مجموعے اور بھی مرتب ہو گئے

اگرچہ ۱۹۶۲ء سے شعر و شاعری کی طرف وہ رجحان قائم نہیں رہا جو پہلے تھا مگر جھٹی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اب بھی کبھی کبھی اچھی غزلیں کہہ جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

حسن کے ساز نے دی جسم کی جھنکار مجھے
رات کو مل گئی وہ دولت بیدار مجھے

سایہ زلف میں بوسوں کو ملا اذن خرام
ظلمت شب میں ملا مطلع رخسار مجھے

خلوت شوق میں ڈھونڈا کیا اس کو لیکن
تیری محفل میں ملا شیشۂ پندار مجھے

مرحلے شوق کے آواز سے رفتار بنے
اپنی زنجیر کی آواز ہے رفتار مجھے

کون جانے کہ نظر آئے غموں کا گاہک
اے جنوں شوق سے لے چل سر بازار مجھے

شب کی خاموش فضاؤں میں ترنم سا ہے
کوئی دیتا ہے بہت دور سے آواز مجھے

غالب و میر کی غزلوں نے بھی لوری دی ہے
کہیں آئے نہ نظر خواب کے آثار مجھے

معرفتِ ادراک کو سمجھا نہیں کوئی
ہم اہلِ صفا اپنے گنہگار رہے ہیں

اربابِ ہوش منزلِ آسودگی میں ہیں
ہم تو تری تلاش میں منزل سے آئے ہیں
صحرا کی ریگ چشمۂ مہتاب بن گئی
جگنو نظر کے روزنِ محمل سے آئے ہیں

اندیشۂ فرہاد کا آغاز تو دیکھو
دھڑکے ہے دلِ سنگ یہ انداز تو دیکھو
ہر ساعت بے تاب ہیں صدیوں کے خدوخال
رنگِ رُخِ ایام کی پرواز تو دیکھو
حسرت نے سکھائے مجھے آدابِ تغزل
مومن کی زمین میں مری آواز تو دیکھو

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد کشفی نے یہ چند اشعار اپنے نمونۂ کلام کے لئے دیئے ہیں۔

عاصی

سید اعلیٰ نام، اکرام احمد رضوی - مادّہ تاریخ پیدائش ہے۔ اور عاصی تخلص کرتے تھے۔ یہ اسی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں جہاں وحید کا سورج چمک رہا ہے۔ وحید میاں آپ کی والدہ کے نانا اور راقم الحروف کے والد محمد کاظم عثمانی برادر بزرگ تھے۔ عاصی کا لڑکپن کڑا میں گذرا۔ تعلیم کی غرض سے الٰہ آباد چھرگلی میں بھی اکثر اوقات قیام رہا۔ آپ بڑے ذکی، فہیم اور قوی حافظے کے مالک ہیں۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ کڑے کے اکثر مشاعروں میں شعر پڑھتے اور داد وصول کرتے۔ آپ کا مزاج بہت علمی و تحقیقی ہے۔ محلہ مولویانہ جو ہمیشہ علما اور فضلا کا محلہ تھا۔ اسی میں آپ کا بچپن گذرا۔ اکثر اوقات اپنے ننہال رشید مئی بھی جاتے اور رشید مئی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جب وہاں سے واپس لوٹتے تو مکان، درخت، پانی کے مٹکوں، گھوڑوں اور باغ کھیت اور کھلیانوں کو سلام کرتے۔ آنسو بہاتے ہوئے رخصت ہوتے۔ اب بھی رشید مئی کا نام سن کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ راقم الحروف کے برادر بزرگ محمد عاقل عثمانی آپ کے ہمسنوں میں ہیں۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ عاصی سنگم (الٰہ آباد) پر گنگا اشنان کا سماں دیکھنے اپنے ہمجولیوں کے ساتھ گئے تھے۔ ایک ماہرو گنگا اشنان کے لئے دریا میں اتری۔ اتفاق سے رات کو خواب میں بھی یہی منظر نظر آیا۔ اس کو عاصی نے ایک شعر میں یوں قلمبند کیا تھا ؎

آب میں گم مہتاب ہوا تھا ؎ آنکھ کھلی تو خواب ہوا تھا

"خواب ہوا" کا ایسا ٹکڑا تھا جس میں ضم کے پہلو پائے جاتے تھے
اس پر محمد عاقل پشیون۔ اور سہیل احمد وغیرہ نے ان کا بہت مذاق اڑایا۔
پشیون اور سہیل سب اسی خاندان کے ہم عمر نوجوان ان کے ہم سن ہیں۔
عاصی بڑے قادر الکلام اور زود گو شاعر ہیں مگر نمونۂ کلام زیادہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ انھوں نے اپنے وطن کڑا کی یاد میں ایک نظم اس غرض سے بھیجی ہے کہ تذکرۂ سخنوران قصبۂ کڑا میں شامل کر لی جائے۔ جو درج ذیل ہے۔

"یادِ وطن"

اے وطن کی سرزمیں سرمایۂ دورِ نشاط
اے سرورِ زندگانی تجھ سے دورِ انبساط

تیرے اوپر ہے نچھاور میری ساری زندگی
تیری الفت میں سمجھتا ہوں سرورِ بندگی

تیرے گہوارے میں گذرا میرا بچپن ناز سے
ہے یہی آواز میرے ہر نفس کے ساز سے

آج بھی تیرا تصور مجھ کو صبح و شام ہے
تیری بربادی پہ گریاں یہ دلِ ناکام ہے

آج بھی آنکھوں میں میری تیرا منظر عام ہے
آج بھی منقوش میرے دل پہ تیرا نام ہے

روح افزا تھے مناظر تیری صبح و شام کے
تیرے ویرانے پریشاں کی گردشِ ایام کے

شانِ کاشی تھی نمایاں تیرے ہر اک گھاٹ سے
دل بہلتا تھا ترے دریا کے چوڑے پاٹ سے

صبح تھی صبحِ بنارس شام تھی شامِ اودھ
اس سے روشن تر ہوا تاریخ میں نامِ اودھ

الفت ہندو مسلماں تیرے کاشانے میں ہے
اتحادِ کفر و ایماں تیرے ویرانے میں ہے

خانقاہِ خواجہ صاحب تیری عظمت کا نشاں
سیتلا دیوی کا مندر ہے سکونِ قلبِ جاں

تیری باتیں یاد آتی ہیں دلِ رنجور کو
خوں رلواتی ہیں فرقت میں ترے مجبور کو

قدر تیری کیا بتاؤں کتنی عاصی دل میں ہے
لطف اخلاق و مروت تیری آب و گل میں ہے

عاصی حسن اعلیٰ کے پوتے اور حسین اعلیٰ کے فرزند ارجمند ہیں جسن اعلیٰ، تذکرہ اس کتاب کے صفحہ ۱۳۲ پر موجود ہے اس طرح ان کو ورثے میں شاعری ملی ہے۔ سید اعلیٰ لاولد ہیں۔ اس وجہ سے شاعری کی وراثت اب آگے منتقل ہوتی نظر نہیں آتی۔

عاصیؔ ابتدائی تعلیم کرڑا میں مولوی اجلال الدین کی زیر نگرانی پھر دار اکبر اور بعد میں الہ آباد میں مکمل ہوئی۔ آپ نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ اور تمام عمر درس و تدریس میں گذاری۔ فی الوقت کانپور کے محلہ طلاق محل میں مقیم ہیں اور اب ریٹائر ہونے کے بعد پنشن ہی ذریعۂ معاش ہے۔ عاصیؔ کا ذوق بڑا نکھرا ہوا ہے۔ شعرؔ اچھی پرکھ رکھتے ہیں اور اکثر اوقات اچھی غزل کہتے ہیں۔ مگر اب مشاعروں سے گریز کرتے ہیں۔ اپنا مجموعۂ کلام آج تک پردۂ خفا میں ہی رکھ چھوڑا ہے۔

عبرت

سید ظفر حسن نام۔ عبرتؔ تخلص۔ آپ سادات رضویہ سے تعلق رکھتے تھے آپ کے مورث اعلیٰ شہر قم علاقہ ایران سے بسلسلۂ مہاجرت ہندوستان وارد ہوئے۔ پہلے پنجاب میں بود و باش اختیار کی پھر کرڑا میں سکونت پذیر ہوئے۔ پھر قصبۂ کراری میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس خاندان کے ایک معزز فرد سید حسام الدین صاحب تھے جن کو فیروز شاہ تغلق نے کرڑے مانک پور کے گورنری کے عہدۂ جلیلہ سے سرفراز فرمایا تھا۔

مولانا سید ظفر حسن ۲۷ محرم ۱۲۹۵ھ مطابق ۷ جولائی ۱۸۷۸ء

موضع فیضی پور قصبہ کراری ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد یحییٰ مرحوم مدرسہ الٰہیات کانپور کے فارغ التحصیل عالم تھے اور دیارِ اسلام میں بڑی عزت و احترام سے آپ کا ذکر ہوتا ہے۔

عبرت نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اور عربی و فارسی میں اچھی استعداد حاصل کر لی۔ آپ نے دس گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

آپ کی زندگی کا ابتدائی حصہ ہنمکنڈہ ضلع ورنگل میں اپنے ماموں کے ساتھ گزرا۔ وہیں پڑھ کر پنجاب یونیورسٹی سے علوم مشرقیہ کے اعلیٰ امتحانات پاس کئے۔ ورنگل ہائی اسکول میں داخل ہو کر میٹرک تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔ میر محبوب علیخاں کی تعریف میں "مدح محبوب" کے نام سے قصیدہ لکھا اور ایک تمغہ اور سونے کی گھڑی بطور انعام ملی۔

آپ کی والدہ نے ۱۹۱۰ء میں حج سے واپسی کے دوران داعی اجل کو لبیک کہا جس کا اثر عبرت کی زندگی اور شاعری پر بہت گہرا ہوا۔

۱۱ر مارچ ۱۹۱۲ء میں آپ اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں ہیڈ مولوی مقرر ہوئے اور تقریباً چوبیس سال اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے عبرت تقریباً تین سال تک ہز ہائی نس نواب جمعیت خاں منور خاں مرحوم والیٔ ریاست بالاسنور گجرات کے دامن عاطفت سے بطور استاد منسلک رہے۔

اٹاوہ کے دوران قیام جگر مراد آبادی۔ فانی بدایونی۔ سیماب اکبر آبادی

...ص - صدیق - دلگیر یاس عظیم آبادی - یاس ٹونکی سے آپ کے بڑے
...تعلقات تھے۔

آپ ایک نہایت منکسر المزاج - نیک نفس - انسان تھے - شاعرانہ
...زو مباہات اور استادانہ تمکنت سے آپ کی زندگی پاک وصاف تھی۔

آپ کی چند کتابیں مطبوعہ ہیں جن میں کاسۂ دل اور بیت الصنم
...شعری مجموعے ہیں - تذکیر و تانیث کی ایک کتاب حیدرآباد دکن سے چھپ
...چکی ہے جسے محقق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

راقم الحروف نے بھی آپ کی زیارت کراچی میں ۵۹ء میں آپ کے
...کی ایک تنقیدی نشست میں کی ہے - جب آپ کا قیام جمشید روڈ پہ
...تھا - اور میرے محترم دوست شادان چشتی مرحوم مجھے وہاں لے گئے تھے۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے

...زندگی مجموعۂ رنگیں خیالی بن گئی چھا گئیں ایسی تری رنگینیاں رعنائیاں

...ن کے دل میں تری الفت کے نشاں ملتے ہیں
ایسے دیوانے زمانے میں کہاں ملتے ہیں

...نھیں کو راس نہ آئی چمن کی رعنائی جنہیں نے خون بہایا تھا ہر کلی کیلئے

میری باتوں پہ وہ جو ہنسنے لگے اور بھی زندگی نکھر آئی

دل کی لگی پہ روتا ہے — رونے سے کیا ہوتا ہے

عشق جہاں غریب کو الزام کون دے — جا کر صنم کدوں میں مسلماں بدل گئے

پوچھتے کیا ہو غم کے ماروں کو — زندگی اور دل فگاروں کو

آستیں بھیگ گئی روتے ہی روتے میری

کس کی یہ یاد مجھے پچھلے پہر آئی ہے

شکوہ کرتے کرتے ظلم و جور کا — بات عنوانِ وفا تک آ گئی

عبرتِ نا...د اپنی کیا کہیے — وہ نظر سارے جہاں پر چھا گئی

نہ طلب ہے اوجِ کمال کی ، نہ ہوس ہے جامِ سفال کی

مگر آرزو ہے وصال کی کہ وصالِ عیش دوام ہے

دل ایک مرقع ہے دنیائے محبت کا — کچھ غم کے مناظر ہیں کچھ دھوکا

سکوں ملتا نہیں ہے ایک دم بھی — نظر کی پھانس دل میں گھر گئی ہے

…مصطفےٰ" "یاد" "جانِ آرزو" "تیرے بغیر" آپ کی بہترین نظمیں ہیں

آپ کا انتقال ۵۹ سال کی عمر میں جون ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ آپ کا مدفن پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس سوسائٹی کے قبرستان میں ہے۔ آپ کے فرزند سید مہدی حسن حیرت ایک خوشگو شاعر ہیں۔ اور اپنے والد مرحوم کی یاد میں اکثر اوقات شعری محفلیں گرم رکھتے ہیں۔ آپ کا قیام کراچی شمس آباد گلبرگ میں ہے۔ آپ نہایت خلیق و مرنجان مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔

(اباواقتباسا) ## کلامِ حسن (نعت شریف)

بن کے سوادئ تیرے رستے کو جاتے جاتے
خاک صحرائے مدینہ کی اڑاتے جاتے

راہ پر اس دلِ دیوانے کو لائے جاتے
قیس کو شعر یہ پڑھ پڑھ کے سناتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑائے جاتے

باد پیمانے نفس سرد بلائے جاتے
دوست لم لم کا پتہ مجھ کو بتلاتے جاتے

عزم بالجزم کے لنگر کو اٹھاتے جاتے
جوشِ مستی میں یہ ہم شعر سناتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

خضر کو راہ بری کے لئے لائے جاتے
قافلہ ہند سے یثرب کو بڑھائے جاتے

دور سے روضۂ اطہر وہ دکھاتے جاتے
شعر یہ وردِ زباں اپنا بناتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

چیخ کر ہاتھ گریباں پہ بڑھاتے جاتے
پرزے دامن کے سرِ راہ اڑاتے جاتے
قافلہ والوں کو حسرت سے رلاتے جاتے
ہر گھڑی بیت لبوں پہ یہی لاتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

جانب رہ قدم اونٹوں کے بڑھاتے جاتے
اور یثرب کی طرف ہاتھ بڑھاتے جاتے
پڑھ کے اشعار خود ہی مست بناتے جاتے
دونوں مصرعے نئے پہلوں ہی [illegible]

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کے اڑاتے جاتے

خاک کوچے کی تیرے سرمہ بناتے جاتے
پیس کر شوق سے آنکھوں میں لگاتے جاتے
جلوۂ حسن تصور میں جمائے جاتے
لطف اس شعر کا ہم شیخ سے پاتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

دل میں رابطۂ شیخ جمائے جاتے
لطف اذکار لطائف کا اٹھاتے جاتے
لذت عشق نبی دل کو چکھاتے جاتے
شیخ کے روبرو یہ شعر سناتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

حضرت شیخ ہمیں ساتھ بلاتے جاتے
ان کے قدموں پہ سرِ عجز جھکاتے جاتے

جب تم آئینہ دل سے ملتے جاتے   لطف اس شعر کا مجلس میں اٹھاتے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

شرم عصیاں سے حسن آنکھ چرائے جاتے   اور سیہ کاری سے منہ اپنا چھپاتے جاتے
بخشش دل کے لئے ہاتھ اٹھاتے جاتے   واسطہ عفو کا اس شعر کو لائے جاتے

دشت یثرب میں تیرے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

مناجات دیگر

الٰہی کب دلی مطلب کو پہنچوں   کب ایسا ہو کہ میں یثرب کو پہنچوں
شب اول اگر بطحا سے نکلوں   مدینہ دوسری ہی شب کو پہنچوں

پہنچا دے مجھے یثرب خدایا
طفیل مصطفیٰ مطلب کو پہنچوں

کھینچا جاتا ہے ہر دم جذبۂ دل   عجب کیا ہے جو میں یثرب کو پہنچوں
تمنا ہے کہ سر آنکھوں سے چل کر   دیارِ کوئے حبیب رب کو پہنچوں

بلائیں جب مجھے سردار عالم
تو پھر کیونکر نہ میں واں شب کو پہنچوں

وہ ہو گر وصل بیداری میں حاصل   کبھی تو خواب میں واں شب کو پہنچوں
حسن پر گر کرے تو فضل اپنا   بشکل قیس پھر یثرب کو پہنچوں

مخمسہ حسن بر غزل کافی

کاش ہم سوئے مدینہ کبھی جا سکتے حال دل سید عالم کو سناتے جاتے
نظر اس گنبد خضرا پہ جاتے جاتے دیکھتے جلوۂ دیدار کو آتے جاتے
گل نظارہ کو آنکھوں سے اٹھاتے جاتے

کچھ دنوں جا کے مدینہ میں اقامت کرتے دل دیوانہ کو مصروف عبادت کرتے
ہم بھی اتنی کبھی اثبات اطاعت کرتے ہر سحر روضۂ اطہر کی زیارت کرتے
داغ ہجراں دل محزوں سے مٹاتے جاتے

عاشقی کا کبھی دم ہم بھی الٰہی بھرتے جن کے سودے میں پریشاں ہیں انہیں پھرتے
کیوں پریشانی الزام جہاں سے ڈرتے سر شوریدہ کو گیسو پہ تصدق کرتے
دل دیوانہ کو زنجیر پہناتے جاتے

تیرا احسان تھا گر ہند میں آتی آتی اے صبا خاک مدینے کی اڑاتی لاتی
جان محزوں یہ کسی طرح سے راحت پاتی قدم پاک کی گر خاک بھی تا آجاتی
چشم مشتاق میں بھر بھر کے لگاتے جاتے

ملتا گر طالع واژوں سا مددگار ہمیں رنج فرقت کا نہ ہوتا کبھی دشوار ہمیں
ہوتا حضرت کے رخ پاک کا دیدار ہمیں ملتی گر خواب میں وہ دولت بیدار ہمیں
بخت خوابیدہ کو ٹھوکر سے جگاتے جاتے

جائیں ہم روضۂ اطہر کو تو ترچھے ترچھے لیلئ ناقہ کے سودے میں ترے متوالے
دوڑتے پھرتے ہر اک وادی میں آبلے پڑ لے دشت یثرب میں ترے ناقہ کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے

فرش سجدہ کرکے اٹھانے نہ کبھی آنکھوں کو — باغ جنت ہی دکھلاتے نہ کبھی آنکھوں کو
در پیر واں سے ہٹاتے نہ کبھی آنکھوں کو — پلئے اقدس پہ جو رکھاتے نہ کبھی آنکھوں کو

روکنے والے اگر پاکھ ہٹاتے جاتے

لحظہ حاصل گل مقصود بھی یاروں کی طرح — رہتے اپنے ہوئے ہر وقت نظاروں کی طرح
ہجر میں جلتے رہے یا چنار دل کی طرح — دل مرا ہوتا سیہ ہو نہ ہزاروں کی طرح

جو چمن کو چمن دار ہی کو جلاتے جاتے

حسرت حال حسن سے بھر آ ہوتے — سر ترے قدموں کے جو کہ ٹ پہ کبھی ہم دھرتے
کیا عجب آپ مسیحا ئی کا گر دم بھرتے — کاش کشتہ دیدار کو زندہ کرتے

لب اعجاز اگر آپ ہلاتے جاتے

کرڑا

واصل عثمانی

لکھوں تذکرہ آج وہ بے مثال
جسے سن کے تشنہ ہوں شیریں مقال

کیا ساتھیوں نے اشارا مجھے
بس اتنا تھا کافی سہارا مجھے

کرڑے پر جو میں نے اٹھایا قلم
تو رکنے پہ ہرگز نہ آیا قلم

قلم نے دکھائے کچھ ایسے کمال
کہ اشعار لکھے بڑے بے مثال

مجھے اس کا یارو شرف ہے بڑا
مرے جد و اب کا وطن ہے کرڑا

یہ سنتے ہیں ہم بھی جواں تھا کرڑا
کبھی یہاں اور جانِ جہاں تھا کرڑا

یہ اجڑا بسا پھر اجڑ کر بسا
ہے دلی سے ہرگز نہیں کم کرڑا

جو پہلے تھا اب وہ کہاں ہے کرڑا
مگر پھر بھی جنت نشاں ہے کرڑا

یہاں کی ہواؤں میں ہے زندگی
یہاں روح پاتی ہے تابندگی

یہاں کی فضا گنگناتی ہوئی
نگاہوں کو جنت بناتی ہوئی

بڑھاپے نے لیں پھر سے انگڑائیاں
کرڑے میں زلیخا کی ہیں خوبیاں

سدا علم و فن کا یہ مخزن رہا
ہمیشہ بزرگوں کا مسکن رہا

یہاں ہے مزارات کا ازدحام
یہاں کے شہیدوں پہ لاکھوں سلام

محبت یہاں ذرے ذرے میں ہے | کہانی ہر اک پتے پتے میں ہے
تماشا پہ اس کے فلک شرمسار | ہر اک چشم بینا یہاں اشکبار
مزار اک جو ہے چمن کا شاہکار | کرڑا غازی مسعود کی یادگار
[illegible] جو کھڑا ہے لب آب گنگ | اُسے دیکھ کر عقل ہوتی ہے دنگ
ہے دریا کنارے کھڑی باولی | مگر وہ تو نکلی بڑی باؤلی
سُنا ہے کہ اب اس میں خم آ گیا | کرڑے کی تباہی کا غم کھا گیا
یہاں ہندو مسلم جو آباد ہیں | وہ سیتلا پہ اور قطب پر شاد ہیں
کہاں ہیں وہ پریاگ کے مدح خواں | وہ سیج بنارس کے رطب اللساں
یہ اشنان کی رہ گزر دیکھنا | بھیڑ ریں پڑیں گے جھتور دیکھنا
سنائے کوئی اس کو ہم کیا کہیں | کہ بھگوان کی اس کو کرپا کہیں
وہ دریا میں اشنان کا اک سماں | وہ شوخی، شرارت وہ اٹھکھیلیاں
جوانی کی سرمستیاں الاماں | شش و پنج میں ہیں بہت سجع خواں
وہ ساڑی کے پلو وہ رنگینیاں | وہ زلفوں کی چھائی ہوئی بدلیاں
مہکتا ہوا آرزو کا چمن | دہکتا ہوا رنگ سیمیں بدن
کوئی اپنے جوبن پہ مغرور ہے | کسی مانگ میں بجلی سیندور ہے
سرِ عام فتنے جگاتا ہوا | کوئی ہر قدم پر لجاتا ہوا
فضا کو معطر بنائے ہوئے | وہ خوشبو میں پنڈے بسائے ہوئے

۱؎ نوادراتِ ہند۔ ۲؎ سید سالار مسعود غازی شاہ سیتلا دیوی۔ ۳؎ قطب الدین محمد مدنی مقام کرڑا۔

وہ زہرہ جبینوں کے بگڑے چلن — حسیں ماہ پاروں کے [illegible]
کوئی سیتلا ہے تو بملا کوئی — کوئی کملا رانی ہے اوشا کوئی
کسی کے ہے پاؤں میں چھاگل پڑی — کمر پر کوئی باندھے ہے کردھنی
کروں کس طرح اب میں یہ تذکرہ — یہاں شاعروں کا تھا اک سلسلہ
سخنور یہاں کیسے کیسے بے مثال — بشیر و وحید و سخی و کمال
وحید آپ ہی تھے بس اپنی مثال — حقیقت میں تھے شاعر با کمال
گیا ساتھ سب ان کے لطف سخن — کہاں اب وحید ایسا استاد فن
تھے تاریخگو ایک عارف یہاں — کہ قطعات ہیں جن کے دردِ زباں
یہاں تھے ایک شاعر بے نظیر — جو دیکھے انہیں کوئی سمجھے فقیر
کہ پوشاک کا گیروا رنگ تھا — انھیں شعر کہنے کا اک ڈھنگ تھا
نہیں ان کی باقی کوئی یادگار — جنھیں لوگ کہتے تھے سب شیو کمار
کتابوں میں ان کا ہے یوں تذکرا — وہ شاعر تھے ان کا تخلص وفا
وہ تھے لکھنؤ میں وقائع نگار — بڑے با مروت بڑے ذی وقار
یہاں تھے مجذوب خواجہ کرک — جنھوں نے کہا شاہ سے لے دعا
عدو جو بھی تیرا ہو وہ خوار ہو — کہ سر اس کا اور تیری تلوار ہو
مقدر نے اس کے دکھایا یہ حال — ملا خاک و خوں میں شکوہ جلال

---

۵۶ مولوی بشیر علی بشیر ۵۷ وحید الدین وحید استاد اکبر الہ آبادی ۵۸ میر پرورش علی سخی
۵۹ کمال الدین حسین کمال مصنف تذکرہ ۶۰ عارف حسین عارف ۶۱ بے نظیر شاہ
۶۲ لالہ شیو کمار وفا ۶۳ وقائع نگار لکھنؤ ۶۴ خواجہ کرک ابدال ۶۵ جلال الدین

گدائے علی تھے گدا شاہ تھے فن شاعری سے وہ آگاہ تھے
یہیں پر تو رہتے تھے بابا ملوک[۱۵] شریفانہ تھا جن کا سب سے سلوک
کہیں اک یہاں بینی پرشاد[۱۶] تھے بڑے کر و فر سے جو آباد تھے
بڑی ان کی کوٹھی بڑا تھا محل مگر اب کہاں ان کا نام و نشاں
وہ بازار[۱۷] کا خاندان محترم جہاں کا ہر اک شخص تھا ذی حشم
وہ شمس[۱۸] و معنی[۱۹] ریاض[۲۰] و امیر[۲۱] وہ فیاض[۲۲] و کلن[۲۳] وہ حضرت بشیر[۲۴]
دعائیں بہت ماں کی پائے بشیر ہزاروں کی دولت کمائے بشیر
بڑا رعب تھا اور بہت دبدبہ رہا ان کی شہرت کا اک غلغلہ
غنیمت ہے اب ذاتِ بدر الحسن[۲۵] جو ہر دم ہیں سرشار حب الوطن
وحید الحسن[۲۶] ان کی اولاد ہیں اک اسکول میں اب وہ استاد ہیں
کھلاڑی تھے فٹ بال کے نامور ہیں اخبار میں تذکرے بیشتر
مداوائے غم تھے جو باقر میاں[۲۷] انھیں یاد کرتے ہیں پیر و جواں
وکالت کا سکہ بٹھائے ہوئے عدالت میں نقشہ جمائے ہوئے
انھیں بیکسوں کا سہارا کہیں کہ ٹوٹے کا چمکتا ستارا کہیں

---

۱۴ گدا علی شاہ جن کا مزار اکبرپور میں ہے ۱۵ بابا ملوک۔ داس ملوکا ۱۶ بینی پرشاد وکیل ۱۷ محلہ بازار حویلی ۱۸ قاضی شمس الدین ۱۹ قاضی معنی ۲۰ ریاض الحسن عثمانی ۲۱ امیر حسن ۲۲ فیاض الحسن فیاض والد محمد باقر عثمانی ایڈوکیٹ ۲۳ محمد حسن عرف کلن میاں ۲۴ مولوی بشیر احمد عثمانی راقم الحروف کے ماموں ۲۵ مولوی بدر الحسن عثمانی سابق اسسٹنٹ رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی راقم الحروف کے ماموں ۲۶ وحید الحسن عثمانی استاد کوتوال بلڈنگ ہائی اسکول ۲۷ مولوی محمد باقر عثمانی ایڈوکیٹ۔

ترنم سے شیون[28] کے گونجا کرا … انھیں شاعری کا ہے چسکا …
جو پُر خاص میں منصرم تھے عبید[29] … برابر تھے ان کے لئے بکر و زید
وہ اسکول میں اب ہیں ہیڈ ماسٹر … وہی چال ان کی وہی کرّ و فر
کسی غم میں زلفیں بڑھائے ہوئے … گلوری وہ منہ میں دبائے ہوئے
محلہ تھا اک مولویانہ یاں … تھا ماحول بس عالمانہ جہاں
یہاں مولوی امیراللہ[30] تھے جو … شرافت نجابت میں یکتا تھے وہ
سخی تھے سخاوت کا تھا ولولہ … تھا ان کی وکالت کا بھی غلغلہ
وحید[31] اور رزین[32] ان کے فرزند تھے … جو یوسف[33] تھے وہ ان کے دلبند تھے
خیال اپنے لوگوں کا رکھتے رفیع[34] … سنا ہے بہت نیک خو تھے رفیع
ہے ان کی کتاب اک "سہیل یمن" … رہی جو شگفتہ چمن در چمن
یہیں سے تھے منسوب اظہر حسن[35] … مگر کر گئے تھے وہ ترک وطن
جو مسکن تھا وہ حیدرآباد تھا … دم آخر ان کو وطن یاد تھا
ضیا[36] نے بکھیری تھے وہ روشنی … کہ جیسے اندھیرے میں ہو چاندنی
بڑے منکسر صاحب علم و فن … جنھیں یاد رہتا ہمیشہ وطن
تھا فضل[37] ان کا نام اور تخلص غریق … ہمیشہ وہ چھوٹوں پہ رہتے شفیق

---

۲۸ جواد الحسن عثمانی شیون برادر محمد باقر عثمانی ایڈووکیٹ۔ ۲۹ عبید احمد ولد نذیر حسن۔ ۳۰ امیر اللہ وکیل والد مولوی وحید الدین وحید۔ ۳۱، ۳۲، ۳۳ پسران مولوی امیر اللہ وکیل۔ ۳۴ رفیع الدین وکیل محلہ مولویانہ ۳۵ مولوی اظہر حسن عرف جی میاں۔ ۳۶ مولوی ضیاء الدین سشن جج۔ ۳۷ فضل احمد غریق۔

وہ اسحٰق رونق[۳۸] نے کی شاعری — کہ ہر بزم میں مچ گئی کھلبلی
چھپائی کتاب اک "خروشِ جرس" — کہ ہر لفظ سے جس کے ٹپکے ہے رس
اسی خاندان کے ہیں چشم و چراغ — زبیر[۳۹] اور فیضی[۴۰] سے عالی دماغ
جنید ایک لیڈر ہے پیارا بہت — سیاست میں نام اس کا چمکا بہت
اب اس خانوادے کا ہے تذکرا — رہا مرجع خلق جو بر ملا
بڑھا خاطر بیٹیا نے کا عز و وقار — کرٹے میں پھر آئی تھی تازہ بہار
رشید[۴۱] و حمید[۴۲] اور صدیق[۴۳] تھے — یہ سب صاحب عز و توفیق تھے
بڑے خندہ رو تھے دمِ گفتگو — ہیں صدیق کے معترف کو بکو
کرٹے کی ترقی کے خواہاں تھے وہ — ہر اک انجمن میں گل افشاں تھے وہ
مجن[۴۴] ہی کے دم سے دمکتی رہی — بہت بیلی کوٹھی چمکتی رہی
مگر اب کہاں اس کے نقش و نگار — خزاں کھا گئی سارا رنگ بہار
تھے پائی گلی[۴۵] میں جناب معین — نمیں[۴۶] و متین[۴۷] و جناب مبین[۴۸]
یہاں جو بھی تھا وہ عزادار تھا — حسین اور حسن کا وفادار تھا
کرٹے کی حقیقت میں تھے آبرو — رفیع[۴۹] نکو باطن و نیک خو
تھے جلوہ نما ایک فرد فرید[۵۰] — بہت باغ فجری ہیں جن کے جدید
پلے جس کو فجری ہوئی اس کی عید — جو کھائے کہے ان کو ہل من مزید

---

۳۸ محمد اسحٰق رونق برادر فضل احمد غریق۔ ۳۹ زبیر فاروقی والد جنید فاروقی ایڈوکیٹ
۴۰ فیض احمد فیضی ولد فضل احمد غریق۔ ۴۱-۴۲-۴۳ فرزندان علی احمد۔ محمد صدیق آشفتہ
کی پی۔ ایس ۴۴ مجید احمد عرف مجن ۴۵-۴۸ اصحاب پائی گلی ۴۹ سید محمد رفیع نقوی ۵۰ مولوی

کرڑے کا بھی چمکا تھا کیسا نصیب — تھے جب اس کی زینت نبی[۵۱] و حبیب[۵۲]

نبی نے بڑھایا کرڑے کا وقار — نبی در حقیقت کرڑے کا سنگھار

مداوائے دردِ جگر تھے جمال[۵۳] — تصوف میں یکتا تھے حضرت نہال[۵۴]

کوئی ان کا پوشش میں ثانی نہیں — کرڑے میں وہ افسوس جانی[۵۵] نہیں

ڈرامے کا ان کو بہت شوق تھا — بہت ان کا نکھرا ہوا ذوق تھا

تھے زینت کرڑے کی جناب سمیع[۵۶] — بڑے پُر وقار و بڑے ہی وقیع

ولی[۵۷] کے تھے پہلے بہت ٹھاٹ باٹ — لگی ان کو دولت اڑانے کی چاٹ

تماشہ وہ گھر پھونک دیکھا کیے — بڑی کس مپرسی میں آخر مرے

تھے اس آخری دور میں متو لال[۵۸] — کرڑے کا جنہیں تھا بہت ہی خیال

ہیں اُن کے پسر راد ھے موہن یہاں[۵۹] — کرڑا جن کے دم سے ہے رشکِ جناں

ابھی کل تلک تھے نظیر و ضمیر — یہاں پر تھے مشہور حضرت کبیر[۶۱]

انھیں کے پسر تھے جناب عماد[۶۰] — ترنم سے دل جن کے ہوتا تھا شاد

تھے جو چودھرانے میں متو میاں — انھیں کے بھتیجے تھے کلو میاں

یہاں کے انھیں لوگ سب جانتے — ضعیف و جواں ان کو سب مانتے

وطن کی محبت میں جو چور تھے — کرڑے کے مورخ میاں نور[۶۲] تھے

۵۱-۵۲ ڈپٹی نبی اللہ و حبیب اللہ بیرسٹر ۵۳ مولوی جمال احمد محلہ چوک ۵۴ مولوی نہال احمد برادر مولوی جمال احمد ۵۵ جانی میاں ۵۶ عبد السمیع کاظمی ۵۷ ولی اشرف محلہ چوک ۵۸ متو لال محلہ بازار ۵۹ و ۶۰ مولوی نظیر احمد قصیانہ ۶۱ کبیر الدین محلہ قصیانہ۔ ۶۲ نور محلہ چوک۔

وحید[٧٦٣] اب تو ہیں آہ خلد آشیاں — ہیں ان کے پسر ایک اسلم میاں
ہمیشہ لباس ان کا کھدر کا تھا — چراغ ان کی شہرت کا جلتا رہا
سنیما میں فضلی[٧٦٤] کے کردار تھے — بڑے صاف، گو نیک اطوار تھے
کرڑے میں تھے مشہور سندو میاں — زباں زد ہیں ان کی بڑی شوخیاں
ہے یونس[٧٦٥] کا مردہ بھی ضرب المثل — برادر ہیں شیث ان کے اک بے بدل
ہیں سبتو[٧٦٦] میاں بھی چراغ سحر — کراچی میں اب جن کا ہے مستقر
معیز[٧٦٧] اور اسعد[٧٦٨] سید عثمان[٧٦٩] ہیں — کرڑے کی حقیقت میں یہ شان ہیں
کرڑے سے ہیں منسوب عاقل[٧٧٠] میاں — ہے ددھیال ننہال جن کی یہاں
غریبوں کے حامی فرید الحسن[٧٧١] — بجا ہے کہیں ان کو فخر وطن
کرڑے پر رہے ابر رحمت سدا — یہاں کا رہے چپہ چپہ ہرا
رہیں قمریوں کی صدائیں یونہی — مہکتی رہیں یہ ہوائیں یونہی
جوانی یہاں پہ پھسلتی رہے — یہاں رودِ گنگا اُبلتی رہے

---

٧٦٣ وحید الدین کرڑوی مسلم لیگی رہنما۔ "چراغ جلتا رہا" فضلی کے ایک فلم میں کردار کے حیثیت سے کام کیا تھا۔
٧٦٤ فضل احمد کریم فضلی۔ ٧٦٥ محمد یونس محلہ چوک ٧٦٦ سبتو میاں رسول احمد کاظمی۔ ٧٦٧ معیز ولد نظیر احمد ٧٦٨ اسد اللہ ولد حمید اللہ محلہ تھیانہ ٧٦٩ سید عثمان محلہ ڈپٹیانہ ٧٧٠ محمد عاقل عثمانی برادر بزرگ راقم الحروف۔ ٧٧١ فرید الحسن عرف اختر ولد محمد باقر عثمانی ایڈوکیٹ۔

خدایا یہ صبحیں دمکتی رہیں الٰہی یہ شامیں مہکتی رہیں
ابد تک رہے اس کا عز و وقار رہیں اس کے قائم یہ سولہ سنگھار
خدایا کرڑا مُسکراتا رہے
خدایا کرڑا لہلہاتا رہے

تتمۂ تاریخ کرڑا

جناب حافظ سید محمد اسحٰق نے ایک تاریخ منظوم صدسالہ کرڑا تصنیف کی جو کرڑا اور اہلِ کرڑا پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کتاب میں عام تذکروں کی طرح ایک قباحت رہ گئی اور وہ یہ کہ حافظ صاحب نے اپنے افرادِ خاندان کا تذکرہ عام تذکرہ نگاروں کی طرح کچھ حد سے زیادہ طویل کردیا۔ دوسرے خاندان کے لوگوں کا تذکرہ اس میں بہت سرسری انداز میں یا برائے تذکرہ کردیا گیا یا سرے سے حذف کردیا گیا۔ دوسرے خاندان کے لوگوں کو حافظ صاحب کا یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس سلسلہ میں سید سہیل احمد نقوی نے تحریری طور پر ایک حکمنامہ صادر فرمایا ہے کہ سخنورانِ قصبۂ کرڑا کی تالیف نامکمل اور تشنہ رہے گی۔ اگر ان کے درج ذیل اشعار اس میں شامل نہ کئے گئے خاص طور سے ان کے ننہال محلہ بازار حویلی کا تذکرہ حافظ صاحب نے یہ لکھ کر ختم کردیا کہ "یہ لوگ اپنے کو عثمانی کہتے ہیں" کافی قابلِ اعتراض جملہ ہے۔ سید سہیل احمد نقوی نبیرۂ ریاض الحسن عثمانی محلہ بازار حویلی نے اسے تاریخ کرڑا کی بجائے "عسکری نامہ" سے تعبیر کیا۔ دراصل سید محمد عسکری حافظ اسحاق کے خاندان کے نامی گرامی بزرگوار گذرے ہیں ان کے متعلقین کا اس میں تفصیلی تذکرہ ہے۔ اسی مناسبت سے سید سہیل احمد نقوی نے منظوم صدسالہ تاریخ کو عسکری نامہ سے تعبیر کیا ہے۔ ہم یہاں سید سہیل احمد کے مرسلہ اشعار بغیر کسی تبصرے کے نقل کرتے ہیں۔

عسکری نامہ اسے کیا خوب لوگوں نے کہا
جس کا تاریخ کرنا اسے کچھ نہیں ہے واسطہ
نام دانستہ و نادانستہ حافظ نے کتنے کر دیئے
ایسے دلبر لوگ اپنے خاندان کے بھر دیئے
خاندان کا ان کے گویا معتمد رہبر شخص تھا
جس کا تاریخ کرنا میں لازمی تھا تذکرا
آہ وہ مرد جری فخر سلف یکتائے فن
اہل قصبہ جس کو سب کہتے تھے فیاض الحسن
باقر عثمانی کا اس میں نام تک آیا نہیں
گو کسی نے ان کے ایسا مرتبہ پایا نہیں
سرسری سا تذکرہ اس میں نہال احمد کا ہے
نام اک گوشے میں چھوٹا سا جمال احمد کا ہے
تھی جمالِ خوش ادا کے دم سے اک تازہ بہار
ہے کرارے کا گوشہ گوشہ اب بھی ان کی یادگار ہے
اب کہاں کلن میاں ایسے رؤسائے شریف
وہ خلیل احمد تخلص جن کا ہر دنا تھا ظریف
شاعر خوش گو کرارے میں تھے جو اک مثل فقیر
لوگ کہتے تھے جنہیں سب شاہ صاحب بے نظیر

عارف تاریخ گو کا مثل ہے باقی کہاں
ان کی پُر گوئی کے قصے اب بھی ہیں وردِ زباں

شہ کمال الدین نے لکھا تھا اپنا تذکرہ
شاعروں میں آج تک باقی ہے جس کا غلغلہ

دورِ آخر میں وحید الدین ساغرِ امزاج
لاکھ شمعیں لے کے ڈھونڈو ایسا کہاں ملتا ہے آج

تھے رفیع نقوی بھی اسی اجڑے گلستاں کی بہار
جن سے سب کچھ چھٹ گیا لیکن نہ چھوٹا وہ دیار

وہ دیارِ سنگ دل جس کا کراچی نام ہے
جامع مسجد یادگارِ شوکتِ اسلام ہے

شیخ احمد محتسب مدنی کے جو تھے دست راست
جن کا عہدہ دورِ اول میں تھا قاضی القضاۃ

خانوادہ محتسب کا ہے بڑا اولاالنسب
آج تک ہے خاندان انکا بڑا اعلیٰ حسب

رو کش نواب قصبے میں دل اشرف بھی تھے
جن کے والد کل تلک زندہ علی اشرف بھی تھے

جن کی فیاضی کے قصے اب بھی ہیں وردِ زباں
یاد کرتا ہے انھیں قصبے کا ہر پیر و جواں

چیدہ چیدہ

کتابیات

ارمغان پاک ۔ مصنفہ شیخ محمد اکرم

انتخاب وحید ۔ مرتبہ علی حسنین زیبا۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

آئینۂ اودھ ۔ مرتبہ سید محمد ابوالحسن مانکپوری ۱۳۰۳ھ

بیاض سخن ۔ ۔ مرتبہ عبدالشکور سیدا

بیاض فخر ۔ ضیاء الدین فخر۔ مملوکہ سید ناصر الدین وجدی۔ حیدرآباد دکن

بیاض غریق ۔ فضل احمد غریق مملوکہ فیض احمد فاروقی کراچی

بیاض ذکر الٰہ حسرت۔ مملوکہ جواد الحسن عثمانی شیون ۔ کراچی

بزم خیال ۔ صفدر مرزاپوری مطبوعہ صدیق بکڈپو امین آباد پارک لکھنؤ سنہ ۱۹۱۸ء

تذکرہ نادر ۔

تذکرہ حسینی ۔ حسین دوست سنبھلی۔ مملوکہ انجمن ترقی اردو کراچی

تاریخ ظہور قطبی (قلمی)۔ مملوکہ کتبخانہ کراچی یونیورسٹی ۔

تاریخ کڑا مانکپور۔ مرتبہ عبداللہ فیض مانکپوری سنہ ۱۹۱۶ء قیصر ہند پریس ۔

تذکرۂ علمائے ہند۔ مصنفہ رحمان علی

تذکرۂ شورش ۔

تاریخ منظوم صد سالہ کڑا۔ مصنفہ قاری حافظ سید محمد اسحٰق مطبوعہ تاج پریس الہ آباد سنہ ۱۹۴۳ء

ثمرۂ فصاحت۔ دیوان مولوی محمد فیاض الدین ۱۳۴۳

چراغ محفل فصاحت ۔ مصنفہ رادھے ناتھ کول گلشن

مراج ۔ فخر علوی ۔ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی

برس ۔ مصنفہ محمد اسحٰق رو قی ۔ ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل ۱۹۶۲ء

۱۔ غریب ۔ مصنفہ نادر

ابوسعید مرتبہ ابو نصیر ۱۳۴۵ھ مملوکہ محمد واصل عثمانی ۔ کراچی ۳۰

وحید (قلمی) مملوکہ محمد واصل عثمانی ۱۰۱۷ جوہر آباد کراچی ۳۸

ہر کرہ ا ۔ مملوکہ خیرپور پبلک لائبریری ۔ خیرپور ۔

دب حیدرآباد ۔ مصنفہ سید محی الدین قادری زور مطبوعہ طارق برقی پریس ۔

مزیزہ (قلمی) ۔ شیخ عزیز حسن کرڈوی مملوکہ محمد واصل عثمانی

گدا علی ۔ گدا علی شاہ مملوکہ واصل عثمانی (قلم) کراچی یونیورسٹی

النعیم ۔ عبد الحمید فرنگی محلی لکھنو

(قلمی) ۔ مملوکہ محمد واصل عثمانی

بت ۔ مصنفہ مولوی رفیع الدین فاروقی ۔ مملوکہ ڈاکٹر سرفراز فاروقی ۔ پی ۔ ای سی ۔ ایچ ایس، کراچی ۔ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ

۔ مصنفہ عبد الحمید فرنگی محلی ۔

شعرا ۔ عبد الغفور نساخ ۔ کلکتہ

نک ۔ سید صدیق حسن آشفتہ ۔ مرتبہ حبیب احمد صدیقی ۔

نادری ۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء

ن ۔ مصنفہ سید علی حسین خاں مطبوعہ ریاست بھوپال

مسخیہ ۔ نثار احمد فاروقی

یعنی تذکرہ سرور مصنفہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سرور

عروس الاذکار۔ نصیر الدین نقش۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی

قاموس المشاہیر۔ مصنفہ نظامی بدایونی

کلام بے نظیر۔ مرتبہ اکبر الدین صدیقی مطبع ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۱۹۵۸ء

مملوکہ آفتاب احمد علوی گوہر۔ حیدرآباد کالونی کراچی

گلدستۂ فیض ۔

گل رعنا ۔ عبدالحیٔ ندوہ۔ لکھنؤ

گلدستۂ سخن ۔ حیدرآباد۔ ماہ نومبر ۱۸۸۳ء

مجموعہ قلمی ۔ مولوی اظہر حسن مملوکہ فرید الحسن عثمانی شاہراہ باقر عثمانی الہ آباد

مثنوی مہر و ماہ ۔ مصنفہ نواب علی بہادر مطبوعہ مولوی محمد حسین کانپور۔

مراد مریدے ۔ ۔ نمبر ۱۱، ۲۰، خواجگی مملوکہ زبیر فاروقی شوکت کراچی

مقالات شیروانی

مثنوی مہر منیر۔

البلاغ بمبئی ۔ ۱۹۲۰ء

مرقع نگار ۔ ۱۸۸۸ء

پیام یار مئی ۱۸۸۶ء

صدق جدید لکھنؤ۔ جلد ۱۴، ۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۳ء

فاران۔ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء

نگار۔ نومبر ۱۹۶۳ء

ندائے ملت۔ لکھنؤ۔ ۱۹۶۳ء

اورینٹل کالج میگزین۔ اگست ۱۹۳۶ء